DUE DATE

Late Fine Re. 1.00 per day for first 15 days.
Rs. 2.00 per day after 15 days of the due date.

~~31 OCT 2007~~		

جدید ہند کے سیکولر معمار

۱۷۰۷ء — ۱۹۵۰ء

ڈاکٹر مجیب اشرف

ناشر: ڈاکٹر مجیب اشرف
ملنے کا پتہ:- نوید اشرف
۲۱۹- اشرف وِلا
ذاکر نگر- نئی دلی ۲۵

تقسیم کار
صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی 110025
شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پہلی بار نومبر ۱۹۸۹ء   تعداد 600   قیمت: 50/=

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)، پٹودی ہاؤس، دریا گنج- نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

دہلی اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی

فہرست

میری شریکِ حیات

شمیم جہاں بیگم

کے نام

پیش آہنگ

تاریخ نویسی ایک فن ہے، ایسا فن جو لکھنے والے سے تقاضا کرتا ہے بالغ نظری کا، انصاف کا، سفید کو سفید، سیاہ کو سیاہ کہنے کا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مختلف ادوار میں مورخین اور تاریخ نویسوں نے ایسا چشمہ لگا کر حالات دیکھے ہیں کہ کبھی کبھی واقعات کی صورت اس حد تک مسخ ہوگئی ہے کہ سچ سے جھوٹ کو الگ کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہوگیا۔ ہندستان کی تاریخ پر اس کا سب سے زیادہ اثر انگریزوں کے دور میں ہوا۔ انگریز مورخین نے تاریخ کو ایک خاص انداز سے پیش کیا اور اس انداز سے پیش کرنے والے تاریخ نویسوں کی ہمت افزائی بھی کی، جس سے ملک کے مختلف مذہبی فرقوں اور علاقوں کے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی ہوگئیں۔ آج جب ہم آزاد ہیں ہمیں اپنی تاریخ پر پھر ایک نظر کرنی ہوگی اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کن مورخین کے قلم نے قصداً یا سہواً ایسی غلطیاں کی ہیں یا تاریخ کے حقائق کو ایسا موڑا ہے کہ جس سے ہم حقیقت سے بہت دور پہنچ گئے اور ہمارے آپسی تعلقات پر بھی اس کے مضر اثرات مرتب ہوئے۔

آزاد ہندستان میں تاریخ کو نیا رُخ بھی ملا ہے۔ وہ رُخ ہے تاریخ کو اس کے صحیح نقطۂ نظر سے دیکھنے کا۔ اب نہ ہم ہندو ہندستان کی بات کرتے ہیں نہ مسلم

ہندستان کی نہ فتوحات کی بات کرتے ہیں اور نہ ہی نو آبادیاتی تسلّط کی۔ اب ہم انسان کو انسان مان کر اس کی تاریخ کی تلاش کرتے ہیں۔ اس دور میں اگر ہم چند نوجوان ڈاکٹر مجیب اشرف جیسے پیدا کرسکیں تو شاید ہمارا مقصد حل ہو جائے گا۔ ”جدید ہند کے سیکولر معمار،، اس سلسلے کی ایک مستحسن کوشش ہے۔

”جدید ہند کے سیکولر معمار،، اردو اکادمی دہلی کے مالی اشتراک سے شائع کی گئی ہے۔ اس کے مصنّف ڈاکٹر مجیب اشرف جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے شعبہ تاریخ میں ۱۹۶۸ء میں لکچرر مقرّر ہوئے اور اب ریڈر کے عہدے پر فائز ہیں۔ تاریخیت پر نظر اور تاریخی شعور حاصل ہے۔ اردو ادب سے دلچسپی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ ان کی دو اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایک کتاب انگریزی میں ”مسلم ایٹی چیوڈس ٹووارڈس برٹش رُول اینڈ ویسٹرن کلچر ان انڈیا،، ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب دراصل اس تحقیقی مقالے کی تلخیص ہے جس پر انھیں دہلی یونی ورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی تھی۔ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل منفرد ہے۔ دوسری کتاب ”قدیم ہندستان کی سیکولر روایات،، ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر مجیب اشرف کی تمام تصنیفات میں سیکولر نقطۂ نظر کی عکاسی ہے۔ میں بھی اس نظریے کا قائل ہوں۔ اس کتاب کے پہلے باب میں مصنّف نے سیکولرزم کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تاریخ پر اچھّی درسی کتابوں کا بے حد فقدان ہے۔ اور اردو میں تو تاریخ کی درسی کتابوں کے لکھنے کا چلن ہی ختم سا ہو گیا ہے۔ خوشی ہے کہ مصنّف نے ہائر سیکنڈری اور بی۔ اے کے طلبہ، خصوصاً اُردو میڈیم والوں کے لیے مفید کتابیں لکھنے کی اسکیم بنائی ہے۔ یہ ذوق جستجو اس لیے بھی قابل تحسین ہے کہ ان کتابوں میں ہندستان کی صحت مند تاریخ اور تہذیب کے روشن پہلوؤں کو اہمیت دی گئی ہے۔

”جدید ہند کے سیکولر معمار،، میں نہ صرف نصابی ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

بلکہ آسان اردو میں تاریخ کے مختلف موضوعات کو پیش کرنے کی بہتر کوشش کی ہے۔ کتاب کا پہلا ہی باب پُرمغز، دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

میں سفارش کرتا ہوں کہ ڈاکٹر مجیب اشرف کی یہ کتابیں اسکول اور کالج کے نصاب میں شامل کی جائیں۔ اس سے طلبہ کو بہت فائدہ ہوگا۔ میری دعا ہے کہ مصنف اپنے مِشن میں کامیاب ہوں اور اس سلسلے کو جاری رکھ سکیں۔

سیّد شریف الحسن نقوی
سکریٹری، اردو اکادمی، دہلی

مورّخہ ۲۰ر مارچ ۱۹۸۹ء

پیش لفظ

"جدید ہند کے سیکولر معمار" پیشِ خدمت ہے۔ یہ کتاب درج ذیل موضوعات پر مشتمل ہے۔

۱۸ویں صدی میں ہندستان میں سیاسی اور سماجی خلفشار، اقوام یورپ کی ہندستان میں آمد اور اُن کی تجارتی سرگرمیاں، برطانوی حکومت کا ہندستان میں قیام طرزِ حکومت اور پالیسی، ۱۹ویں صدی میں نیشنلزم اور آزادی کی ابتدا اور ۲۰ویں صدی میں آزادی کی تحریک کا عروج اور حصول آزادی۔ ہندستان میں نیشنلزم جمہوریت اور سیکولرزم کے تصورات کا فروغ۔ یہ نئے تصورات ہندستان میں کس طرح پروان چڑھے؟ ان سوالوں کے جواب اس کتاب میں دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہندستان ایک ایسا ملک ہے جو دنیا کی مختلف قوموں اُن کے تہذیب و تمدن، زبانوں اور نظریات کا گہوارہ رہا ہے۔ اور اخذ و قبول کا سلسلہ جاری رہا ہے۔

بدقسمتی سے ہندستان کی تاریخ کی کتابوں میں عموماً غیر اہم اور تنگ و تاریک پہلوؤں کو بہت اجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ یہاں کی روحانیت، یگانگی، قومی یکجہتی، رواداری اور سیکولر کارناموں نیز شہ پاروں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ طلبہ کا ذہن ملائم اور لچکیلی مٹی کی طرح ہوتا ہے۔ زبان، دل و دماغ ماحول، والدین، استاد اور ان سب سے بڑھ کر کتابیں ایک سانچے کا کام کرتے ہیں۔ اس لچکیلی مٹی کو آپ جس طرح کے

سانچے میں ڈھالیں گے اسی طرح کی شکل بنے گی، اور پھر کچھ عرصے کے بعد اس میں اتنی سختی پیدا ہو جائے گی کہ اگر کوئی تبدیلی کی گئی تو ٹوٹنے کا خطرہ لاحق ہو گا۔

تاریخ ایسا اہم مضمون ہے کہ اس سے شعوری طور پر بھی گریز کیا جائے تو ناممکن ہے۔ ہر فرد کے دل و دماغ میں اس کے اپنے ماحول کے مطابق تاریخ رچی بسی ہوتی ہے۔ اگر کوئی باقاعدہ مطالعہ نہ بھی کرے تو وہ بھی غیر ارادی طور پر اپنی اولاد کو تاریخ پڑھا دیتا ہے۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ طلبہ کو شروع ہی سے ہندستان کی تاریخ کے اچھے پہلوؤں سے متعارف کرایا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تاریخ کی صحت مند اور حقیقت پسندانہ کتابیں ہر ہندستانی اور ہر طالب علم کو بہم پہنچائی جائیں۔

میں تقریباً ۲۰ سال سے درس و تدریس کے پیشے میں مصروف ہوں۔ میرے شاگردوں کو یہ ہمیشہ شکایت تھی کہ اردو میں تاریخ کی اچھی کتابیں دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اردو میں کتابیں لکھنا کم از کم اقتصادی اعتبار سے سودمند نہیں ہے۔ لیکن میں نے ارادہ کیا ہے کہ تاریخ کی کتابیں آسان اردو اور آسان انداز میں عام قارئین خصوصاً اپنے طلبہ کی نذر کر دوں۔ اس سلسلے کی میری ایک کتاب "قدیم ہندستان کی سیکولر روایات"، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ اور موجودہ کتاب "جدید ہند کے سیکولر معمار" پیشِ خدمت ہے۔

یہ کتاب سینیر سیکنڈری، بی۔ اے۔ اور بی۔ اے۔ آنرس کے طلبہ کی نصابی ضروریات اور معیار کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت اُردو اکادمی، دہلی کی مالی اعانت سے ممکن ہو سکی ہے۔ میں اردو اکادمی کے تمام معزز اراکین کا شکر گزار ہوں۔ میں اپنے کرم فرما سید شریف الحسن نقوی صاحب کا بالخصوص شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے مجھے ایسے موقع پر سہارا دیا جب میں اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں آس اور یاس کی منزلوں سے گزر رہا تھا۔ محترمی جناب شاہد علی خاں صاحب (جنرل منیجر مکتبہ جامعہ، نئی دہلی) نے

اس کتاب کو شائع کرانے کی نگرانی قبول فرما کر میری مشکل آسان کر دی۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

آج میں اس ہستی کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس کی وجہ سے اس ادنا ذرّے میں تھوڑی سی روشنی پیدا ہوئی۔ میری مراد اپنے شفیق بزرگ بھائی (تایازاد) ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سیفی پرکیمی سے ہے۔ مجھے اپنے بھائی کی علمیت اور علم نوازی پر ناز ہے۔ میرا تمام تر علمی کیریر انھیں کی کاوشوں کا مرہونِ منّت ہے۔ ایسی ہستی کا الفاظ میں شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں۔ صرف دعاگو ہوں کہ انھوں نے اپنے علم کی لَو سے جو دیے جلائے ہیں وہ سارے جہاں کو منوّر کریں۔ ان کی بیگم اور میری بھابی محترمہ نگار سیفی کا بھی بے حد ممنون ہوں ان کی شفقت اور محبت مجھے ہمیشہ حاصل رہی ہے۔ میری شریکِ حیات شمیم جہاں بیگم حقیقت میں میرے تمام علمی کاموں میں میری ہمدم اور دوست ثابت ہوئی ہیں۔

اس کتاب میں جن مورّخین کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے شکریہ کے ساتھ ہر باب میں حوالے درج کر دیے گئے ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ سے مشوروں کا طالب ہوں۔

ڈاکٹر مجیب اشرف
ریڈر، ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری اینڈ کلچر
جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔١١٠٠٢٥

باب - ۱

جدید ہند کے چند خصوصی پہلو

مرکینٹائلزم اور کالونیئلزم

چین، عرب، ہند اور یورپ وغیرہ کی تجارتی تاریخ قدیم ترین ہے۔ ساتویں صدی عیسوی تک یورپ کے تاجر ہندستان سے تجارت کرتے تھے[۱] رومن سلطنت کے زوال کے بعد عرب تاجروں کے ذریعے گرم مسالے اور دیگر اشیا اُن کو دستیاب ہوتی رہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا سے یہ سامان خریدا جاتا تھا۔ دکنی ہندستان سے بھی گرم مسالے اور اشیا خرید کر فارس کی کھاڑی کے ذریعے کشتیوں میں اسکندریہ اور قسطنطنیہ کے بندرگاہوں کو یہ سامان بھیجا جاتا تھا۔ وہاں سے اٹلی کے تاجر یہ سامان خرید کر یورپ میں فروخت کرتے تھے۔

۱۴۵۳ء میں ترکوں نے ایشیائے کوچک پر قبضہ کر لیا، یونان اور دیگر علاقوں کی بڑی آبادی نے روم میں اقامت اختیار کی۔ ان میں دانشور، فلاسفر، ہنرمند اور جنگ آزمودہ افراد بھی تھے۔ روم میں نئی صورتِ حال نے نشاۃِ ثانیہ کو جنم دیا۔ سائنسی ذہن پیدا ہوا۔ اور اس نے سارے یورپ کو متاثر کیا۔ نئی ایجادات کا سلسلہ شروع ہوا۔ مذہبی، سیاسی، اقتصادی، زراعتی، تعلیمی اور سماجی سطح پر تبدیلی رونما ہوئی۔ زمین کی گردش کے نئے تصوّر اور قطب نما کی ایجاد نے انسان کو تسخیرِ کائنات پر مائل کیا۔ جہاز رانی پر خصوصی توجہ کی گئی۔

یورپ میں سمندری سفر کا حوصلہ پیدا ہوا۔ تجارتی کمپنیاں قائم ہوئیں۔ اس کے ساتھ زراعتی سطح پر ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں۔ انگلینڈ میں ایک طرف تاجر طبقہ اور دوسری طرف زمین دار طبقہ بیرونِ ملک اور اندرونِ ملک دولت کی فراہمی میں مصروف ہوگیا۔

اسی جدّوجہد اور مقابلے کے نتیجے میں انگلینڈ کی انیکلوزر تحریک اور نوآبادیات کا قیام شامل ہے۔ چنانچہ امریکہ، افریقہ اور ایشیائی ممالک میں نوآبادیات قائم ہوئیں۔ فرانس اور انگلینڈ کے علاوہ پُرتگالی اور ڈچ بھی اس مہم میں شریک تھے۔ پُرتگالیوں نے گوا، ڈامن، ڈیو اور ڈچوں نے ملیشیا اور انڈونیشیا میں نظامِ نو آبادیات مستحکم کیا۔

دراصل مرکینٹائلزم کے اصولوں کے تحت قومی مفاد، ملک کی مخصوص صنعت سونا، اور چاندی کا تحفظ لازمی تھا۔ اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب کہ اوّل، ملک کے تاجروں کے درمیان مقابلہ ختم کیا جائے، دوم، نوآبادیاتی ممالک سے تجارت کرنے میں یورپین اقوام کے درمیان مقابلہ سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ ان حالات نے ایک طرف تو تجارت میں اجارہ داری کو جنم دیا اور دوسری طرف تجارت میں جنگ کے عنصر کو داخل کر دیا۔ چوں کہ یورپین قوموں کے درمیان جنگیں، سمندر میں ہوتی تھیں، اس لیے اس دور میں بحری فوج کی بہت اہمیت ہوگئی جس کی بحری فوج زیادہ طاقتور ہوتی تھی وہی اس مقابلے میں کامیاب ہوسکتا تھا، اور وہی سمندری تجارت میں زیادہ سے زیادہ منافع کما سکتا تھا۔ یعنی ایک طرح سے طاقتور بحری فوج اور خوشحال تجارت لازم وملزوم ہوگئے۔ اپنے مطالعہ کی بنیاد پر ہی۔ اے ماہن اس نتیجے پر پہنچے کہ

"WHOEVER RULES THE WAVES RULES THE WORLD" ہے۔

۱۷۵۰ء کے قریب انگلینڈ میں صنعتی انقلاب ہوا اس دور میں پیداوار، ذرائع پیداوار سامان کو لانے لے جانے میں آدمیوں اور جانوروں کی بجائے مشینوں

کا استعمال ہونے لگا۔ اس لیے صنعتی انقلاب کو مشین ایج کی ابتدا کہا جاتا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں سمندر پار تجارت اور غلاموں کی تجارت سے انگلینڈ نے کافی دولت کمائی۔ یورپ کا کوئی ملک اس کا ہم سر نہ تھا۔ نوآبادیات سے کچا مال فراہم ہوتا تھا۔ اینکلوزر تحریک سے بھی تاجروں کو فائدہ پہنچا۔ بے زمین کسان اور بے کار کسان اب روزی کمانے کو فیکٹریوں میں پہنچنے لگے۔ تاجر طبقے کو سیاسی بالادستی حاصل ہوگئی۔ اب حکومت بھی دخل اندازی نہیں کر سکتی تھی۔ اس تجارتی اجارہ داری کے دور کو مرکینٹائلزم کہا جاتا ہے۔

ہارگریوس نے کتائی کی مشین ایجاد کی۔ آرک رائٹ نے اس مشین کو پانی سے چلایا۔ بعد کو کرومپٹن نے ان مشینوں سے ایک نئی مشین بنائی۔ ان تینوں مشینوں نے انگلینڈ کو اتنا عمدہ اور سستا سوت فراہم کیا کہ یہ کام کہیں اور نہ ہو سکا۔ ۱۷۸۵ء میں کارٹ رائٹ نے پاور لوم کی ایجاد کی۔ یہ مشین شروع میں بیلوں اور گھوڑوں سے چلائی جاتی تھی۔ بعد میں دریا اور نہر کے کنارے فیکٹریاں قائم ہوئیں تو اس کو پانی کی توانائی سے چلایا جانے لگا۔ الی وِہٹنی (ELI WHITNEY) نے کپاس سے بنولے نکالنے کی مشین (COTTON GIN) ایجاد کی جیمس واٹ نے ۱۷۶۹ء میں اسٹیم انجن بنایا۔ اس ایجاد نے پیداوار میں حیرت انگیز اضافہ کیا۔

اس مشینی دور میں وسائل آمد و رفت کی سہولتیں پیدا ہوئیں۔ ۱۸۱۴ء میں جارج اسٹیفینسن نے اسٹیم سے ریل چلائی۔ اب کوئلہ کان سے بندرگاہ تک ریل سے پہنچایا گیا۔ ۱۸۳۰ء میں پہلی ریلوے ٹرین مسافروں اور سامان لے جانے مانچیسٹر اور لیورپول کے درمیان چلائی گئی۔[۵] اس ایجاد سے ہندستان کو بھی فیض پہنچا۔ ۱۸۵۳ء میں لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں پہلی ریل کی سڑک ہندستان میں بنائی گئی۔

اب مشین کے اس کامیاب دور میں یورپ اور خصوصاً انگلینڈ کو صرف دو چیزیں درکار تھیں۔ ۱۔ کچا مال ۲۔ مصنوعات کی فروخت کے لیے مارکیٹ۔ اِن

ضرورتوں کو پورا کرنے کا کام صرف تاجر طبقے کے ہاتھ میں تھا۔ چنانچہ تجارتی کمپنیاں دولت مند ہو گئیں۔ سب سے اہم اور با اثر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی تھی۔ مختصر یہ کہ کچے مال کی فراہمی اور مصنوعات کی کھپت کے لیے نو آبادیات وجود میں آئیں کمپنیوں کی دولت اندوزی کا یہی بہترین ذریعہ بھی تھیں۔ اس لیے اس دور کو مرکینٹائلزم اور کالونیئلزم کہا جاتا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر صنعتی دنیا کو نو آبادیات میں تبدیل کر دیا گیا۔ صنعتی ممالک نے ایسے علاقے تلاش کر لیے جہاں انھیں سیاسی اور اقتصادی بالادستی حاصل ہو گئی۔ اور بعد میں اس اقتدار سے سامراج قائم ہوا۔[۵]

کیپٹلزم اور امپیریلزم :۔ صنعتی انقلاب نے فیکٹری میں مزدوروں کے تحفظ کا مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ یہ حکومت کی ذمہ داری تھی مگر بینتھم کے لیسز فیئر (LAISSEZ FAIRE) کے نظریہ نے سرمایہ دار طبقہ کو تقویت پہنچائی۔ اس نظریہ کے تحت تاجروں کو اپنے مفاد کی نگرانی خود کرنی چاہیے۔ (DEMAND) اور (SUPPLY) کا دستوران کے زرِ منافع کا ذمہ دار ہے۔ اور یہی اصول کاریگروں کی تقدیر کا فیصلہ کرے گا۔ آدم اسمتھ نے اس خیال کو ۱۷۷۶ء میں اپنی کتاب "THE WEALTH OF NATIONS" میں پیش کیا۔ یعنی کاریگر کو کام ملتا ہے یا نہیں۔ وہ کن حالات میں کام کرتا ہے اور اس کی تنخواہ کیا ہو گی۔ اور اس سلسلے میں اسمتھ کے ہم نوا پیدا ہوئے۔ بہرحال یہ مان لیا گیا کہ اقتصادیات کی تنظیم اصل میں حکومت کا قانونی حق اور فرض ہے۔ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں اقتصادیات کے فروغ کی خاص ایجنسی پرائوٹ سرمایہ دار نہیں بلکہ ریاست ہے۔ ہندستان میں ۱۸۱۳ء میں کمپنی کی اجارہ داری ختم کی گئی تھی۔ اور ۱۸۵۸ء میں کمپنی کی حکومت تاج برطانیہ کے تحت قائم ہوئی۔ اس طرح ۱۸۵۸ء میں برطانوی سامراج براہ راست مستحکم ہوا۔

نیشنلزم اور آزادی

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ہندستان میں مغربی تعلیم، پریس ریلوے، سائنسی ایجادات اور مغربی تصورات خصوصاً ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے ہندستان کو تاریخی شعور دیا۔ نیشنلزم کا تصور ابھرا۔ اسی تصور نے مذہبی، نسلی، لسانی اور علاقائی حدود کو ختم کر کے پورے ہندستان کو ایک اکائی میں تبدیل کر دیا تھا۔

آزادی کی تحریک کے دوران "قوم" کے مفہوم پر برسوں بحث ہوتی رہی ہے یہ کوئی ریسرچ کا موضوع نہ تھا مگر آزادی ملنے میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے سیاسی حربہ کے طور پر اس لفظ کی تعبیر میں موشگافی کی گئی۔ ایک تعبیر یہ کہ "ہندو اور مسلم" دو قومیں ہیں۔ اسی کی پیداوار TWO NATION THEORY ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے تحت اقلیت کا تحفظ ہونا چاہیے۔ جداگانہ غیر مخلوط انتخاب ضروری۔ ہندستان کی سالمیت کو اندیشہ! اس مکتب خیال کو جواز فراہم کیا گیا اسلام سے اور اسلام میں "قوم" مذہب سے نہیں بنتی۔ مگر تاریخی تجربہ یہی ہے کہ مذہب میں سیاست داخل ہونے پر بالادستی سیاست کو رہی ہے۔ اور ہندستان میں یہی ہوا۔

"قوم" کے بارے میں مذہب اور سیاست دونوں کا فیصلہ اٹل ہے۔ یعنی قوم مذہب سے نہیں بلکہ وطن سے بنتی ہے۔ مثلاً عرب سے عربی، ایران سے ایرانی، جرمن سے جرمنی، روس سے روسی وغیرہ اسی طرح ہندستان سے ہندستانی۔ ایک قوم کا تصور کانگریس، جمعیۃ العلماء، احرار، مسلم مجلس وغیرہ نے اپنایا اور اسی کی خاطر جنگ آزادی میں قربانیاں دیں۔ آزادی حاصل کی۔ جن لیڈروں نے دو قوم کے نظریہ کو اپنایا اور عمل کیا۔ ملک کے بٹوارے اور فرقہ وارانہ فساد کے ذمہ دار ہیں۔

جمہوریت اور سیکولرزم

جمہوریت اور سیکولرزم دونوں اصطلاحات مغرب سے لی گئی ہیں۔ آزاد ہند کی تعمیر انھیں بنیادوں پر ہوئی ہے۔ ہندستان میں سیکولرزم

کی تعبیر پر اختلاف رائے ہے۔ ایم۔ این۔ رائے کے مطابق سماج میں مذہب کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ انسان مذہب کی مدد کے بغیر ایمانداری اور سچائی سے نیک زندگی گزار سکتا ہے تو پھر اچھائی پر مذہب کی برتری کیوں؟[۴] پنڈت جواہر لال نہرو کی رائے میں جب تک ہندستان کا کلچرل ماحول نہیں بدلنا اس وقت تک سیکولرزم ناممکن ہے۔ پنڈت نہرو کا خیال ہے کہ سیکولرزم سائنسی دور کی دین ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کو بھی اب ایک نئے انداز سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر مذہب میں DOGMA ڈوگما اور رسومات کو رد کر کے محض زندگی کی اعلا قدروں پر زور دے۔ تو پھر سائنس، مذہب اور سیکولرزم میں کوئی ٹکراو نہیں، پنڈت نہرو کے نزدیک سیکولرزم ایک ایسا آئیڈیل ہے جس کو حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔[۵]

عالم خوند میری کا خیال ہے کہ سیکولرزم صرف جمہوری نظام سے وابستہ ہے۔[۶] وی۔ کے۔ سنہا کا خیال ہے کہ جمہوری نظام میں سیکولرزم کا ہونا تو لازمی ہے مگر جمہوریت اور سیکولرزم یکساں نہیں سمجھے جا سکتے۔[۷] محمد غوث کا خیال ہے کہ اکثر مطلق العنان حکومتیں اپنے رویے اور پالیسی میں سیکولر رہ چکی ہیں۔ ان کے نزدیک سیکولرزم کا بنیادی عنصر رواداری ہے۔[۸]

کینٹویل اسمتھ سیکولرزم کی تین قسمیں بتاتے ہیں۔ اوّل مذہبی تصوّر جس کے تحت ریاست، اور چرچ، اپنے اپنے دائرے میں آزادانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ دوم ہندو سیکولرزم، جس کے تحت تمام مذاہب کو یکساں طور پر پھلنے پھولنے کی آزادی ہے۔ اور تیسرا تصور قومی سیکولرزم کا ہے جس کے مطابق ملکی اور قومی مفاد کو زندگی کے کچھ معاملات پر ترجیح دی گئی ہے۔[۹] اس قومی سیکولرزم کے تحت حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے اور نہ ہی حکومت مذہبی بنیاد پر امتیاز کر سکتی ہے۔ حکومت کی نظر میں تمام مذاہب برابر ہیں۔ حالاں کہ کسی کے مذہب میں مداخلت کرنا بھی سیکولرزم کے اصول کے خلاف ہے۔ مگر ہندستانی دستور میں حالات کے پیشِ نظر مداخلت کے حقوق محفوظ رکھے ہیں۔

لفظ "سیکولر" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چار صدی قبل یہ لفظ یورپ میں چرچ کے مقابل مستعمل ہوا یعنی سیکولر کے معنی ہوئے مذہب کا متضاد۔ ایک اور بیان یہ ہے کہ جیکب ہولیاک نے ۱۸۵۰ء میں اس لفظ کو وضع کیا۔ اس میں مذہب کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن اس کے معاصر جوزف بریڈلا ایسے سیکولر کو مانتا تھا جس میں مذہب کا قطعی اخراج ہے۔ اور سائنس کو دیوی کا مرتبہ حاصل ہے۔[له]

بہرحال یہ کام حکومت کا ہے اور ذہنوں میں بیداری پیدا کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ ہماری حکومت نہ تو مذہبی ہے نہ غیر مذہبی اور نہ کسی مذہب کے خلاف، مذہبی معاملات میں بالکل غیر جانبداری اختیار کی گئی ہے۔ ملک کے تمام شہریوں کو بغیر کسی نسلی اور علاقائی امتیاز کے برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

سوشلزم اور سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی

سوشلزم کی مختلف تعبیریں اور مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن دراصل سوشلزم پرولتاری سوشلزم یا سائنسی سوشلزم ہے۔ اس وقت دنیا میں دو کیمپ ہیں۔ ا۔ سرمایہ داری ۲۔ سوشلزم۔ سرمایہ دار طبقہ کام نہیں کرتا مگر دولت مند ہے۔ پرولتاری یا محنت کش طبقہ دن رات کام کرتا ہے مگر غریب ہے۔ وجہ کیا ہے۔ یہی کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد COMMODITY PRODUCTION پر ہے۔ ہر چیز کی خرید و فروخت جاری ہے۔ محنت کش سے محنت معاوضہ اس کا خون اور ضمیر بھی خرید لیا جاتا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی اشیاء اور پیداوار خرید لی جاتی ہیں اور ساتھ میں حقِ محنت بھی۔ پیداوار اور اشیا کا مالک بغیر کام کیے سرمایہ دار طبقہ بن جاتا ہے۔

سماج میں یہ نابرابری دور کرنے اور مفاد پرست اقلیتی طبقہ کی محنت کش اکثریتی طبقہ پر بالادستی ختم کرنے کے لیے سوشلزم ضروری ہے۔ اسی وقت پیداوار اور ذرائع پیداوار کی پرائیوٹ اجارہ داری ختم ہوگی۔ بھاری صنعت کاری کو فروغ

ملے گا۔ بینک، ریلوے، سڑکیں، بجلی، ڈاک گھر، تعلیم، ہوسپیٹل وغیرہ سب قومی ملکیت قرار پائیں گے۔ بچوں اور عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہوگا۔ طبقاتی نظام کی سوشلزم میں کوئی گنجایش نہیں کوئی طبقہ دوسرے طبقہ کی کمائی پر عیش نہیں کرسکتا۔ اقتصادی استحصال قطعی بند۔ صرف ایک طبقہ باقی رہے گا یعنی محنت کش طبقہ! جو کمائے گا وہ کھائے گا۔ بہت پہلے اسٹالن نے کہا تھا۔

"IT IS SELF EVIDENT THAT THE SOCIALIST SYSTEM WILL FOLLOW CAPITALISM AS INEVITABLY AS DAY FOLLOWS NIGHT".

مختصر یہ کہ آزادی کے بعد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم نے سوشلزم تک پہنچنے کے لیے جمہوری نظام کو ایک پل کی طرح سمجھا اور اس سے کام لیا۔ وہ جانتے تھے کہ بٹوارے کے زخم تازہ ہیں۔ ذہن مسموم ہوچکے ہیں۔ ان کے ساتھیوں اور کانگریس کے لیڈروں میں بھی ردِ عمل کے طور پر ذہنی پراگندگی پیدا ہوگئی ہے۔ پنڈت نہرو نے اپنی فراست و سیاسی بصیرت اور عالمی تجربہ کی بنیاد پر ہندستان کو ایک بلند مقام دلایا۔ جمہوریت کی شکل بھی نکھاری۔ سوشلزم کوئی کتابی فلسفہ نہیں ہے۔ اس کے لیے تقریباً وہی جدّوجہد درکار ہے جو جنگ آزادی کے لیے ضروری تھی۔ پھر عوام اور دانش ور طبقے کے ذہنوں میں بیداری پیدا کرنا ہے۔ اس وقت کے حالات نے اجازت نہیں دی۔ پھر بھی نہرو نے جمہوری پل کے ذریعے سوشلزم کی روشنی آنے کا اہتمام کیا یعنی سوشلسٹک پیٹرن آف سوسائٹی اپنایا۔ اس پالیسی کے ذریعہ بھاری صنعت کاری، ڈیم اور بڑے کارخانے بنے۔ خارجہ پالیسی میں کامیابی ہوئی اور ملک نے ترقی کی۔ وہ روشنی آگے بڑھی۔ چنانچہ اندرا گاندھی نے حکومت کے بنیادی اصولوں میں سوشلزم بھی شامل کردیا تھا۔ سوشلزم کا اہم اصول یہ ہے۔

"FROM EACH ACCORDING TO HIS ABILITY AND TO EACH ACCORDING TO HIS SERVICES"

۱۔ پانچویں صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک کے رومی سکے ہندستان کے مختلف علاقوں کی کھدائی میں دستیاب ہوئے ہیں۔ دی ہندو۔ ۲۶, اکتوبر ۸۶ ۱۹ء

۲۔ سر الفریڈ لائل، دی رائز اینڈ ایکسپینشن آف دی برٹش ڈومینین اِن انڈیا، ص ص۔ XXVIII - XXIX

۳۔ صنعتی انقلاب پر ڈیوڈ اسمتھ کی کتاب، دی ہسٹری آف انگلینڈ سے استفادہ کیا ہے۔

۴۔ سیکولرزم پر تفصیلی بحث ملاحظہ کیجیے۔ وی۔ کے۔ سنہا (اڈیٹر) سیکولرزم اِن انڈیا، ص ص۔ ۱۴۴-۱۴۶

۵۔ محمد غوث، سیکولرزم، سوسائٹی اینڈ لا اِن انڈیا، ص۔ ۱

۶۔ عالم خوندمیری، "ریلیجس فلاسفی آف آزاد"، ملاحظہ کیجیے سنہا۔ مذکورہ بالا، ص ص۔ ۴۳-۵۴

۷۔ ایضاً، ص ص۔ ۸-۱۰

۸۔ غوث، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۱۳-۱۴

۹۔ سنہا، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۱۹۴-۱۹۵

۱۰۔ دی ٹائمس آف انڈیا۔

باب ۔ ۲

۱۸ ویں صدی کے وسط میں ہندوستان کے سیاسی حالات

۱۸ ویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات کئی اعتبار سے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ سیاسی اعتبار سے جو سب سے اہم بات ہے وہ یہ کہ ۱۸ ویں صدی کی ابتداہی سے مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہوا یعنی خودمختار ہندستانی ریاستوں کا عروج شروع ہوا۔ سِکھ، جاٹ اور مراٹھوں نے مغلیہ حکومت کے خلاف بغاوتیں کیں۔ اور بیرونی حکمرانوں نے اسی دور میں ہندستان پر حملے کیے۔ اِن اہم واقعات کی نوعیت اور اسباب کا جائزہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ یورُپ کی قوموں کی ہندستان میں آمد، ان کے تجارتی مشاغل سمندری تجارت کی نوعیت اور برطانوی حکومت کا قیام، ان تمام حیرت انگیز واقعات کو دنیا کے نئے حالات کی روشنی ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کی نوعیت اور اسباب | ۱۷۰۷ء میں

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد حکومت تو ۱۸۵۷ء تک برقرار رہی مگر مغلیہ سلطنت کا طمطراق اور دب دبہ اسی کے بعد گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں حکومت کی عزّت بالکل ختم ہو گئی تھی۔ شاہ عالم کے متعلق یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ "حکومتِ شاہ عالم از دلّی تا پالم"۔ اِس بتدریج زوال کی نوعیت اور اسباب

حسب ذیل ہیں۔
سلطنت کے زوال کا ذمّہ دار عموماً مغل شہنشاہ اورنگ زیب کو سمجھا جاتا ہے۔
لیکن اس خیال سے پوری طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال تک مغلیہ سلطنت بہت مضبوط اور پہلے سے زیادہ وسیع تھی۔ اس کے بعد تقریباً ۱۵۰ سال تک یہ سلطنت برقرار رہی لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ اورنگ زیب کے فوراً بعد ہی مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہونا کیوں شروع ہو گیا؟ غالباً اسی وجہ سے کچھ مورخین نے اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی، توسیعِ سلطنت اور اس کے شکّی مزاج کو سلطنت کے زوال کے اسباب قرار دیا۔ لیکن شخصی حکومت میں اس طرح کے بتدریج زوال کا ذمّہ دار کسی ایک حکمراں کو ٹھہرانا نامناسب ہے۔
اگر محض پالیسی کا مسئلہ تھا تو اس کو اورنگ زیب کے بعد بدلا بھی جا سکتا تھا۔ اور بدلا بھی گیا۔ بہادر شاہ اوّل نے دوبارہ رواداری کی پالیسی اور ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے کی پالیسی اپنائی تھی۔
وسیع سلطنت کو بہتر نظم و نسق کے ذریعے قابو میں لیا جا سکتا تھا۔ جانشینی کی جنگ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ شخصی حکومتوں میں قدیم دور میں بھی اور عہدِ وسطیٰ میں حکمرانوں کی اہلیت جانچنے کا بہترین طریقہ تھا۔
شخصی حکومت کی پائیداری طاقت پر منحصر ہوتی ہے پالیسی کا دوسرا نمبر ہوتا ہے۔ پالیسی غلط ہونے کے باوجود اورنگ زیب کے خلاف بغاوتیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ سِکھ، مراٹھے، جاٹ یہاں تک کہ انگریزوں نے بھی بغاوت کرنے کی کوشش کی مگر اورنگ زیب کے مضبوط ہاتھوں نے اِن تمام بغاوتوں کو کچل دیا۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ مغلیہ دور خصوصاً اکبر جس مذہبی رواداری کی پالیسی کے لیے مشہور اور مقبول تھا وہ پالیسی اورنگ زیب نے نہیں اپنائی اور اس نے نہ صرف ہندوؤں کے ساتھ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ حتّٰی کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھی بے حد رجعت پسندانہ اور سفاکانہ رویّہ اپنایا تھا۔ یہ ایک الگ بحث

ہے کہ یہ رویّہ اس نے اپنے سیاسی مقاصد پورے کرنے کے لیے اپنایا تھا اور یہ کہ مذہب اسلام میں اس طرح کا رویّہ جائز بھی تھا یا نہیں ؟ لیکن اس کے باوجود اسے راجپوتوں کا تعاون حاصل رہا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کے بیٹے اور جانشیں بہادر شاہ اوّل نے فورًا اورنگ زیب کی پالیسی کو چھوڑ دیا۔ اسی وجہ سے اسے راجپوت اور خصوصًا مراٹھوں کا بھرپور تعاون حاصل ہوگیا تھا۔ دراصل اورنگ زیب کو چھوڑ کر تمام مغل حکمرانوں نے آخر وقت تک یعنی بہادر شاہ ظفر کے دور تک مذہبی رواداری کی پالیسی اپنائی جس کی وجہ سے مغلیہ دور ایک مثالی دور سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد تقریبًا ۱۵۰ سال تک مغلیہ سلطنت برقرار رہی۔ اس لیے اگر محض پالیسی کا مسئلہ ہوتا تو اس کو اورنگ زیب ہی کے زمانے میں ختم ہوجانا چاہیے تھا۔

اطہر عباس رضوی، اورنگ زیب کی پالیسی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اورنگ زیب کے بعد اگر کوئی اکبرِ اعظم جیسا بادشاہ پیدا ہوجاتا تو مغلیہ سلطنت زوال سے بچ سکتی تھی[۱]۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اورنگ زیب کے بعد تقریبًا ۱۱ حکمراں ہوئے لیکن تمام حکمراں نااہل تھے۔ ان میں کوئی اکبرِ اعظم جیسا بادشاہ نہیں ہوا۔ اس طرح مغلیہ سلطنت کے زوال کے لیے بعد کے حکمراں کافی حد تک ذمّہ دار تھے۔ بہادر شاہ اوّل نے (۱۷۰۷ء۔۱۷۱۲ء) مذہبی رواداری کی روایتی پالیسی اپنائی۔ مگر اس میں اکبر جیسی ہمہ گیر صلاحیتیں نہیں تھیں۔ اس لیے پالیسی کی تبدیلی کے باوجود مغلیہ سلطنت کو زوال سے نہ بچا سکا۔ جہاندار شاہ (۱۷۱۲ء۔۱۷۱۳ء) نے صرف ایک سال حکومت کی۔ عیش و عشرت کا شکار رہا۔ وہ اپنی ملکۂ خاص لال کماری کے زیرِ اثر تھا۔ اس کے توسط سے دربار میں نااہلوں کو اونچے اونچے عہدے ملے تھے۔ آخرکار امرا کی سیاست کا شکار ہوا۔ تخت سے اتارا گیا اور مار ڈالا گیا[۲]۔ جہاندار شاہ کے بعد فرخ سیر (۱۷۱۳ء۔ ۱۷۱۹ء) سید برادرس کی مدد سے تخت نشین ہوا۔ اسے اپنے اہم فرائض اور ذمّہ داریوں کا قطعًا احساس نہ تھا۔ اس کے دور میں مغلیہ دربار میں سید برادرس چھائے رہے۔

حسن اور حسین عبداللہ باصلاحیت امرا تھے۔ انھوں نے کچھ عرصے تک مغلیہ سلطنت کو کئی خطروں سے بچایا۔ مگر جب فرخ سیر نے اُن سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سازش کی تو انھوں نے فرخ سیر کو تخت سے اتار کر ۱۷۱۹ء میں مار دیا اور اس کی جگہ محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ محمد شاہ (۱۷۱۹ء۔ ۱۷۴۸ء) کو حالاں کہ کافی طویل دور ملا مگر وہ بھی اپنے پیش رو حکمرانوں سے بہتر نہیں تھا۔ وہ ذاتی طور پر جہاندار شاہ کی طرح عیش پرست شراب اور عورتوں کا دلدادہ تھا۔ ایک طوائف کوکی جیو، اس کی ملکۂ خاص تھی جس کے اشاروں پر چلتا تھا۔ محمد شاہ نے بھی فرخ سیر کی طرح سید بھائیوں کے خلاف سازش کی اور ۱۷۲۲ء تک ان سے تو چھٹکارا حاصل کر لیا۔ مگر دربار میں دیگر امرا کو فوقیت حاصل ہو گئی۔ اس دور میں مغلیہ سلطنت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا، سکھ، جاٹ، مراٹھے بے حد سرکش ہو گئے تھے اور بیرونی حملوں نے خصوصاً نادر شاہ کے حملے نے مغلیہ سلطنت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا۔ اسی کے دور میں نئی ریاستوں کا عروج شروع ہوا۔[۳۵]

محمد شاہ کے جانشین احمد شاہ (۱۷۴۸ء۔ ۱۷۵۴ء) اور احمد شاہ کے جانشین عالم گیر ثانی (۱۷۵۴ء۔ ۱۷۵۹ء) ان دونوں کے زمانے میں مغل بادشاہ محض نام کا رہ گیا تھا۔ حکومت کا کاروبار پوری طرح سے امرا کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ شاہ عالم ثانی (۱۷۶۱ء۔ ۱۸۰۶ء) نے شہزادگی کے زمانے میں کچھ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اوّل تو امرا نے خصوصاً غازی الدین نے عالم گیر ثانی کے انتقال کے بعد اسے دلّی میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اور جب سندھیا کی مدد سے ۱۷۷۲ء میں وہ دلّی میں تخت نشین ہو گیا تو وہ بھی امرا کی سیاست کا شکار ہو گیا اس کے زمانے میں اوّل تو مراٹھوں کا دلّی پر قبضہ کرنے کا خواب پورا ہوا۔ دوسرے غلام قادر نے شاہ عالم کی بے حرمتی کی اور اسے اندھا کر دیا۔ وہ پہلا اندھا بادشاہ تھا جس نے مغلیہ سلطنت پر حکومت کی۔ ظاہر ہے حکومت امرا کے ہاتھ میں رہی پھر سندھیا کے ہاتھ میں اور بعد کو انگریزوں کے ہاتھ میں۔ اس کے بعد اکبر ثانی (۱۸۰۶ء۔ ۱۸۳۷ء) اور بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۷ء

۱۸۵۷ء) انگریزوں کے ہاتھ کا کھلونا بنے رہے اور آخرکار ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کو ختم کر دیا گیا۔

اگر ایک طرف مغل حکمراں اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں کوتاہی کر رہے تھے تو امرا بھی مغلیہ سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں پیچھے نہیں تھے۔ تاریخ میں ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ اگر بادشاہ کم سن یا کمزور ہو جائے تو کسی باصلاحیت امیر یا امرا نے بڑی ایمانداری سے اس کی سلطنت کو بچایا ہے یا پھر خود اپنی حکومت قائم کی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایسے حالات میں نہ تو کسی بیرونی حملہ آور نے اور نہ ہی مقامی ریاستی حکمرانوں نے مغلیہ سلطنت کو ختم کرکے اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش اور جرأت کی۔ اس کے برعکس امرا نے بھی مغلیہ سلطنت کے بدترین حالات سے فائدہ اٹھا کر محض خود مختاری حکومتیں قائم کرنے پر اکتفا کی۔

کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ بادشاہ کی کمزوریاں، امرا کی خود غرضیاں، اور مختلف فرقوں کی بغاوتیں محض فروعی وجوہات تھیں۔ ان کے خیال کے مطابق اصل میں مغلیہ سلطنت کا انتظامی ڈھانچہ فرسودہ ہو چکا تھا۔ بقول جادو ناتھ سرکار ۱۷ویں صدی تک ترکی اور ایران مغلیہ سلطنت کے لیے نئے خیالات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ ۱۸ویں صدی میں ترکی اور ایران بھی روبہ زوال تھے۔[۴] مارکسسٹ نظریے کے مؤرخین مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ سماج کے اقتصادی ڈھانچے میں پاتے ہیں۔ ستیش چندر کا خیال ہے کہ اکبر کا منصبداری نظام بہترین سیکولر اصولوں پر مبنی تھا۔ اورنگ زیب کے بعد یہ طریقہ جاگیرداری نظام میں بدل گیا۔ ابتدا میں صلاحیتوں کی بنیاد پر منصبداروں کا تقرر ہوتا تھا۔ اور منصب کی مناسبت سے انھیں جاگیریں ملتی تھیں۔ بعد کو جاگیریں وراثت میں ملنے لگیں۔ ظاہر ہے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک شخص کا بیٹا اپنے باپ کی طرح باصلاحیت ہو مگر تنخواہ اور جاگیر اس کو اتنی ہی ملتی تھی۔ اس طرح دھیرے دھیرے ایک بڑی تعداد ایسے امرا کی ہو گئی جو مغلیہ سلطنت کو کچھ دے تو نہیں سکتے تھے مگر بوجھ بنے ہوئے تھے۔[۵]

عرفان حبیب مغلیہ سلطنت کے زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

مغلیہ سلطنت کی توسیع کے ساتھ ساتھ حکومت کے اخراجات میں اضافہ ہوا۔ حکومت کی آمدنی کا اصل ذریعہ زراعتی ٹیکس تھے۔ مغل حکمرانوں نے اپنے بڑھتے ہوئے خرچے زراعتی ٹیکس بڑھا کر پورے کیے مگر زراعت کی پیداوار کو جدید طریقوں سے بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی بے چینی کا اظہار سکھ، جاٹ اور مراٹھوں کی بغاوت میں پایا جاتا ہے۔ اس طرح عرفان حبیب مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ طبقاتی کشمکش میں پاتے ہیں۔[۶]

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغلیہ سلطنت کی سیکولر پالیسی کے باوجود مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا۔ اس وقت مغلیہ سلطنت کے ہر شعبہ میں تبدیلی کی ضرورت تھی۔ ناکارہ مغل بادشاہوں کی جگہ نظام الملک جیسے باصلاحیت امیر یا مراٹھوں جیسی باہمت قوم کو حکومت قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ ساتھ ہی زراعت، تعلیم اور اقتصادی ڈھانچے کو جدید انداز پر ڈھالنے کی ضرورت تھی۔ لیکن ایسے موقع سے کسی ہندستانی حکمراں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

ایسے حالات میں کسی بھی ترقی یافتہ یورپین قوم کی حکومت قائم ہونا تعجب کی بات نہیں تھی۔ لیکن انگریزوں نے بھی زوال آمادہ مغلیہ سلطنت کو مکمل طور پر ختم کرکے اپنی حکومت قائم کرنے سے کافی عرصے تک گریز کیا۔ کیوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی خالصًا ایک تجارتی کمپنی تھی اور انگریز ہمیشہ اپنے تجارتی مفاد کو فوقیت دیتے تھے۔ مغلیہ سلطنت کی کمزوری سے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ پوری۔ اٹھارویں صدی میں ہندستان سیاسی خلفشار، اقتصادی بدحالی اور سماجی و اخلاقی گراوٹ کا شکار رہا۔

خود مختار ریاستوں کا عروج

حیدرآباد دکن | نظام الملک آصف جاہ (۱۷۲۴ء۔ ۱۷۴۸ء) محمد شاہ کے زمانے میں ۱۷۲۲ء میں مغلیہ سلطنت کے وزیر مقرر ہوئے تھے۔ وہ بہت عقلمند

باصلاحیت اور بہادر تھے، انھوں نے مغلیہ سلطنت کی اصلاح کے لیے اپنا ایک منصوبہ پیش کیا۔ مگر محمد شاہ پر نااہل درباریوں کا بہت اثر تھا۔ اس لیے بادشاہ نے اس کے منصوبے پر کوئی توجہ نہ دی۔ مغلیہ دربار گندی سیاست کا اڈا بن چکا تھا۔ اس لیے مجبور ہوکر ۱۷۲۴ء میں نظام الملک نے مغلیہ دربار سے شکار کے بہانے رخصت لی۔ اور اپنے صوبے حیدرآباد دکن کی طرف رُخ کیا، وہاں جاکر اپنی خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا۔ محمد شاہ نے نظام الملک کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مبارز خاں کو شاہی فوجیں دے کر بھیجا۔ مگر اس جنگ میں مبارز خاں کی شکست ہوئی اور مارا گیا۔ مغلیہ سلطنت کی بھی بدنامی ہوئی۔ محمد شاہ نے اپنی شرمندگی دور کرنے کے لیے نہ صرف نظام الملک کی خود مختاری تسلیم کی بلکہ انھیں آصف جاہ کا خطاب بھی عطا کیا۔ اس طرح حیدرآباد ہمیشہ کے لیے مغلیہ سلطنت سے الگ ہوگیا۔ نظام الملک نے اپنی سلطنت کی توسیع کی۔ ۱۷۴۸ء میں اس کا بیٹا ناصر جنگ نظام الملک کی موت کے بعد حیدرآباد کا نظام بنا۔ ناصر جنگ کے قتل کے بعد ان کا پوتا مظفر جنگ تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد نظام علی تخت نشین ہوا۔ اسی کے زمانے میں صوبہ حیدرآباد انگریزوں کے زیر تسلّط ہوگیا۔

اودھ سعادت علی خاں بُرہان الملک (۱۷۲۴ء۔ ۱۹۳۹ء) نظام الملک کے چلے جانے کے بعد مغلیہ دربار میں سعادت خاں برہان الملک کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ نادر شاہ کے خلاف جنگ میں اور اس سے صلح کرانے میں یہی پیش پیش تھے۔ انھیں اودھ کا گورنر بھی مقرر کیا تھا۔ ۱۷۳۹ء میں ان کا انتقال ہوگیا اور ان کا بھتیجا صفدر جنگ (۱۷۳۹۔ ۱۷۵۴ء) اودھ کا گورنر بنا اور مغلیہ سلطنت کا وزیر بھی مقرر ہوا۔ امرا کی خود غرضانہ سیاست کی وجہ سے صفدر جنگ کو مغلیہ دربار چھوڑنا پڑا۔ انھوں نے اودھ آکر اپنی خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا شجاع الدّولہ (۱۷۵۴ء۔ ۱۷۷۵ء) اودھ کا گورنر بنا

اور اس نے مغلیہ سلطنت کی وزارت کا خواب بھی دیکھا۔ نواب شجاع الدّولہ نے شاہ عالم سے مل کر مغلیہ سلطنت پر اپنا تسلّط قائم کرنے کی بہت کوشش کی۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مراٹھوں کو شکست دے کر شاہ عالم کو شہنشاہ اور شجاع الدّولہ کو وزیر مقرر بھی کر دیا۔ مگر اسی زمانے میں انگریز سیاست کے میدان میں داخل ہو چکے تھے۔ شجاع الدّولہ حالاں کہ بہت بہادر اور بڑے سیاستداں تھے مگر انگریزوں کے مقابلے میں ان کی کچھ نہیں چلی۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں، میر قاسم، شجاع الدّولہ اور شاہ عالم کی شکست کے بعد ۱۷۶۵ء اور بعد کو ۱۷۷۳ء میں انگریزوں سے بنارس معاہدہ کے تحت ہمیشہ کے لیے ماتحت بن گئے۔ اس طرح ایک دوسرا زرخیز صوبہ بھی مغلیہ سلطنت کے ہاتھ سے نکل گیا۔

بنگال ۱۷۲۶ء میں مرشد قلی جعفر خاں کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے شجاع الدین خاں کو بنگال کا گورنر مقرر کیا۔ ۱۷۳۹ء میں شجاع الدین کے انتقال کے بعد ان کا بیٹا سرفراز خاں بنگال کا گورنر بنا۔ لیکن سرفراز بہت کمزور تھا۔ ۱۷۴۰ء میں اس کے ڈپٹی علی وردی خاں نے اسے تخت سے اتار دیا۔ اس کو قتل کر کے بنگال میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ علی وردی خاں نے ۱۷۵۶ء تک حکومت کی۔ بنگال اس کے دور میں اقتصادی اعتبار سے خوشحال اور سیاسی اعتبار سے مضبوط تھا۔ عوام بھی اس سے خوش تھے۔ اس کے زمانہ میں مراٹھوں کے اکثر حملے ہوئے جن کا اس نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اسی کے زمانے میں انگریزوں کی تجارت کو بنگال میں بے حد فروغ حاصل ہوا۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے من مانی کارروائی شروع کر دی تھی لیکن علی وردی خاں نے انگریزوں سے چھیڑ چھاڑ مصلحتاً مناسب نہیں سمجھی۔ ۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں کے انتقال کے بعد اس کا نواسا سراج الدّولہ (۱۷۵۶ء۔ ۱۷۵۷ء) بنگال کا نواب بنا۔ کم عمر ہونے کے باوجود وہ باہمّت، بہادر اور جوشیلا تھا۔ سراج الدّولہ کی تخت نشینی کے وقت سے ہی

انگریزوں نے بنگال کی سیاست میں دخل اندازی شروع کردی۔ ایک بااختیار اور مضبوط حکمراں کا بنگال میں نواب ہونا انگریزوں کے حق میں ٹھیک نہیں تھا۔ وہ کسی کمزور شخص کو نواب بنانا چاہتے تھے۔ یہ کشمکش شروع ہوئی تو بنگال کا صوبہ انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

روہیل کھنڈ روہیل کھنڈ صوبے کی بنا اور اس کے بانی نواب علی محمد کا عروج ہندستان کی تاریخ میں ایک بہت دلچسپ باب ہے۔ روہیل کھنڈ کا شاداب اور زرخیز علاقہ کوہِ ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے۔ روہیل کھنڈ کا قدیمی نام کٹھیر تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے تک اس علاقے میں پٹھانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک پٹھان داؤد خاں مغلیہ فوج میں نوکر تھے۔ مراٹھوں کے خلاف داؤد خان نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی بہادری کے انعام میں اسے بدایوں کا علاقہ دے دیا تھا۔ داؤد خاں کے قتل کے بعد اس کا متبنّیٰ بیٹا علی محمد اس کی جاگیر کا جانشین بنا۔ علی محمد خاں نے فتوحات کرکے اس جاگیر میں آنولہ کا اضافہ کیا اور مغلیہ وزیر سے نوابی کی سند حاصل کرلی۔ اس کے بعد اس نے کٹھیر، شاہ آباد، مراد آباد، سنبھل اور بریلی کے علاقے فتح کیے۔ اسی کا نام روہیل کھنڈ رکھا گیا۔ اس کی گورنری کی سند بھی حاصل کرلی۔ نواب علی محمد خاں کے انتقال کے بعد حافظ رحمت خاں نے روہیل کھنڈ کی حفاظت کی۔ مگر شجاع الدولہ کی سیاست کی وجہ سے اس صوبے کی تقسیم ہوئی اور بعد کو یہ صوبہ بھی انگریزوں کے تسلّط میں چلا گیا۔[۵]

فرخ آباد اودھ اور مغل سلطنت کے درمیان کے علاقے میں ایک دوسری پٹھان خودمختار ریاست کا عروج ہوا اس ریاست کے بانی محمد خان بنگش ۱۶۶۵ء میں مئو رشید آباد ضلع فرخ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ مئو رشید آباد کا نام انھوں نے

اپنے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج رکھ دیا۔ محمد خاں بنگش ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر کے درباریوں میں شامل ہوئے۔ ۱۷۱۴ء میں انھوں نے اپنے محسن فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد شہر بسایا۔ محمد خاں بنگش نے افغانوں کو متحد کر کے ایک فوج تیار کی۔ اس ریاست کو اتنا عروج ہوا کہ اس میں علی گڑھ سے کانپور کی دکنی و مشرقی حدود تک کے علاقے شامل ہو گئے تھے۔ جس میں فرخ آباد کے علاوہ تقریباً نصف کانپور، مین پوری، ایٹہ، علی گڑھ، اٹاوہ، شاہجہاں پور اور بدایوں کے کچھ حصے شامل تھے محمد خاں بنگش کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر مغل شہنشاہ نے انھیں الہ آباد اور مالوہ کا گورنر بھی مقرر کر دیا تھا۔ ۱۷۴۳ء میں محمد خاں بنگش کا انتقال ہو گیا۔ ان کا بیٹا قائم خاں فرخ آباد کا خود مختار حکمراں بن گیا۔ صفدر جنگ نے اس ریاست کو اپنے صوبے اودھ میں ملانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے[۵]

ہندستان پر بیرونی حملوں کی نوعیت

نادر شاہ کا حملہ ہندستان پر شمال مغربی راستے سے بیرونی حملے ہوتے رہے۔ یہ حملے عموماً سیاسی اور اقتصادی حالات کی وجہ سے ہوتے تھے۔ مگر انگریز مورخین نے مسلم حکمرانوں کے حملوں کو مذہبی رنگ دے کر ہندو مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

۱۸ ویں صدی میں اسی راستے سے ایران اور افغانستان کے شہنشاہ نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں ہندستان پر حملہ کیا۔ یہ حملہ ایک معمولی وجہ سے کیا تھا۔ نادر شاہ قندھار کے سرکش قبیلے غزالی کو کچلنا چاہتا تھا۔ نادر شاہ نے مغل شہنشاہ محمد شاہ کو تاکید کی تھی کہ وہ اس قبیلے کو اپنی سرحد میں داخل نہ ہونے دے۔ مگر بے خبر محمد شاہ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور غزالی قبیلے نے مغلیہ سرحد میں پناہ لی۔ جس کی وجہ سے نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں ہندستان پر حملہ کر دیا۔ کرنال کے

میدان میں جنگ ہوئی۔ اودھ کے گورنر سعادت علی خاں برہان الملک نے ۳۰۰۰۰ مغلیہ فوج کے ساتھ جنگ لڑی نادر شاہ کی فوج کی تعداد بہت کم ہونے کے باوجود مغلیہ فوج کو شکست ہوئی۔ ہزاروں کی تعداد میں جانیں گئیں۔ نادر شاہ دہلی میں داخل ہوا۔ ایرانی اور ہندستانی سپاہیوں میں ایک معمولی جھڑپ کے نتیجے میں نادر شاہ نے پورے دہلی شہر میں قتلِ عام کا حکم جاری کر دیا۔ نظام الملک اور قمرالدین کی درخواست پر بڑی مشکل سے یہ قتلِ عام بند ہوا۔ نادر شاہ نے شہنشاہ کا لقب اختیار کیا۔ اپنے نام کے سکے جاری کیے اور خطبے میں اپنا نام شامل کرایا۔ نادر شاہ نے سندھ کے پار کا شمال مغربی علاقہ اپنی حکومت میں ملا لیا۔ نادر شاہ جب ہندستان سے واپس گیا تو بیش بہا دولت اونٹوں پر لاد کر لے گیا۔ شاہجہاں کا تخت طاؤس اور کوہِ نور ہیرا بھی اپنے ساتھ لے گیا[۵]۔

احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی نوعیت

ہندستان کی تاریخ میں احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا شمار عموماً ان حملوں میں کیا جاتا ہے جو مذہبی جنون یا دولت حاصل کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے یا پھر سیاسی ہوس کی تکمیل کے لیے کیے گئے جیسے محمود غزنوی، محمد غوری، تیمور اور نادر شاہ کے حملے۔ لیکن بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی خصوصاً ۱۷۶۱ء کی تیسری پانی پت کی جنگ کی نوعیت مختلف تھی۔ حقائق کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابدالی ہندستان کی سالمیت اور مغلیہ حکومت کا پاسباں تھا۔

احمد خاں بن زماں خاں ابدالی (۱۷۲۲ء۔ ۱۷۷۲ء) ملتان میں پیدا ہوا۔ نادر شاہ نے احمد شاہ کی پُر وقار شخصیت سے متاثر ہو کر اسے اپنے ذاتی افسروں میں شامل کر لیا تھا۔ ۱۷۳۹ء کی ہندستانی مہم میں احمد خاں شامل تھا۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد افغانوں نے اپنے روایتی جرگے میں احمد خاں کو اپنا لیڈر چن لیا۔ اور اسے شاہ دُرِ دوراں کا خطاب بھی دیا۔ اس طرح افغانستان کو ایک آزاد ملک

کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

احمد شاہ ابدالی نے اپنے ۲۵ سالہ دور میں ہندستان پر تقریباً ۸ حملے کیے۔ اِن میں سے ۶ حملے پنجاب پر تسلط قائم کرنے کے لیے کیے اور اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کا پانچواں حملہ جو مراٹھوں کے خلاف تھا اور جس کا فیصلہ پانی پت کی تیسری جنگ ۱۷۶۱ء میں ہوا تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس حملے میں ابدالی کی اپنی کوئی غرض نہیں تھی بلکہ ہندستان کی مغلیہ سلطنت کی حفاظت مقصود تھی۔ اس زمانے میں مراٹھے مغلیہ سلطنت کے کھنڈروں پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ہندستان کی مقتدر شخصیتوں نے خصوصاً نجیب الدولہ اور شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی سے اپیل کی کہ وہ ہندستان آکر مراٹھوں اور دیگر باغی عناصر کی سرکوبی کر کے مغلیہ سلطنت کو زوال سے بچائے۔ یہاں تک کہ جے پور کے راجا مادھو سنگھ اور مارواڑ کے راجا نے بھی ابدالی سے مراٹھوں کے خلاف مدد مانگی تھی۔ ان تمام لوگوں کے اصرار پر ابدالی نے ایک کثیر فوج لے کر ہندستان پر حملہ کیا۔

ابدالی نے پہلے ہندستان کے تمام ریاستی حکمرانوں سے اپیل کی کہ وہ اس مہم میں اس کا ساتھ دیں۔ فرخ آباد کے نواب احمد خاں بنگش اور اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ بھی احمد شاہ کی اپیل پر جنگ میں شامل ہوئے، نجیب الدولہ اور راجپوت حکمراں پہلے ہی سے اس کے ساتھ تھے۔ ابدالی نے جاٹوں سے بھی اپیل کی کہ وہ ہندستان کی سالمیت قائم رکھنے میں مدد کریں۔ لیکن جاٹ تیار نہیں ہوئے۔ جنگ سے پیشتر ابدالی نے مراٹھا سرداروں سے بھی اپیل کی کہ وہ جنگ کی پالیسی چھوڑ کر امن امان سے رہیں لیکن مراٹھے اس وقت بہت جوش میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے ابدالی کی اپیلوں کی پروا نہیں کی اور دلی پر حملہ کر دیا۔ نتیجے کے طور پر پانی پت کے میدان میں افغانی فوج اور مراٹھوں کی فوج کے درمیان زبردست مقابلہ ہوا۔

اس جنگ میں آخر کار مراٹھوں کی شکست ہوئی۔

ابدالی نے جنگ کے بعد اپنے ملک واپس جاتے وقت پیشوا بالا جی باجی راؤ سے جنگ میں انسانوں کی جانیں جانے کا اظہارِ افسوس کیا اور امن سے رہنے کی ایک بار پھر اپیل کی۔ ظالم وزیر غازی الدین، ابدالی کے آنے کی خبر سن کر عالمگیر ثانی کو پہلے ہی قتل کر چکا تھا۔ جنگ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم ثانی کو شہنشاہ تسلیم کیا۔ نجیب الدولہ کو مغلیہ حکومت کا میر بخشی مقرر کیا، اور شجاع الدولہ کو وزیر بنایا۔ پھر احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر تین اور حملے کیے جس میں ابدالی کا مقابلہ سکھوں سے ہوا۔ ابدالی کو کامیابی ہوئی۔ ۱۷۷۱ء میں انگریزوں کے خلاف ایک بار پھر ابدالی کو مدعو کیا گیا مگر اس وقت وہ اپنے ملک کے مسائل میں مصروف تھا۔ ۱۷۷۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بقول مورخ گینڈا سنگھ، احمد شاہ درانی نے اپنی بے پناہ ذہانت کا مظاہرہ اپنے شاندار فوجی کارناموں میں کیا ہے در اصل احمد شاہ ابدالی ایک پیدائشی سپاہی، عوام کا رہنما اور ایک قابل حکمراں تھا۔ بقول مورخ فیرئیر، احمد شاہ ابدالی ان تمام برائیوں سے پاک تھا جو عام طور سے مشرقی لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ نہ شراب پیتا تھا نہ افیون کھاتا تھا، نہ اس میں سیاسی چال بازی تھی اور نہ حرص۔ وہ ظلم و تشدد کی پالیسی کو ناپسند کرتا تھا۔ بلکہ وہ ایک رحم دل اور فیاض بادشاہ، وعدے کا پکا اور ایماندار انسان تھا۔ وہ دوسرے مذہب والوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک سے پیش آتا تھا۔ اس لیے وہ ہندستان اور افغانستان کے لوگوں کے ہر طبقے میں مقبول تھا۔ مختصراً احمد شاہ ابدالی نہ صرف بابائے افغانستان تھا بلکہ پاسبانِ ہند بھی تھا۔[۱]

اندرونی بغاوتیں

سکھ:- سکھوں کی بغاوت کو رجعت پسند مورخین نے جان بوجھ کر مذہبی رنگ

دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اگر سکھ اور مغلوں کے ربط و ضبط کی تاریخ کا مطالعہ بغور کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سکھوں کی بغاوت میں سیاسی اور اقتصادی حالات کو دخل تھا۔ عرفان حبیب کے نزدیک سکھ جاٹ اور مراٹھوں کی بغاوتوں میں طبقاتی کشمکش کا عنصر تھا۔[۱۱]

۱۵۳۸ء میں گرو نانک کے انتقال کے بعد ان کے شاگرد انگد جانشین بنے۔ گرو انگد کے انتقال کے بعد امر داس (۱۵۵۲ء۔ ۱۵۷۴ء) گرو مقرر ہوئے اور پھر چوتھے گرو رام داس (۱۵۷۴۔ ۱۵۸۱ء) ہوئے۔ یہ تمام گرو پُر امن طریقے سے گرو نانک کی تعلیمات کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ گرو رام داس کو شہنشاہ اکبر نے امرت سر میں ۵۰۰ بیگھ زمین عطا کی جس پر ایک بڑا تالاب اور گوردوارا تعمیر کرایا گیا۔

گرو ارجن (۱۵۸۱ء۔ ۱۶۰۶ء) اپنی وجاہت اور صلاحیتوں کی بنا پر بہت معروف ہوئے۔ گرو ارجن ہی نے 'آدی گرنتھ' کو مرتب کیا۔ اس گرنتھ میں گرو ارجن نے گرو نانک اور دوسرے گروؤں کی مناجات اور اپنی بھی تعلیمات شامل کی تھیں۔

شہنشاہ جہانگیر کے خلاف جب شہزادہ خسرو نے بغاوت کی تو گرو ارجن نے خسرو کی مدد کی۔ جب جہانگیر کو پتا چلا تو گرو ارجن کو باغی قرار دے کر ۱۶۰۶ء میں سزائے موت کا حکم دیا۔ بقول اے۔بی پانڈے "گرو ارجن کو شہنشاہ کے خلاف باغی خسرو کی مدد نہیں کرنا چاہیے تھی اپنی اس لغزش کی وجہ سے وہ سزا کے مستوجب تھے۔ مگر سزائے موت دے کر ناانصافی کی گئی۔ پانڈے یہ بھی کہتے ہیں کہ مغل شہنشاہوں نے سکھوں کے خلاف کوئی سختی نہیں کی صرف یہ کہ جہانگیر نے ذاتی طور پر سزا دی تھی[۱۲] لیکن بعد میں یہ مشہور کر دیا گیا کہ مغل شہنشاہ، سکھوں پر ظلم کر رہے ہیں۔

گرو ارجن کے بعد ان کے بیٹے ہرگووند سنگھ (۱۶۰۶ء۔ ۱۶۴۵ء) کو گرو بنایا۔ انھوں نے فوجی پیشہ اختیار کیا اور جہانگیر کے دربار میں نوکری کر لی۔ مگر شہنشاہ

اُن کی لاپروائی سے ناراض ہوگیا اور انھیں قید کر لیا گیا۔ شاہجہاں نے انھیں آزاد کر دیا۔ مگر گرُو ہرگووند کی لاپروائی سیاسی خواہشات اور شکار کی عادت کی وجہ سے شاہجہاں سے بھی تعلقات خراب ہوگئے۔

گرُو ہرگووند کے انتقال کے بعد ہررائے (۱۶۴۵ء۔ ۱۶۶۱ء) سکھوں کے گرُو مقرر ہوئے۔ وہ مغل شہنشاہ کے ساتھ امن سے رہنا چاہتے تھے۔ جانشینی کی جنگ میں گرُو ہررائے نے داراشکوہ کا ساتھ دیا تھا۔ اورنگ زیب کی کامیابی کے بعد انھوں نے معافی مانگ لی اور اورنگ زیب نے معاف بھی کر دیا۔ گرُو ہررائے کے بعد ان کے دوسرے بیٹے ہرکشن (۱۶۶۱ء۔ ۱۶۶۴ء) کو گرُو بنایا گیا۔ گرُو ہرکشن کے بعد گرُو ہرگووند کے سب سے چھوٹے بیٹے تیغ بہادر (۱۶۶۴ء۔ ۱۶۷۵ء) کو گرُو بنایا گیا۔

سکھوں میں بھی جانشینی کی کشمکش کی وجہ سے دو گروہ بن چکے تھے۔ گرُو تیغ بہادر نے اپنے حریف رام رائے کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اورنگ زیب کے دربار میں ملازمت کی۔ انھوں نے مغلیہ سلطنت کی جانب سے کئی جنگوں میں حصہ بھی لیا۔ اس کے بعد وہ پنجاب چلے گئے۔ وہاں انھوں نے اپنے آپ کو "سچا بادشاہ" ہونے کا اعلان کر دیا۔ تیغ بہادر کے مخالف گروہ نے شہنشاہ اورنگ زیب سے شکایت کی۔ گرُو تیغ بہادر شہنشاہ کے خلاف کشمیر کے پنڈتوں کو بھی بھڑکا رہے تھے۔ اُنھوں نے پنجاب میں اورنگ زیب کی اجازت کے بغیر ٹیکس وصول کرنا بھی شروع کر دیا۔ تیغ بہادر کے مخالف رام رائے کو بدلہ لینے کا موقع مل گیا اور انھوں نے اورنگ زیب کے کان بھر دیے۔ گرُو تیغ بہادر کو باغی قرار دیا گیا اور حکم عدولی پر سزائے موت دی گئی۔

تیغ بہادر کو پھانسی پر چڑھائے جانے کے بعد سکھوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ انھیں احساس ہوا کہ مغل سکھوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ ان میں بدلہ لینے کا جذبہ پیدا ہوا۔ سکھوں نے اس بار بھی رام رائے کو گرُو نہیں بنایا

اور گرو تیغ بہادر کے لڑکے گووند سنگھ (۱۶۷۶ء ۱۷۰۸ء) کو گرو مقرر کیا۔ بیس سال کی تیاری کے بعد گرو گووند سنگھ نے سکھ قوم کو ایک جنگ جو قوم میں تبدیل کر دیا اور حسب ذیل اصولوں کو سکھوں کے لیے لازمی قرار دے کر ایک نئی پہچان دی۔

۱۔ (پانچ ک) رکھنا (کرپان، کیش، کنگھی، کچھا اور کڑا) رکھنا لازمی قرار دیے۔

۲۔ ذات پات کی تفریق ختم کی

۳۔ گرو کی ہر صورت میں عقیدت لازمی قرار دی۔

۴۔ نام کے آگے سنگھ، کا استعمال لازمی کر دیا۔

۵۔ فوجی تربیت لازمی قرار دی۔

۶۔ مسلمانوں سے کبھی معاہدہ نہ کرنے کی نصیحت کی۔

۷۔ پرتھی چند اور رام رائے کا ہمیشہ کے لیے بائکاٹ کیا۔

۸۔ جھٹکے کا گوشت کھانا رائج کیا۔

۹۔ سگرٹ پینا ممنوع قرار دیا۔

مورخین کا خیال ہے کہ گرو گووند سنگھ کے زمانے سے ایک روحانی فرقہ ہمیشہ کے لیے ایک سیاسی، دنیاوی اور سرکش فرقہ بن گیا۔

گرو گووند سنگھ نے علی الاعلان اورنگ زیب کے خلاف کشمیر اور پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں کو بھڑکایا۔ اس میں مقامی ہندو راجاؤں نے مغلوں کا ساتھ دیا اور گرو گووند سنگھ کو شہر شہر بھٹکنے پر مجبور کیا۔ فاروقی کے مطابق گرو گووند سنگھ کو آخر کار مجبور ہو کر اورنگ زیب سے معافی مانگنی پڑی۔ مگر اِرون اس رائے سے متفق نہیں ہیں۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد گرو گووند نے جانشینی کی جنگ میں شہزادے معظم کا ساتھ دیا۔ اور جب وہ بہادر شاہ اوّل کے لقب سے شہنشاہ بنا تو گرو گووند سنگھ مغل دربار میں منصبدار مقرر کیے گئے۔

جب وہ بہادر شاہ کے ساتھ دکن کی طرف کوچ کر رہے تھے، تو ایک پٹھان نے ۱۷۰۸ء میں انھیں قتل کر دیا۔

گُرو گووند سنگھ لاولد تھے۔ ان کی ذاتی ملکیت کے وارث ان کے متبنّیٰ بیٹے اجیت سنگھ ہوئے۔ گُرو گووند سنگھ نے اپنی زندگی ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد کوئی گُرو نہیں ہو گا۔ انھوں نے ایک نمایندہ جماعت کی تشکیل کر دی تھی جس کے فیصلے گُرو کے فیصلے سمجھے جا سکتے تھے۔ گُرو گووند سنگھ کے انتقال کے بعد سکھ قوم میں پھوٹ پڑ گئی۔ سکھ سردار اپنی جاگیریں بنانے میں مصروف ہو گئے۔ جس کے لیے انھوں نے لوٹ مار کا طریقہ بھی اپنایا۔ گُرو گووند سنگھ کے شاگرد بندا بہادر نے اعلان کیا کہ وہ ہی گُرو گووند سنگھ ہیں۔ جن کی پیشین گوئی گُرو نے کی تھی۔ تمام سکھ اس کے ساتھ ہو گئے۔ بندا بہادر نے پہلے سونی پت کے فوجدار کو ہرایا پھر سرہند کے فوجدار کو شکست دی اور بہت سے شہروں پر قبضہ کیا۔ بندا بہادر نے جالندھر میں سلطان پور اور اتر پردیش میں سہارنپور پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔

بہادر شاہ اوّل جب دکن سے واپس آئے تو انھوں نے شاہی فوج کو سکھوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بھیجا۔ شاہی فوج نے سکھوں کے قلعے سرہند، سدھورا اور لوہ گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ لیکن سکھوں نے جنگ جاری رکھی۔ فرخ سیر کے زمانے میں راجپوتوں کی مدد سے سکھوں کی بغاوت کو کچل دیا گیا۔ بندا بہادر کو سزائے موت دی گئی۔ اس کے بعد کپور سنگھ عرف جسّا سنگھ نے ۱۷۶۱ء میں دوبارہ جدّوجہد جاری کی۔ فوجی تنظیم کا نام خالصہ رکھا لیکن بندہ بہادر کے بعد سکھ کافی عرصے کے لیے خاموش ہو گئے۔[۱۳]

جاٹ

جاٹ قوم کے لوگ زراعت پیشہ تھے۔ یہ لوگ پنجاب، ہریانہ مغربی اتر پردیش، راجستھان، گوالیار، میں رہائش پذیر تھے۔ یہ لوگ بہت بہادر اور سخت جان تھے۔

جاٹ اور مغلوں کا جھگڑا اورنگ زیب کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جاٹوں نے ابو لفضل کی دولت لوٹ کر کیشو رمندر بنوایا تھا۔ یہ مندر بغاوت کا اڈا بنا ہوا تھا۔ اورنگ زیب نے متھرا میں مسجد کی تعمیر اور مندر کی تخریب کے لیے فوجدار عبد النبی کو بھیجا۔ ۱۶۶۹ء میں جاٹوں کے لیڈر گوکل جاٹ نے عبد النبی کو قتل کر دیا۔ اورنگ زیب نے پھر شاہی فوج بھیجی اور گوکل جاٹ کی بغاوت کو کچل دیا۔ راجارام جاٹ کے عروج تک امن قائم رہا۔ لیکن راجارام نے جاٹوں کی تنظیم شروع کر دی اور راہداری وصول کرنا شروع کر دی۔ اورنگ زیب نے راجا رام کی بغاوت کو بھی ۱۶۸۸ء میں کچل دیا۔ بعد میں چوڑامن جاٹ لیڈر بنا۔ وہ بہت عقلمند اور بہادر تھا۔ اس نے اورنگ زیب کی دکن کی مہم سے فائدہ اٹھا کر غیر موجودگی میں اپنی طاقت کو بڑھا لیا۔ ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۳ء تک نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی طاقت کو بڑھاتا رہا۔ فرخ سیر نے اس کی سرکوبی کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ آخر کار مغلیہ حکومت کی طرف سے اسے متھرا سے چمبل تک کے راستے کا انچارج مقرر کر دیا گیا۔ جب چوڑامن نے سرکشی کی تو اس کی سرکوبی کے لیے سوائے جے سنگھ کو شاہی فوج لے کر بھیجا۔ یہ جنگ ۱۷۱۶ء سے شروع ہو کر ۱۷۱۸ء تک چلی۔ آخر کار چوڑامن کو شکست ہوئی، معاہدۂ امن اور ۵۰ لاکھ روپیا تاوان کے طور پر ادا کرنا پڑا۔

محمد شاہ کے زمانے میں سوائے جے سنگھ نے چوڑامن کے بھتیجے بدن سنگھ کو اپنے ساتھ ملا کر چوڑامن کی طاقت کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ اس نے خودکشی کر لی جاٹوں میں لوٹ مار اور ڈکیتی کا رجحان عام ہو گیا تھا۔ بدن سنگھ نے انھیں باقاعدہ طور پر منظم کیا۔ انھیں زراعت کا پیشہ اور فوجی پیشہ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ بھرت پور کی قلعہ بندی کرائی۔ ۱۷۵۲ء میں مغلیہ حکومت نے اسے بھرت پور کا راجا تسلیم کر لیا۔ اس کے بیٹے سورج مل جاٹ نے اپنی حکومت کو مراٹھوں اور افغانوں سے محفوظ رکھا۔ وہ بہت عقلمند سیاست داں تھا۔ ایک طرح سے جاٹوں کی ایک خودمختار ریاست بن گئی۔[۱۱]

راجپوت اکبر کے زمانے سے ہندوؤں خصوصاً راجپوت قوم اور مغلوں کے درمیان ربط اور یگانگی کا جو ماحول پیدا ہونا شروع ہوا وہ بے مثال تھا۔ آپسی شادیوں کی وجہ سے مختلف مذاہب ماننے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ رشتوں میں منسلک ہو گئے تھے۔ مغلوں کو راجپوتوں پر بے حد بھروسا تھا۔

کچھ مورخین نے اس بے مثال رشتے کو مذہبی تنگ نظری کے رنگ سے مسخ کیا ہے۔ محمد شاہ کے دور کو چھوڑ کر راجپوت ریاستیں عموماً مغلوں کو تعاون دیتی رہیں۔ اورنگ زیب کے زمانے میں جے سنگھ دوم نے شیواجی کو گرفتار کیا۔ ۱۷۱۸ء میں سوائے جے سنگھ نے چوڑامن جاٹ کی سرکوبی کی۔ ۱۷۶۱ء میں جے پور کے راجا مادھو سنگھ اور مارواڑ کے راجا نے مغلیہ سلطنت کو بچانے کے لیے مراٹھوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کی مدد کی۔ شاہ عالم ثانی جب اپنے ہی امرا کے ہاتھوں بے حرمتی کا شکار بن رہے تھے تو ایک آواز پر سندھیا نے لبیک کہا اور دو بار دہلی آکر مغلیہ سلطنت کو بچایا۔ تبھی سے ۱۸۰۳ء تک مغلیہ سلطنت کے وکیل مطلق کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء میں نانا صاحب نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت اٹھا کر مغل شہنشاہ بہادر شاہ ثانی کی ماتحتی قبول کرنے کا اعلان کیا۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغلوں کے دورِ زوال میں خصوصاً محمد شاہ کے زمانے سے راجپوت ریاستوں کا تعاون پہلا جیسا نہیں رہا تھا۔ اور اس دور میں ان کی حیثیت خود مختار ریاستوں کی ہو گئی تھی۔[۱۵]

مراٹھے

شیواجی ایک ریاستی حکمراں کی حیثیت سے شیواجی کا عروج بھی اسی اہمیت کا حامل ہے جو حیدر علی، رنجیت سنگھ، نواب علی محمد اور محمد خاں بنگش کی تھی۔ لیکن فرقہ پرست مورخین نے شیواجی کو نہ صرف ہندو قوم کا محافظ

قرار دیا بلکہ ان کا رشتہ قومی تحریک سے بھی جوڑ دیا ہے۔

شیواجی کے والد شاہ جی (۱۶۳۶ء) تک بیجاپور کے حکمراں عادل شاہ کے درباری تھے۔ خدمت کے عوض انھیں پونا کی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ شیواجی نے اسی جاگیر میں اضافہ کر کے ریاست بنالی اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ مگر مغل حکمراں نے تسلیم نہیں کیا۔ اصل میں تو شیواجی مراٹھوں کی ریاست کے بانی تھے۔ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ شیواجی پورے ہندستان میں ہندوؤں کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں مغلیہ حکومت کافی مضبوط اور طاقت ور تھی۔ اس لیے اگر یہ خواب تھا بھی تو پورا نہ ہو سکا۔

شیواجی نے سب سے پہلے بیجاپور کے کچھ علاقوں پر قبضہ کیا۔ بیجاپور کے حکمراں نے افضل خاں کو شیواجی کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ شیواجی نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے افضل خاں کو قتل کر دیا۔ اورنگ زیب نے جب دکن کی فتح کی تو شیواجی کی بغاوت بھی رونما ہوئی۔ شیواجی نے مغل شہنشاہ کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا۔ تو اورنگ زیب نے شایستہ خاں کو شیواجی کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ لیکن شایستہ خاں کی ہار ہوئی۔ اس کے بعد جے سنگھ کو بھیجا گیا۔ اور وہ اپنے اثر سے شیواجی کو آگرہ لانے میں کامیاب ہوئے۔

جے سنگھ نے شیواجی کو یقین دلایا تھا کہ شہنشاہ اورنگ زیب انھیں باعزت طریقے سے اپنے منصبداروں میں شامل کرلیں گے۔ جب شیواجی کو پنج ہزاری کا منصب عطا کیا گیا تو انھوں نے اس منصب کو اپنی شایانِ شان نہیں سمجھا اور غصے کا اظہار کر بیٹھے۔ جس کے نتیجے میں شیواجی کو قید کر دیا گیا۔ شیواجی کسی طرح سے قید سے نکل بھاگے اور اپنی ریاست میں جا کر اپنے چھترپتی ہونے کا اعلان کر دیا۔

شیواجی کی جنگوں میں کامیابی کا راز اُن کی قوّتِ ارادی اور خصوصًا گوریلا جنگ کے طریقوں کے استعمال کرنے میں تھا۔

شیواجی نہ تو دوسرے مذہب کی توہین کرتے تھے اور نہ ہی اپنے مذہب کی توہین برداشت کرسکتے تھے۔

۱۶۸۰ء میں شیواجی کے انتقال کے بعد جانشینی کی کشمکش کی وجہ سے مراٹھوں کا زور ختم ہوگیا۔ آخر کار ۱۷۰۷ء میں جب ساہو چھترپتی بنا تو جھگڑے ختم ہوئے۔ مگر اس میں شیواجی جیسی صلاحتیں نہیں تھیں۔

بالاجی وشوناتھ

ایک عقلمند برہمن بالاجی وشوناتھ (۱۷۱۳ء۔ ۱۷۲۰ء) کی مدد سے ساہو کو چھترپتی بنایا گیا تھا۔ ساہو نے انھیں اپنا پیشوا مقرر کیا۔ بالاجی نے مغلیہ سلطنت کے ساتھ دوستی اور امن کی پالیسی اپنائی۔ ۱۷۱۴ء میں مغلوں سے ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت مراٹھوں نے مغل شہنشاہ کو تسلیم کرلیا اور دس لاکھ روپے سالانہ خراج دینا منظور کیا۔ مغل شہنشاہ نے ساہو کو چھترپتی تسلیم کرکے اسے ۱۵۰۰۰ کا منصب عطا کیا۔ اس کے علاوہ خاندیش، برار گونڈوانہ، اور کچھ کرناٹک کے علاقے بھی عطا کیے۔ حیدرآباد کے کچھ ضلع بھی دیے۔ نیز دکن کے ۶ صوبوں سے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا اختیار دے دیا۔ یہ سب کچھ بالاجی وشوناتھ کی عقلمندی اور سیاست سے حاصل ہوا تھا۔ اسی زمانے سے چھترپتی محض نام کا رہ گیا۔ اور مراٹھوں کی حکومت پیشواؤں سے منسوب ہوگئی۔

پیشوا باجی راؤ اوّل

(۱۷۲۰ء۔ ۱۷۴۰ء) بالاجی وشوناتھ کے انتقال کے بعد باجی راؤ اوّل پیشوا مقرر ہوئے۔ باجی راؤ کو مراٹھوں کی سلطنت کا دوسرا بانی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ ان کے دور میں مراٹھا طاقت اور حکومت کو زیادہ عروج حاصل ہوا۔ باجی راؤ اوّل نے ہندستان میں ہندو پدپادشاہی قائم کرنے کا نعرہ بلند کیا تھا۔ انھیں اس منصوبے میں کافی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ کئی جنگیں جیتیں، کافی مغلیہ علاقے اپنی حکومت میں شامل کرلیے۔ اور جب شمال میں دہلی کی طرف توسیع سلطنت کا ارادہ کیا تو سیناپتی ترمبک راو سے

اختلاف ہو گئے۔ ساہو نے منظوری دے دی تو ترمبک راؤ نے نظام الملک سے ربط قائم کیا۔ پیشوا باجی راؤ نے نظام الملک اور ترمبک جی کو ۱۷۳۱ء میں شکست دی اور نظام الملک کو باجی راؤ سے معاہدہ کرنا پڑا۔ اس کے بعد باجی راؤ نے جے سنگھ سے دوستی کرکے ۱۷۳۷ء میں دہلی پر فوج کشی کر دی مغل شہنشاہ نے نظام الملک کو مدد کے لیے بلایا۔ باجی راؤ نے اس جنگ میں مغلیہ فوج کو بھی شکست دے دی۔ محمد شاہ کو معاہدہ کرنا پڑا اور نرمدا اور چمبل کے درمیان کا علاقہ مالوہ مراٹھوں کو دینا پڑا۔ پچاس لاکھ روپے تاوان جنگ کے طور پر باجی راؤ کو ادا کیا۔ اس طرح باجی راؤ کا منصوبہ تقریباً پورا ہو گیا تھا صرف دلّی پر قبضہ کرنا باقی رہ گیا تھا۔ ۱۷۳۹ء میں باجی راؤ نے پرتگالیوں سے سالسیٹ اور بسین کا علاقہ چھین لیا۔ اسی سال غالباً دہلی پر حملہ کرنے کا ارادہ تھا کہ نادر شاہ نے ہندستان پر حملہ کر دیا۔ باجی راؤ نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی۔ ۱۷۴۰ء میں پیشوا باجی راؤ اوّل کا انتقال ہو گیا۔

پیشوا بالاجی باجی راؤ (۱۷۴۰ء۔ ۱۷۶۱ء) باجی راؤ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا بالاجی باجی راؤ پیشوا بنا۔ اس نے باجی راؤ کی پالیسی کو جاری تو رکھا مگر بالاجی باجی راؤ میں اپنے والد کی صلاحیتیں نہیں تھیں۔

بالاجی باجی راؤ نے میسور، کرناٹک اور بیجاپور کے کچھ علاقے جیتے۔ ۱۷۵۷ء میں بالاجی نے ملہار راؤ ہولکر اور رگھوناتھ راؤ کی سرکردگی میں دہلی کی فتح کے لیے فوج بھیجی۔ رگھوناتھ راؤ نے پہلے تو تیمور شاہ سے پنجاب چھین لیا۔ اس وقت تک احمد شاہ ابدالی کو مراٹھوں کی ریشہ دوانیوں کی خبر پہنچ چکی تھی۔ مراٹھے دہلی تک پہنچ گئے تھے۔ مگر ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندستان پر حملہ کیا تاکہ وہ اپنے صوبے پنجاب کو مراٹھوں سے دوبارہ حاصل کرلے اور مغلیہ سلطنت کو مراٹھوں سے بچا سکے۔ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ ہوئی جس میں مراٹھوں کو شکست ہوئی۔ اور اس طرح کچھ عرصے کے لیے مراٹھوں کا خطرہ ٹل گیا۔

مورخین نے مراٹھوں کی ناکامی کے اسباب بیان کیے ہیں۔ ان کے خیال میں

مراٹھوں کی ہار کی اصل وجہ یہ تھی کہ بالاجی باجی راؤ کے زمانے میں گوریلا جنگ کے طریقوں کو خیرباد کہہ دیا گیا تھا۔ اور میدان جنگ میں مقابلہ ہونے لگا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مراٹھوں کی فوج میں زیادہ تر عارضی سپاہی ہوتے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ہندو حکمرانوں نے مراٹھوں کی بجائے مغلیہ سلطنت کا ساتھ دیا[۱۲] اور آخر میں یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ مراٹھا سرداروں کے مقابلہ میں احمد شاہ زیادہ عقلمند، ہوشیار اور بہادر حکمراں تھا۔

---

۱ سید اطہر عباس رضوی، شاہ ولی اللہ اینڈ ہز ٹائمس۔ ص۔ ۲۹۴
۲ آر۔سی۔مجومدار، ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا، حصہ۔۲، ص ص۔ ۵۲۔ ۶۲
۳ ایضاً
۴ ملاحظہ کیجیے، سر جادوناتھ سرکار، دی رائز اینڈ فال آف دی مغل ایمپائر
۵ ملاحظہ کیجیے، ستیش چندر، پارٹیز اینڈ پالیٹکس ان مغل انڈیا۔
۶ ملاحظہ کیجیے، عرفان حبیب، ایگریرین سسٹم آف مغل انڈیا
۷ مجیب اشرف، مسلم ایٹی چیوڈس ٹووارڈس برٹش رول اینڈ ویسٹرن کلچر ان انڈیا، ص ص۔ ۳۱۔ ۸۲
ملاحظہ کیجیے۔ اے۔بی۔پانڈے، لیٹر مڈیول انڈیا، ص ص، ۲۴۵۔ ۲۴۷
۸ ایضاً، ص۔ ۲۴۵
۹ ایضاً، ص ص، ۲۴۸۔ ۲۵۴
۱۰ گینڈا سنگھ، احمد شاہ ابدالی، ص ص ر ۳۲۸۔ ۳۲۹
۱۱ حبیب، مذکورہ بالا
ملاحظہ کیجیے۔ فاروقی، اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمس، ص۔ ۳۸۳۔ اور مولانا شبلی، عالمگیر، ص ص۔ ۱۔ ۴۵
۱۲ پانڈے، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵ (بقیہ حوالہ صفحہ ۲۵۳ پر)

باب - ۳

یورپین اقوام کی ہندستان میں آمد اور سمندری تجارت کا آغاز

پرتگالیوں کی آمد اور تجارت

پرتگال کا مشہور تاجر واسکوڈی گاما ۱۷ مئی ۱۴۹۸ء کو تجارت کی غرض سے سمندری راستے سے ہندستان میں داخل ہوا۔ اس وقت دکنی ہند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ اس لیے پرتگالی تاجروں کو اپنے تجارتی اڈے قائم کرنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔

یورپ کی ۱۴ویں اور ۱۵ویں صدی کی نشاۃ ثانیہ نے مرکینٹائل تحریک یا سمندری تجارت کی تحریک کو جنم دیا۔ آج جو یورپ کے ممالک اتنے ترقی یافتہ نظر آرہے ہیں ۱۵ویں صدی میں وہ اتنے ہی پچھڑے ہوئے تھے جتنے ایشیا کے ممالک۔ یورپ کے ممالک کو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایشیا اور افریقہ کے ممالک سے تجارتی تعلقات رکھنے پڑتے تھے۔ خصوصاً گرم مسالوں کی تجارت عرصۂ دراز سے جاری تھی۔ دراصل یورپ کے ممالک میں بے حد سردی کی وجہ سے زندگی بے حد دشوار تھی موسم سرما میں جانوروں کو کاٹ کر ان کا گوشت محفوظ کرنے، مفید جانوروں کے لیے چارا محفوظ رکھنے، شراب میں خوشبو اور کھانے کو ذائقہ دار بنانے کے لیے یورپ میں گرم مسالوں کی بے حد مانگ تھی۔ یہ گرم مسالے

وہ ایسٹ انڈیز اور ہندُستان سے حاصل کرتے تھے۔

ساتویں صدی تک یوُرپین قومیں براہ راست یہ تجارت ہندُستان اور ایسٹ انڈیز سے کرتی رہیں۔ رومن امپائر کے زوال کے بعد عربوں کے عروج سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اس کے بعد یہ تجارت عرب تاجروں کے توسّط سے کرتے رہے۔ عرب تاجر ہندُستان سے گرم مسالے خرید کر فارس کی کھاڑی، اسکندریہ، قسطنطنیہ اور پھر بحرِ روم کے راستے سے وینس اور جینوا کے تاجروں کو بیچ دیتے تھے۔ وہاں سے ڈچ تاجروں کے ذریعے گرم مسالے تمام یوُرپ تک پہنچ جاتے تھے۔

۱۳ ویں صدی میں چنگیز خاں کے حملوں نے اور ۱۴ ویں صدی میں تیمور کے حملوں نے اس تجارتی راستے کو پُر خطر بنادیا۔ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرلیا۔ یونانی عالم اپنے علمی ذخیروں کے ساتھ روم میں جا بسے جہاں انھیں دیگر عالموں کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا اور اظہارِ خیال کی آزادی ملی۔ اس طرح یوُرپ میں نشاۃِ ثانیہ کی ابتدا ہوئی۔ نشاۃ ثانیہ نے یوُرپ کی زندگی اور حالات کو بدل دیا۔ اسی زمانے میں عیسائی اور مسلمانوں میں مذہبی جنگیں رونما ہوئیں۔

ان تمام دشواریوں کے پیشِ نظر ۱۳ ویں صدی کی ایجادات خصوصًا قطب نُما کی مدد سے اٹلی، اسپین اور پُرتگال کے تاجروں نے نئے سمندری راستے تلاش کرنا شروع کیے تاکہ ہندُستان اور ایشیا سے براہِ راست تجارت کرسکیں۔

پُرتگال کے پرنس ہنیری دی نیوی گیٹر (۱۳۹۴ء۔ ۱۴۶۰ء) نے ان تاجروں کو باہر بھیجنے کے لیے سمندری جہاز رانی کی تربیت کا اسکول کھولا۔ کچھ سیّاح خصوصًا مارکو پولو ہندُستان اور چین کا سفر کرچکے تھے اور انھوں نے وہاں کے بارے میں معلومات اپنے سفرناموں میں درج کردی تھیں۔ ان سفرناموں کی مدد سے بھی ان ملکوں میں جانا آسان ہوگیا۔

سب سے پہلے اٹلی کا مشہور سیّاح کولمبس ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء میں ہندُستان

کی تلاش میں نکلا مگر ہندُستان کے بجائے وہ ایک نئے ملک امریکہ میں پہنچ گیا جو یُورپ کے ممالک کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا ۔ ایک دوسرے سیّاح امیریگو (AMERIGO VESPUCCI) کے نام پر اس ملک کا نام امریکہ رکھ دیا گیا ۔ اور ہندُستان کی تلاش پھر بھی جاری رہی۔

ابتدا میں ہینزی اسکول کے کچھ تربیّت یافتہ سیّاح میڈیرا اور ایزورس کے جزیروں تک پہنچ پائے ۔ بارتھیلو میوڈیاز ۱۴۸۸ء میں افریقہ برّاعظم کے دکنی کنارے کیپ آف گڈ ہوپ تک پہنچ گیا ۔ وہاں سے واسکوڈی گاما ۱۴۹۷ء میں مالندی تک اور ۱۴۹۸ء میں ایک عرب تاجر کی مدد سے دکنی ہندُستان کالی کٹ کے علاقے میں داخل ہو گیا ۔ جب کسی نے اس کی آمد کا مقصد پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ وہ ہندُستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ اور گرم مسالوں کی تجارت کے مقصد سے آیا ہے ۔ کالی کٹ کے راجا زیمورِن نے اس نئے سیّاح کا خیر مقدم کیا ۔ ۱۴۹۹ء میں واسکوڈی گاما اپنے اخراجات سے ساٹھ گُنا مال اپنے وطن پُرتگال واپس لے گیا ۔ دوسرے سال کیبرال ۱۲ جہازوں کا بیڑا لے کر ہندُستان آیا ۔ اس مرتبہ عرب تاجروں نے کیبرال کی مخالفت کی اور زیمورِن کو اس کے خلاف بھڑکایا اس لیے اس بار کیبرال کو تجارت میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ۔ اس ناکامی کے بعد ایک بار پھر واسکوڈی گاما کو (۱۵۰۲ سے ۱۵۰۴ء) ہندُستان بھیجا گیا ۔ واسکوڈی گاما نے زیمورِن کو سمندری لڑائی میں شکست دی اور اس بار بھی تجارت میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

۱۵۰۴ء میں پُرتگال سے المیڈا کو باقاعدہ وائسرائے مقرر کرکے بھیجا گیا ۔ ۱۵۰۹ء تک اس نے پُرتگالی تجارت کو خوب فروغ دیا ۔ لیکن ہندستان میں پُرتگالی تجارت کو فروغ دینے اور مستقل طور پر فیکٹریاں قائم کرنے کا سہرا الفانسو ڈی البوقرق (۱۵۰۹ء ۔ ۱۵۱۵ء) کے سر بندھا ۔ اس نے اپنے تجارتی اڈّے مستقل طور پر قائم کیے بلکہ گوا، ڈامن اور ڈیو میں اپنی حکومت بھی قائم کر لی ۔ ۱۵۱۰ء میں گوا پر قبضہ کیا ۱۵۱۱ء میں مشرقی ایشیا میں ملکّا پر قبضہ کیا ۔ ۱۵۱۵ء میں فارس کی کھاڑی کے تجارتی اڈّے آرموز پر قبضہ کیا ۔ افریقہ میں سوکوترا اور لنکا میں کولمبو پر بھی قبضہ کیا ۔ گجرات میں ڈیو کے علاقے پر قبضہ کیا ۔ گوا کو اپنی راجدھانی بنایا ۔ اس طرح البوقرق کو

ہندستان میں پرتگالی سلطنت کا بانی کہا جاتا سکتا ہے۔

ابوقرق نے تجارت کے علاوہ یہاں کے لوگوں کو بزورِ تلوار عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا۔ پرتگالی چوں کہ کٹّر مذہبی تھے' اس لیے وہ جہاں بھی گئے انھوں نے اپنے مذہب کو فروغ دینے میں طاقت کا استعمال کیا۔ اس طرح تقریباً ایک صدی تک پرتگالی تن تنہا ہندستان کی تجارت سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

ڈچ تجارت کی نوعیّت

ہالینڈ کے ڈچ تاجر کافی عرصے تک پرتگال کے لِسبن بندرگاہ سے گرم مسالے خرید کر یورپ کے تمام ممالک کو مہیا کرتے تھے۔ ۱۶ویں صدی کے آخر میں اور ۱۷ویں صدی کے شروع میں مذہبی اصلاحی تحریکیں رونما ہوئیں اور کچھ سیاسی تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ ۱۵۶۶ء میں نیدرلینڈ نے اسپین کے خلاف بغاوت کردی ۱۵۸۰ء میں پرتگال کو اسپین کی ماتحتی قبول کرنی پڑی۔ اس طرح ہالینڈ کو لِسبن بندرگاہ سے گرم مسالے ملنا بند ہوگئے۔ لہٰذا ڈچ تاجروں نے بھی نئے بحری راستوں کی تلاش شروع کردی۔ جب کوئی نیا راستہ نہیں مل پایا تو ڈچ تاجروں نے پرتگالیوں ہی کے بحری راستے کو اپنا کر ہندستان پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ ڈچ سیّاح لِنس کوٹن پرتگالیوں کے ساتھ کام کرچکا تھا۔ اسے ہندستان کے بارے میں پوری معلومات تھیں۔ اس لیے اس نے ایک منصوبہ تجویز کیا۔ اس منصوبے کے تحت ۱۵۹۵ء میں ہاؤٹ من ایک تجارتی بیڑا لے کر انڈونیشا کے بنیٹم علاقے میں پہنچا۔ اس علاقے میں پرتگالی تجارت تو کر رہے تھے مگر فوجی اعتبار سے ان کے اڈّے مضبوط نہیں تھے۔ اس لیے ڈچ تاجروں کو اپنی تجارت جمانے میں زیادہ دِقّت نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ڈچ چھوٹی کمپنیاں قائم کرکے تجارت کرتے رہے۔ ۱۶۰۲ء میں بارنیویلٹ نے آٹھ کمپنیوں کو متحد کرکے ایک یونائٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور ڈچ حکومت سے اس کمپنی کو تجارت کرنے کی اجارہ داری حاصل کرلی۔ دھیرے دھیرے ڈچ تاجروں نے ملکّا، اور انڈونیشیا میں اپنی حکومت بھی قائم کرلی۔ ہندستان میں کورومنڈل کے پُلی کٹ کے علاقے میں بھی تجارتی اڈّا قائم کرلیا۔

۱۶۱۸ء میں کوئن نے ڈچ کی تجارت کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ کوئن نے اپنے تجارتی اڈّے ایسے علاقوں میں مضبوط کیے جہاں گرم مسالوں کی پیداوار بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ اس نے بٹاویہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ فیکٹریوں کی قلعہ بندیاں کرائیں۔ وہیں سے جاوا اور سماترا کی تجارت کو اپنے قبضے میں رکھا۔ اور اس طرح بہت جلد ڈچ تاجر ملیشیا کے علاقے کے مالک بن گئے۔ ہندستان میں پلی کٹ کے علاوہ بنگال میں چنسورا اور گجرات میں سورت اور ایران میں بندر عبّاس میں اپنے تجارتی اڈّے قائم کیے۔

۱۶۳۶ء میں ڈچ تاجروں نے پرتگالیوں کے تجارتی اڈوں پر حملے شروع کر دیے۔ ان حملوں کا مقصد مالابار اور سیلون کے علاقوں میں کالی مرچ اور سفید الائچی کی تجارت کی اجارہ داری حاصل کرنا تھا۔ ۱۶۳۸ء میں انھیں سیلون میں کامیابی ہو گئی۔ ۱۶۴۱ء میں ملکّا پر پورا قبضہ ہو گیا۔ اسی سال ڈچ اور پرتگالی تاجروں میں ۱۰ سال کے لیے معاہدہ امن ہو گیا۔ اس معاہدے کے اختتام پر ڈچ تاجروں نے ۱۶۵۳ء میں سیلون پر قبضہ کر لیا۔ پرتگالی تاجروں کو سیلون اور ہندستان میں کورومنڈل کوسٹ کے علاقے کو چھوڑ کر جانا پڑا۔ ۱۶۶۱ء میں ڈچ تاجروں نے پرتگال کے مالابار کے تجارتی اڈّوں پر حملہ کیا۔ پرتگالیوں کی شکست ہوئی اور معاہدہ کرنا پڑا۔ گوا، ڈامن اور ڈیو اور بسین کے علاقوں کو چھوڑ کر ڈچ تاجروں نے تمام علاقے پر اپنا قبضہ جما لیا۔

ڈچ تاجروں کی پرتگالی تاجروں کے مقابلے میں کامیابی کی تین خاص وجوہات تھیں۔ اوّل پرتگالی بحری طاقت کے مقابلے میں ڈچ بحری طاقت برتر تھی۔

"THE DUTCH HAD BEGUN WHERE THE PORTUGUESE HAD LEFT OF IN THE MATTER OF NAVAL TECHNIQUE" [13]

دوسری وجہ یہ تھی کہ ڈچ تاجروں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں ان علاقوں میں قائم کیں جہاں گرم مسالوں کی پیداوار بہت زیادہ تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ پرتگالی مذہبی کٹرپن کی وجہ سے بہت بدنام ہو گئے تھے۔ ڈچ تاجروں نے مذہب کے معاملے میں غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی۔ وجہ یہ تھی کہ ہالینڈ کے لوگ اصلاحی تحریک کی وجہ سے

مذہبی اعتبار سے روشن دماغ اور وسیع النظر تھے۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی

ملکہ ایلزبیتھ نے ۱۶۰۰ء میں برطانوی تاجروں کو ہندستان میں تجارت کرنے کا اجازت نامہ جاری کیا۔ اس سے پیشتر برطانوی تاجروں نے ۱۵۸۱ء میں ایک لیوانٹ کمپنی قائم کی تھی جو قدیم تجارتی راستے سے تجارت کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ پرتگال اور ہالینڈ سے بھی گرم مسالے حاصل کرتے تھے۔

۱۶۰۰ء میں برطانوی تاجروں نے بھی ڈچ تاجروں کی طرح سمندری راستے سے ہندستان سے تجارت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے تین خاص سبب بتلائے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ لسبن اور اینٹورپ بندرگاہوں سے انگلستان کو گرم مسالے ملنا بند ہو گئے تھے، دوم لیوانٹ کمپنی کی تجارت ناکافی تھی۔ انگریزوں کے پاس سونے چاندی کی مقدار بہت کم تھی اس لیے محض گرم مسالوں کی تجارت پر اکتفا نہیں کر سکتے تھے۔ بقول کے۔ این۔ چودھری انگریزوں نے ہندستان میں بیرونی اور اندرونی ایک بندرگاہ سے دوسرے بندرگاہ تک گرم مسالوں کے علاوہ دیگر اشیا میں تجارت شروع کی وہ کورومنڈل کوسٹ کا کپڑا ملیشیا اور انڈونیشیا لے جاتے تھے انھوں نے نیل، جائفل وغیرہ کی تجارت بھی شروع کی۔ اس طرح انھوں نے تجارت کو محض گرم مسالوں کی برآمد تک محدود نہیں رکھا بلکہ تجارت کو وسعت دی۔ اس طرح انگریزوں کے زرِ تبادلہ کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ یہ تجارت دیگر قوموں سے مختلف تھی۔ ۱۵۸۰ء میں ایک انگریزی سیاح ڈریک نے دنیا کا دورہ کر کے ضروری معلومات فراہم کر دی تھیں ۱۵۹۱ء میں لنکاسٹر نے انڈونیشیا میں تجارت کے امکانات کی اطلاع فراہم کی۔ لیوانٹ کمپنی کے تاجر ولیم کلارک نے مطلع کیا کہ ڈچ صرف گرم مسالو کی تجارت کر رہے تھے۔ اور تجویز پیش کی کہ برطانوی تاجر دیگر اشیا میں تجارت کر سکتے ہیں۔ اس طرح ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو ملکہ ایلزبیتھ کے چارٹر کے تحت برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی وجود میں آئی۔

۱۶۰۸ء میں ولیم ہاکنس کو کمپنی نے تجارتی سفیر بنا کر مغل دربار آگرہ بھیجا۔ تاکہ وہ مغل شہنشاہ سے تجارت کے لیے باقاعدہ طور پر اجازت حاصل کرے۔ مگر دربار میں پرتگالی جیسٹس کا اس وقت تک بہت اثر تھا۔ ان کی مخالفت کی وجہ سے ہاکنس کو تجارت کرنے کی اجازت نہ مل سکی۔ ۱۶۱۲ء میں برطانوی کیپٹن بیسٹ نے گجرات صوبے کے سوالی مقام پر پرتگالی فوجوں کو شکست دے دی۔ مغل بادشاہ نے انگریزوں کی بہادری سے خوش ہو کر انھیں سورت، احمد آباد، کمبایا اور گوگا میں تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ پرتگالیوں نے جب گوگا اور کمبایا کے برطانوی اڈوں پر حملہ کیا تو پھر پرتگالیوں کی شکست ہوئی۔ اس طرح انگریز تجارت میں جمے رہے۔
۱۶۱۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ٹامس رو کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ اس کا مقصد مغل بادشاہ سے تجارتی معاہدہ کرنا تھا۔ وہ انگلینڈ کے بادشاہ کا مغل بادشاہ کے نام خط بھی لایا تھا۔ ٹامس رو معاہدہ تو نہ کر سکا مگر مغلیہ حدود میں انگریزوں کو تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس سلسلے میں شاہجہاں نے انگریزوں کے ساتھ فراخ دلی کا رویہ اختیار کیا تھا۔ اب انگریز آگرہ، سورت، بنگال اور بڑوچ کے علاقوں میں تجارت کرنے لگے۔ ٹامس رو بے حد عقلمند سفیر تھا۔ اس نے برطانوی تاجروں کو سیاسی اور مذہبی معاملات میں غیر جانبدار رہنے اور تجارت پر زیادہ سے زیادہ زور دینے کی ہدایت کی۔ اس اصول کو اپنا کر انگریزوں نے تجارت میں زیادہ سے زیادہ فائدے اٹھائے۔

۱۶۲۰ء میں ایک بار پھر پرتگالیوں نے برطانوی جہازوں کو سورت سے ایران جانے میں رکاوٹ پیدا کی۔ لیکن اس بار بھی پرتگالیوں کی ہار ہوئی۔ ۱۶۲۲ء میں ایران کی مدد سے انگریزوں نے پرتگالیوں کے اڈوں پر حملہ کر دیا۔ آخر کار ۱۶۳۰ء میں میدریڈ کے معاہدے کے تحت امن قائم ہوا۔[۱۵]

۱۶۶۱ء میں چارلس دوم کی شادی پرتگالی شہزادی سے ہوئی۔ ۱۶۶۲ء میں پرتگالیوں نے بمبئی کا علاقہ چارلس دوم کو جہیز کے طور پر دیا جو بادشاہ نے ۱۶۶۸ء میں کمپنی کے حوالے

کردیا۔ یہ علاقہ برطانوی تجارت کا ایک اہم اڈا ثابت ہوا۔

تجارت میں اجارہ داری حاصل کرنے کے لیے ایک طرف تو انگریزوں کو پُرتگالیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ دوسری طرف ڈچ تاجروں سے بھی جدّوجہد کرنی پڑی۔ یوُرپ کی جنگوں میں حالاں کہ انگلستان اور ہالینڈ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ شروع میں ہندُستان میں بھی پُرتگالیوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کو تعاون دیا۔ آخرکار تجارت کے میدان میں رقابت نے ایک دوسرے کو جنگ کرنے پر آمادہ کر دیا۔ دراصل ڈچ تاجر گرم مسالے بہت مہنگے بیچتے تھے۔ اس لیے انگریز تاجر براہِ راست ایسٹ انڈیز اور ہندُستان سے گرم مسالوں کی تجارت کے خواہاں تھے۔

انگریز تاجروں نے ایسٹ انڈیز میں مکاسر کے علاقے میں اپنا تجارتی اڈّا بنایا جہاں ڈچ تاجر نہیں تھے۔ وہ وہاں سے گرم مسالے جمع کر کے انگلینڈ بھیجتے تھے۔ ڈچ تاجروں نے انگریزوں کے دو جہاز پکڑ لیے اور انگلستان کے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ برطانوی تاجروں کو یہاں سے واپس بُلا لیں۔ ۱۶۱۹ء میں ٹیکو کے مقام پر انگریزوں اور ڈچوں کا مقابلہ ہوا۔ اس کے بعد لندن معاہدہ ہوا جس میں طے پایا کہ انگریز تاجروں کو اس علاقے میں ⅓ تجارت کرنے کا حق حاصل ہے۔ ۱۶۲۳ء میں ڈچ تاجروں نے انگریزوں کے جہازوں کو پکڑ لیا اور انگریزوں کو ایمبوئنا کے مقام پر قتل کر دیا۔ آخرکار انگریزوں کو ایسٹ انڈیز کے علاقے کو چھوڑنا پڑا۔

۶۴-۱۶۶۳ء میں ڈچ تاجروں نے ہندُستان میں بھی انگریزوں کی تجارت میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سوالی اور فارس کی کھاڑی میں انگریزوں کے تین جہازی بیڑوں کو پکڑ کر برباد کر دیا۔ اس بار پرتگالیوں نے انگریزوں کی مدد کی جس کی وجہ سے ڈچوں کی ہار ہوئی۔ ۱۶۶۵ء میں ڈچوں کو ایمبوئنا کے قتلِ عام کا معاوضہ دینا پڑا۔ اس طرح ڈچ عرصے تک انگریزوں کو پریشان کرتے رہے۔ ۱۷۵۹ء میں بدیرا کے مقام پر ڈچ اور انگریزوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ پُرتگالیوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ۱۷۹۵ء تک برطانوی تاجروں نے ڈچوں

کے تمام ہندُستانی اڈّوں پر قبضہ کر لیا۔

فرانسیسیوں کی آمد

یوُرُپ کے تمام ممالک میں سمندری تجارت کا دور دورا تھا۔ فن وادب سے خاصی شغف رکھنے والا ملک فرانس بھی اس دوڑ میں پیچھے نہ رہ سکا۔ تجارت میں غیر دلچسپی کی وجہ سے فرانس تجارتی مقابلے میں قدرے دیر سے داخل ہوا تھا۔ لوئی چودھویں کے دور میں فرانس کو پورے یوُرُپ میں سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ لوئی مسلسل جنگوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے ملک کے اقتصادی حالات پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اتفاق سے لوئی ہی کے ایک قابل وزیر کولبرٹ نے اس طرف بھی توجہ دی۔ چنانچہ اس نے ۱۶۶۴ء میں فرانس کی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر کے فرانس کے تاجروں کو تجارت کی غرض سے ہندُستان بھیجا۔ ۱۶۶۸ء میں فرانس کی کمپنی نے مغل شہنشاہ سے اجازت حاصل کر کے سورت میں اپنی فیکٹری قائم کی ۔۱۶۶۹ء میں جب جوشیا چائلڈ نے ٹامس رو کی نصیحت کے خلاف ورزی کر کے سیاسی دخل اندازی کی اور بمبئی میں مغل جہازوں کو لوٹا تو اورنگ زیب نے فوج کشی کر کے انگریزوں کو شکست دے دی۔ حالاں کہ اورنگ زیب نے بعد کو انھیں معاف کر کے تجارت کی اجازت دے دی۔ مگر اب انگریز مغل شہنشاہ کی نظر سے گر گئے تھے۔ اس موقع سے فرانسیسی تاجروں نے فائدہ اٹھایا اور اپنی تجارت کو فروغ دیا۔

۱۶۷۳۔۷۴ء میں فرانس کے مارٹن نے دکن میں ایک گانو "ولی کونڈا پورم، خریدا، اس کا نام پانڈی چری رکھا۔ اور اپنا تجارتی اڈّا قائم کرلیا۔ ۱۶۹۰۔۹۲ء میں بنگال کے نواب نے بھی فرانسیسیوں کو چندر نگر فیکٹری قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ ۱۷۰۷ء سے ۱۷۲۰ء تک فرانسیسیوں کو بھی ڈچ تاجروں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کا تجارت پر بُرا اثر پڑا۔ ۱۷۲۰ء میں فرانس کی کمپنی کو دوبارہ منظم کیا گیا۔ ۱۷۲۱ء میں فرانس کے تاجروں نے افریقہ میں ماریشس پر قبضہ کرلیا۔

۱۷۲۵ء میں مالابار کے ماہی علاقہ پر قبضہ کیا اور ۱۷۳۹ء میں کورومنڈل (کاریکال) پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح فرانسیسی تاجر بھی ہندستان کے اہم علاقوں میں اپنے تجارتی اڈے قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ فرانسیسیوں نے بھی انہی علاقوں میں اپنی فیکٹریاں قائم کی تھیں جہاں برطانوی تاجروں کی فیکٹریاں تھیں۔ برطانوی تاجروں کو تجارت کی مونوپلی حاصل کرنے کے لیے پرتگالیوں سے ٹکر لینی پڑی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے دوست ہالینڈ کے ڈچ تاجروں سے بھی جنگیں لڑنی پڑی تھیں۔ ظاہر ہے کہ تجارت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے مونوپلی حاصل کرنا ضروری تھی۔ اس لیے ہندستان میں فرانسیسیوں سے بھی تجارتی کشمکش ناگزیر تھی۔[۵]

انگریز اور فرانسیسیوں کے درمیان تجارتی کشمکش

انگریز اور فرانسیسیوں کے درمیان کرناٹک میں تین جنگیں ہوئیں۔ آخر کار انگریزوں کی فتح ہوئی۔ یورپین قوموں کے درمیان یہ کوئی پہلی اور نئی کشمکش نہیں تھی۔ کئی صدیوں سے اس طرح کی کشمکش جاری تھی۔ لیکن انگریزوں اور فرانسیسیوں کی کشمکش ہندستان کی تاریخ میں کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اوّل تو یہ کہ انگریزوں کے لیے یورپ کی قوموں کے مقابلہ میں یہ آخری کشمکش ثابت ہوئی۔ دوسرے یہ کشمکش طویل عرصے تک چلتی رہی اور سوم اس کشمکش میں ہندستان کے ریاستی حکمرانوں کو بھی شامل کرلیا گیا تھا۔

ہندستان میں یورپ کی قوموں کے درمیان اور خصوصاً انگریز اور فرانسیسیوں کے درمیان کشمکش کا ایک ہی بنیادی سبب تھا اور وہ تھا ہندستان میں تجارت کی اجارہ داری یا مونوپلی حاصل کرنا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مونوپلی حاصل کرنے کے لیے جنگیں لڑنا اور خون بہانا کیوں ضروری ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ سمندری تجارت کافی منہگی اور پُرخطر ثابت ہوئی تھی۔ سمندری راستوں کا خطرناک سفر، حریفوں، اور لٹیروں سے بچنے کے لیے اسلحہ کا استعمال، دیگر ممالک میں اپنی فیکٹریوں کو محفوظ رکھنے کے لیے

قلعہ بندی کرنا۔ یہ سب باتیں سمندری تجارت کا لازمی حصہ تھیں۔ ظاہر ہے اگر ایک ہی علاقے میں کئی یورُپ کی قومیں تجارت کرتیں تو ہندُستان کے لیے تو یہ مفید تھا مگر یورُپ کے ممالک کے لیے خصوصاً اُن تاجروں کے لیے مفید دکارآمد ہرگز نہیں تھا جو اپنی جان ومال کی بازی لگا کر اپنے وطن کو چھوڑ کر آئے تھے۔ اس لیے ہر ملک اپنے طور پر تجارتی اجارہ داری حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں جنگیں لڑنی پڑتی تھیں۔ اس دور کو مورّخین نے "مرچنٹ کیپٹلزم" کے نام سے منسوب کیا ہے[۲۴]۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے انگریز اور پرُتگالیوں کے درمیان پھر انگریز اور ڈچوں کے درمیان اور آخر میں انگریز اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگیں ہوئیں۔ یہ بات غور طلب ہے کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان کرناٹک کی تین جنگوں میں پہلی اور تیسری جنگ یورُپ کی سیاسی صورت حال کے بہانے شروع ہوئی تھیں۔

۱۷۴۴ء میں پرُشیا کے فریڈرک دوم نے آسٹریا کی حکمراں میریا تھریزا کی جانشینی کے خلاف جنگ شروع کی تھی۔ وہ میریا تھریزا کو آسٹریا کا حکمراں ماننے کو تیار نہیں تھا۔ فرانس نے فریڈرک کا ساتھ دیا اور انگلستان نے میریا تھریزا کا ساتھ دیا تھا۔ فرانسیسیوں نے انگریز تاجروں کے سامنے ہندُستان میں امن سے رہنے کی تجویز رکھی تھی۔ مگر انگریز تجارت کے میدان میں فرانسیسیوں کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے جیسے ہی آسٹرین وار آف سکسیشن شروع ہوئی انگریزوں نے فرانسیسیوں کے جہازوں کو ہندُستان کے سمندری کناروں پر لوٹ لیا۔ یہیں سے کرناٹک کی پہلی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس جنگ میں فرانسیسیوں کی جیت ہوئی۔ فرانسیسی گورنر ڈوپلے نے مارشس کے گورنر لابورڈنے سے مدد حاصل کر کے مدراس تک پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۴۸ء میں ایکس لاچیپل کے معاہدے کے تحت ایک دوسرے کے علاقے واپس کر دیے گئے۔

اسی طرح کرناٹک کی تیسری جنگ بھی یورُپ کے تاریخی واقعات کا نتیجہ

تھی۔ اس بار میریا تھریزا نے فریڈرک سے اپنے زرخیز علاقے سائیلیشیا کو حاصل کرنے کے لیے ۱۷۵۶ء میں جنگ چھیڑدی تھی۔ اس نے کوشش کرکے اس بار فرانس کو بھی اپنے ساتھ ملالیا۔ مگر چوں کہ انگلستان اور فرانس پرانے سیاسی حریف تھے۔ اس لیے جب فرانس میریا کی طرف ہوا تو انگلستان نے فریڈرک کا ساتھ دیا۔ اس کا اثر انگریز اور فرانسیسیوں کے ہندستان میں تعلقات پر بھی پڑا۔ اور یہاں بھی جنگ شروع ہوگئی۔ یہ جنگ ۷ سال تک جاری رہی۔ ۱۷۶۰ء میں وانڈی واش کی آخری جنگ میں لالی کی ہار ہوئی۔ ۱۷۶۱ء میں اس کی فوجوں نے اپنے آپ کو انگریزوں کے سپرد کردیا۔ ۱۷۶۳ء میں معاہدۂ پیرس ہوا۔ انگریزوں کو ہندستان کی مونوپلی حاصل ہوگئی اور فرانسیسی ایک تجارتی قوم کی حیثیت سے بالکل ختم ہوگئے۔

کرناٹک کی دوسری جنگ کا آغاز ۱۷۴۸ء میں ناصر جنگ کے قتل سے شروع ہوا۔ یہ بھی ایک ضمنی سبب تھا۔ اس کشمکش میں ہندستان کی سیاست کو دخل تھا۔ مغلیہ حکومت بالکل کمزور ہوچکی تھی۔ متعدد ریاستی حکمرانوں نے خودمختاری کا اعلان کردیا تھا۔ مرکز کی طرف سے کچھ مدد نہیں مل سکتی تھی۔ کرناٹک ریاست حیدرآباد کے ماتحت تھی۔ کرناٹک کے نواب دوست علی کو مراٹھوں نے ہراکر قتل کردیا۔ اس کے جانشین چانداصاحب کو قید کرلیا تھا۔ نظام حیدرآباد نے انوارالدین کو کرناٹک کا نواب بنادیا تھا۔ کرناٹک کی پہلی جنگ میں انوارالدین نے ناسمجھی اور کمزوری کا ثبوت دیا تھا۔ وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کا جھگڑا ختم کرنے کے بجائے انگریزوں کے ساتھ ہوگیا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ فرانسیسیوں نے انوارالدین کی فوج کو بھی شکست دی تھی۔ انوارالدین بھی جنگ میں ماراگیا۔

دوسری کرناٹک کی جنگ (۱۷۴۸ء۔ ۱۷۵۶ء) میں فرانسیسی گورنر نے انگریزوں کے دوست ناصر جنگ کے قتل کے بعد مظفر جنگ سے دوستی کرکے اُسے حیدرآباد کا نظام بنادیا تھا۔ اِدھر مراٹھوں سے بات کرکے چانداصاحب کو رہائی دلادی تھی۔ چانداصاحب کرناٹک کا تخت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح ایک طرف انگریز اور

اور محمد علی تھے اور دوسری طرف فرانسیسی، منظفر جنگ اور چاندا صاحب تھے۔ دوسری جنگ کے پہلے دور میں فرانسیسیوں کی پھر جیت ہوئی۔ اب مدراس کے گورنر نے کلائیو کو نبرد آزمائی کی اجازت دے دی۔ کلائیو کو ارکاٹ کے محاصرے میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور فرانسیسیوں کی ہار ہوئی۔ دوسری جنگ میں اور تیسری جنگ میں انگریزوں کی فتح ہوئی۔

اس طویل کشمکش میں فرانسیسیوں کی زبردست شکست ہوئی اور وہ ایک تجارتی قوم کی حیثیت سے بالکل ختم ہو گئے۔ انگریزوں کی شاندار فتح ہوئی اور انھیں آخر کار پورے ہندستان کی تجارت کی اجارہ داری حاصل ہو گئی۔

انگریزوں کی فتح کی وجوہات

انگریزوں کی فتح کی خاص وجوہات حسب ذیل تھیں۔ سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کی سمندری طاقت فرانسیسیوں کے مقابلے میں بہت برتر تھی۔ ٹی اے مہاہن، الفریڈ لائل اور خیرالدین اتفاق رائے سے کہتے ہیں کہ جس ملک کی سمندری طاقت برتر ہوگی وہی دنیا پر حکومت کرے گا۔

"WHOEVER RULES THE WAVES RULES THE WORLD"

یہ بات اس دور کی یورپ کی جنگوں سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ انگلستان اور ہالینڈ کے تیز طرار جہازوں نے اسپین کے بڑے بھاری مگر سست جہازی بیڑے کو شکست دی تھی۔ یہی بات ہندستان میں انگریز اور فرانسیسیوں کی جنگ میں پیش آئی۔

انگریزوں کی فتح کی ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی ایک نجی کمپنی تھی۔ تجارتی مفاد کی خاطر کمپنی باصلاحیت افسروں کا تقرر کرتی تھی۔ ایسے مقاموں پر اپنی فیکٹریاں قائم کرتی تھی جو تجارتی اعتبار سے بے حد مفید ہوں۔ اقتصادی اعتبار سے اور فوجی اعتبار سے اپنی مضبوطی کرتی تھی تاکہ اپنے حریفوں کا مقابلہ کر سکے۔ مگر فرانسیسی کمپنی سرکاری تھی۔ اگر اس دور میں فرانس کی حکومت مضبوط ہوتی تو ممکن تھا کہ فرانسیسی کمپنی کو کامیابی حاصل ہو جاتی۔ مگر بدقسمتی سے یہ دور فرانس

میں سیاسی خلفشار، اقتصادی بدحالی اور سماجی بے چینی کا دور تھا۔ انقلاب فرانس کے آثار رونما ہو چلے تھے۔ لوئی ۱۶ ویں بے حد کمزور تھا۔ اس لیے فرانس کی حکومت اپنی کمپنی کی حسب مقدور مدد نہ کر سکی۔ اس پر ستم ظریفی یہ تھی کہ ڈوپلے جیسے قابل قدر گورنر کو نہ صرف واپس بلایا بلکہ اسے سزا بھی دی گئی۔ اور یہ قدم فرانسیسی نوآبادیات کے لیے غلط ثابت ہوا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے زیادہ تر افسر بہادر اور باصلاحیت تھے۔ سانڈرس، کلائو، ایری کوٹ وغیرہ بہت عقلمند اور بہادر تھے۔ فرانس کے گوڈ ہیو (CODEHEU) ڈوپلے کی جگہ آئے وہ بہت کمزور اور بزدل تھے۔ تیسری کرناٹک کی جنگ میں فرانس کے کاونٹ ڈی لالی کی کمزوری کی وجہ سے ہار ہوئی۔

آخری وجہ یہ تھی کہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندستانی اڈے بہتر علاقوں میں تھے۔ جس کی وجہ سے کمپنی کی اقتصادی حالت اچھی تھی۔ خصوصاً بنگال انگریزوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا تھا۔ وہ اُسے فتح کر چکے تھے۔

برطانوی تجارت کا ہندستان میں فروغ اور اس کے اثرات

مغل حکمرانوں نے جب یوُرپ کی قوموں کو ہندستان میں تجارت کرنے کی فیاضانہ اجازت دی تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کو بھی بیرونی تجارت سے فائدہ ہوگا۔ شروع میں ایسا ہوا بھی مگر سمندری تجارت کی نوعیت کافی مختلف تھی۔ یوُرپ کی نشاۃ ثانیہ اور ریفارمیشن تحریکوں نے ایک نئے دور کو جنم دیا تھا۔ اس دور میں تجارت کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ تجارت کے نئے نئے اصول مرتب کیے گئے۔ تجارت کے فروغ سے سب سے زیادہ جاگیرداری نظام کو دھکا لگا۔ سماج میں جاگیرداروں کی بجائے بڑے بڑے تاجروں کو فوقیت حاصل ہوگئی۔ اس دور کی خاص بات یہ تھی کہ یوُرپ کے ممالک نے تجارت کی غرض سے ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ اور اس طرح وہاں کی دولت سے تجارت کے ذریعے اپنے اپنے ملکوں

کو مالامال کیا۔ یورپ کی قوموں نے جب ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس دور کی تبدیلیوں سے ہندستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مورخین نے برطانوی تجارت کے فروغ کو تین مخصوص ادوار میں تقسیم کیا ہے[۵]

(۱) تجارتی نظریۂ زر یا تجارتی اجارہ داری کا دور (MERCHANT CAPITALISM)

(۲) صنعتی سرمایہ داری کا دور (INDUSTRIAL CAPITALISM)

(۳) خالص سرمایہ داری کا دور (FINANCE CAPITALISM)

تجارتی اجارہ داری کا دور کافی طویل تھا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کی ہندستان میں آمد سے شروع ہوکر ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری ختم ہونے تک جاری رہا۔ اس دور کے خصوصی اصول یہ تھے کہ اوّل تو تجارت کرنے والے ملک یا قوم کو تجارتی اجارہ داری حاصل ہوسکے۔ تاکہ اس قوم یا ملک کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہوسکے۔ ظاہر ہے اجارہ داری حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ حتیٰ کہ جنگ کا طریقہ بھی جائز سمجھا گیا۔ چنانچہ ابتدا میں یورپ کی قوموں میں آپس میں جنگیں اس وقت تک جاری رہیں تاوقتیکہ انھیں ان کے مخصوص علاقوں میں تجارتی مونوپلی حاصل نہ ہوگئی۔

تجارتی اجارہ داری کے دور کا دوسرا اصول اپنے ملک کی اہم صنعت کی حفاظت کرنا تھا۔ اس کے تحت تجارتی ملک کی سرکار اس طرح کے قوانین بناتی تھی اور ٹیکس لگاتی تھی تاکہ دیگر ملک کی مصنوعات تجارت کرنے والے ملک کی مصنوعات اور پیداوار پر اثر انداز نہ ہوسکیں۔ تیسرے اصول کے تحت ہر حال میں تجارت کرنے والے ملک کو مالی فائدہ ہونا ضروری تھا۔ تاکہ اس ملک کے سونا چاندی کے ذخیروں کو بچایا جاسکے۔ ۱۷۶۷ء میں ایک ایکٹ کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی نے برطانوی خزانے میں ۴ لاکھ پونڈ سالانہ داخل کرنا منظور کیا تھا۔[۶]

اِن اصولوں کے پیشِ نظر برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے تو یورپ کی دیگر قوموں سے برسرِ پیکار ہوکر اجارہ داری حاصل کی۔ برطانوی تاجروں نے ہندستانی حکمرانوں سے پہلے تجارت کی اجازت حاصل کی اور جاگیریں بھی حاصل کیں۔

لیکن درپردہ سیاسی سازشیں کرتے رہے اور حکومت کو جائز ٹیکسوں سے محروم کرتے رہے۔ اپنے ملک کا سونا چاندی بچانے کے لیے انگریز تاجروں نے محض گرم مسالوں کی تجارت اور بیرونی تجارت ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ دیگر اشیا جیسے کپڑا، نیل، چینی افیون، نمک وغیرہ۔ ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک اور ایک ایشیائی ملک سے دوسرے ایشیائی ملک جہاں ضرورت ہوتی تھی اس سامان کی تجارت کی۔[۵] اس طرح ۱۷۵۷ء تک برطانوی تاجر نہ صرف ہندستان کی تجارت کے مالک بن گئے۔ بلکہ بنگال کی فتح کے بعد انھیں ایک ریاستی حکمراں کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ دھیرے دھیرے ملک کے اقتصادی حالات خراب ہونا شروع ہو گئے۔ برطانوی تاجر ہندستان کے کسانوں اور صنعت کاروں پر جبر و تشدد سے کام لینے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان کی زراعت اور گھریلو صنعت برباد اور انگلستان دولت مند ہوتا رہا۔ بقول بی۔ کے۔ گپتا،

> "PRIOR TO 1757, INDIA WAS THE SINK WHERE FOREIGN BULLION DISAPPEARED, AFTER 1757, INDIA BECAME A MINE FROM WHERE HUGE WEALTH WAS DRAINED WITHOUT ANY RETURN". [۶]

ا۔ صنعتی سرمایہ داری کا دور

ہندستان کی تجارت سے انگریزوں نے جو سرمایہ حاصل کیا وہ انگلستان کے صنعتی فروغ میں لگایا گیا۔ انگلستان کے صنعتی انقلاب کے بعد نئی نئی مصنوعات کی افراط سے ان کی کھپت کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ ایک مستقل مارکیٹ کی ضرورت ہو گئی۔ چنانچہ تجارت میں بھی ایک نیا موڑ شروع ہوا۔ ابتدا میں ہندستان کی مصنوعات اور پیداوار برطانوی تاجروں کی کمپنی انگلستان اور دیگر ممالک میں درآمد کرتی تھی۔ جیسے گرم مسالے ڈھاکہ کی ململ اور دیگر اشیا۔ صنعتی انقلاب کے بعد گرم مسالوں کو چھوڑ کر تمام مصنوعات انگلستان کی مشینیں بنانے لگیں اور ہندستان آنے لگیں۔ صنعتوں

کی اور صنعت کاروں کی تعداد اتنی بڑھی کہ انھوں نے حکومت سے کمپنی کی تجارت کی اجارہ داری ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تجارت کرنے کی اجازت چاہی۔ اس زمانے میں ایڈم اسمتھ کی کتاب 'ویلتھ آف نیشنس'، اور بنیتھم کے معاشی نظریات بہت مشہور ہو رہے تھے جو انفرادی آزادی اور انفرادی تجارت پر زور دیتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستان کی تجارت سے صرف چند کمپنی کے لوگوں کو نجی طور پر فائدہ ہو رہا ہے اور ملک کو اس تجارت سے فائدہ نہیں ہو رہا۔ وہ تجارت سے نجی طور پر فائدہ اٹھا کر اتنے مالدار ہو جاتے ہیں کہ انگلینڈ آکر ہندستان کے نوابوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں اور جاگیریں خرید کر پارلیمنٹ کے بھی ممبر بن جاتے ہیں۔

یہ حقیقت تھی کہ کمپنی کے ملازمین نے اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر تجارتی مواقع اور ناجائز طریقوں سے ہندستانی سرداروں اور جاگیرداروں سے جبرًا رشوتیں اور تحائف وصول کرکے بے اندازہ دولت جمع کرلی تھی۔ کلائو جب انگلستان واپس لوٹا تو اس کی دولت واملاک کی مجموعی سالانہ آمدنی ۴۰ ہزار پونڈ تھی۔[۹]

کمپنی کا کہنا تھا کہ تجارت کی وجہ سے انگلستان کی سمندری طاقت اور صنعت کو بے حد فروغ حاصل ہوا ہے۔ آخرکار برطانیہ نے ۱۸۱۳ء کے چارٹر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ ظاہر ہے اس سے انگلستان کو بہت فائدہ ہوا۔ لیکن ہندستان کی رہی سہی صنعت بالکل برباد ہو گئی۔ ہندستان محض کچّا مال فراہم کرنے کی مشین بن کر رہ گیا جو جبرًا بہت سستے داموں پر خریدا جاتا تھا۔ اسی کچّے مال کو انگلستان کی مشینیں مصنوعات میں بدل دیتی تھیں۔ یہی مال لوٹ کر ہندستان کی مارکٹ میں آجاتا تھا۔ جس کو ہندستانی خریدنے کے لیے مجبور تھے کیوں کہ اوّل تو وہ مصنوعات ہندستان میں ہوتی نہیں تھیں اور اگر کچھ ہندستانی صنعتیں رہ بھی گئی تھیں تو اُن کا مال انگلستان کی مصنوعات کے مقابلے میں بہت مہنگا اور خراب ہوتا تھا۔

۳۔ خالص سرمایہ داری کا دور

ایڈم اسمتھ اور بینتھم نے تجارت میں انفرادی آزادی پر زور دیا تھا۔ اس زمانے میں پورے یورپ میں خصوصاً فرانس اور انگلستان میں سیاسی اور سماجی میدان میں بھی انفرادی آزادی پر بہت زور تھا۔ فرانس میں روسو اور والٹیئر کے خیالات بہت مقبول تھے اور نوآبادیات کو بیکار کا بوجھ سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کے رد میں نئے ریڈیکل نظریات کے حامیوں کے ایک گروہ نے ایک نئے نظریے کو پیش کیا اسے فائنانس کیپٹلزم کا نظریہ یا خالص سرمایہ داری کا نظریہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے تحت نوآبادیات ہی کے اندر زیادہ سے زیادہ پیسا کھپاکر زیادہ سے زیادہ پیداوار کی جاسکتی تھی۔ اس سے ہندستان کے لوگوں کی آمدنی بڑھنے اور انگلستان کو حسب ضرورت کچا مال ملنے کا امکان تھا۔ حالاں کہ زیادہ بھلا انگلستان ہی کا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ دور ڈلہوزی کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ کیوں کہ اسی کے دور میں ریلوے لائن بچھائی گئی تاکہ کچا مال ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاسکے اسی زمانے میں نہریں کھدوائی گئیں سڑکیں بنائی گئیں ٹیلی گرام اور ٹیلی فون کا استعمال شروع ہوا۔ اسی طرح آمد و رفت کے وسائل میں زبردست تبدیلی آئی۔ اسی دور میں ہندستان میں صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ سوتی کپڑے کا پہلا کارخانہ ۱۸۵۳ء میں کاوس جی نانا بھائی نے بمبئی میں قائم کیا۔ اور جوٹ کا پہلا کارخانہ بنگال میں ۱۸۵۵ء میں قائم ہوا۔ ۱۸۷۹ء تک سوتی کارخانوں کی تعداد ۵۶ ہوگئی تھی اور جوٹ کے کارخانوں کی تعداد ۱۸۸۲ء تک بیس ہوگئی۔ ۱۹۰۵ء میں سوتی کپڑوں کے کارخانوں کی تعداد دو سو چھے اور جوٹ ملوں کی ۱۹۰۱ء میں تعداد چھتیس ہو گئی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل تک جن دوسری مشینی صنعتوں کا ظہور ہوا وہ یہ ہیں، روئی اونٹنے اور گانٹھ بنانے کے کارخانے چاول، آٹے اور شہتیروں کی ملیں۔ چمڑے، اونی کپڑے، کاغذ اور شکر کی ملیں، لوہے اور فولاد کے کارخانے اور نمک، ابرق اور شورہ وغیرہ جیسے معدنیات کے کارخانے ۱۹۳۰ء کے بعد کی دہائی میں سیمینٹ، کاغذ، دیا سلائی، شکر اور شیشے کی صنعتوں نے بھی

ترقی کی۔

لیکن بیشتر کارخانوں میں یا تو برطانوی سرمایہ لگا تھا یا ان پر برطانوی بالادستی تھی۔ صرف سوتی کپڑے کی صنعت پر ابتدا ہی سے ہندستانی غالب تھا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد ہندستانیوں نے شکر سازی کی صنعت بھی شروع کی۔ ہندستانی سرمایہ داروں کو شروع ہی سے برطانوی مینیجنگ ایجنسیوں اور برطانوی بینکوں کے تسلّط کے خلاف جدّوجہد کرنی پڑتی تھی۔

انیسویں صدی میں مشینی صنعتوں کے علاوہ نیل، چائے، اور کافی کی باغبانی کی صنعت نے بھی ترقی کی۔ لیکن یہ کاروبار قطعی طور پر اہلِ یورپ کی ملکیت تھا۔ برطانوی صنعت کار ہندستانی سوتی کپڑے کی صنعت کو اور دوسری صنعتوں کو بھی اپنا حریف سمجھتے تھے۔ ہندستانی صنعتوں کی ترقی میں مختلف طرح سے روڑے اٹکائے جاتے تھے۔ انھیں نہ تو مراعات حاصل تھیں اور نہ ہی ٹیکسوں میں کمی کی گئی تھی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد حکومتِ ہند نے ہندستانی صنعتوں کو ٹیرف تحفظ عطا کیا۔[۱۸]

دولت کا بہاو (DRAIN OF WEALTH)

برطانوی حکومت کی تجارتی پالیسی کا خواہ وہ کوئی بھی دور رہا ہو آخری انجام یہی تھا کہ ہندستان کی دولت انگلستان جارہی تھی۔ معاشی بہاو انگلستان کی حکومت کی ایک عجیب وغریب پالیسی تھی۔ جس کو اس سے پہلے کسی حکمراں نے جائز نہیں سمجھا تھا۔ ہندستان کی بدترین سے بدترین سابقہ حکومتوں نے ہندستان سے جو محاصل وصول کیے وہ اندرونِ ملک ہی صرف کیے۔ اس دولت سے یا تو وہ آبپاشی کے لیے نہریں، آمدورفت کے لیے سڑکیں بنواتے تھے یا پھر ہندستان ہی کے اندر محلات، مندر یا مسجد تعمیر کراتے تھے۔ لیکن برطانوی حکومت نے مختلف طریقوں سے اور مختلف ادوار میں ہندستان کی دولت حاصل کی اور انگلستان لے گئے۔ پہلے کمپنی نے اجارہ داری کے ذریعے، پھر انگلستان نے آزاد تجارت شروع کرکے پھر سرمایہ لگاکر اور بعد میں صنعتیں قائم کرکے۔ برطانوی ملازمین نے نجی طور پر تنخواہوں، تحفوں اور رشوتوں کی شکل میں دولت کمائی اور انگلستان واپس چلے گئے۔[۱۹]

۱؎ ڈاکٹر تاراچند، ہسٹری آف دی فریڈم موومینٹ اِن انڈیا جلد اوّل، ص ص۔ ۲۴،۲۳
۱۹۴، ۹۹۹
ملاحظہ کیجیے۔ پی۔ ای۔ رابرٹ۔ ہسٹری آف انڈیا، ص۔ ۱۴
۲؎ کے۔ این۔ چودھری۔ دی انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی۔ ص۔ ۱۰۔ ۱۲
۳؎ آلفریڈ لائل۔ رائز اینڈ ایکسپینشن آف دی برٹش ڈومینین اِن انڈیا۔
ص ص۔ ۳۳۔ ۵۵
ملاحظہ کیجیے، ایس۔ بی۔ سین، دی فرنچ اِن انڈیا
۴؎ رجنی پام دت۔ انڈیا ٹوڈے، ص ص، ۷۹۔ ۹۹
ملاحظہ کیجیے۔ لائل، مذکورہ بالا، ایضاً
۵؎ ایضاً
۶؎ دَت، مذکورہ بالا۔ ص ص۔ ۷۹۔ ۹۳
۷؎ چودھری، مذکورہ بالا اور بپن چندر، جدید ہندستان
۸؎ بی۔ کے۔ گپتا۔ سراج الدولہ اینڈ دی ایسٹ انڈیا کمپنی
۹؎ دت، مذکورہ بالا
۱۰؎ ایضاً، ص ص، ۱۹۷۔ ۲۰۱
۱۱؎ بپن چندر، مذکورہ بالا

باب ۔ ۴

ایسٹ انڈیا کمپنی کا بنگال پر سیاسی تسلّط

بنگال میں برطانوی تجارت

۱۷۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت بنگال میں قائم ہوئی۔ اور ۱۸ویں صدی کے شروع میں انگریز پورے ہندستان کے مالک بن گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزوں کا ہندستان میں حکومت قائم کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ مقصد محض تجارت کرنا تھا۔ ۱۶۱۶ء میں ٹامس رو کے زمانے سے ۱۸۱۳ء میں تجارتی مونوپلی ختم کرنے تک کمپنی ہمیشہ اپنے تجارتی مقاصد کو ترجیح دیتی رہی۔ ۱۷۸۴ء میں پِٹس انڈیا ایکٹ پاس ہونے تک انگلستان کی حکومت نے کمپنی کے معاملات میں کم سے کم دخل اندازی کی تھی۔ جوشیا چائلڈ اور جان چائلڈ نے جب اورنگ زیب کے دور میں ہندستان کے کسی حصّے میں انگریزوں کا سیاسی تسلّط قائم کرنے کی کوشش کی تو مغلیہ فوجوں نے اُن کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ کمپنی کی پالیسی کا بغور مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ کمپنی نے حکومت قائم کرنے اور ملک کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی کرنے سے حتی الامکان گریز کیا۔ اور جن انگریز افسروں نے اس طرح کا کوئی ارادہ کیا یا پیش قدمی کی تو کمپنی نے ان کے خلاف سخت قدم اٹھایا۔ مثلاً لارڈ ولزلی نے جب کمپنی کی پالیسی کے خلاف توسیع سلطنت کی پالیسی اپنائی تو کمپنی نے اسے واپس بلا کر لارڈ

کارنوالس کو دوبارہ گورنر جنرل مقرر کر کے بھیجا کیوں کہ لارڈ کارنوالس نے اپنے پہلے دور میں کمپنی کی غیر جانبداری کی پالیسی کے مطابق ہی کام کیے۔

لیکن پھر بھی کمپنی کے ذریعے ہی ہندستان میں برطانوی حکومت کا قیام ہوا۔ یہ بات جاننے کے لیے اگر ہم اسباب پر غور کریں تو اس سوال کا جواب مل سکتا ہے۔ اوّل سمندری تجارت کی نوعیت، دوم ہندستانی حکمرانوں کا زوال۔

سمندری تجارت میں مونوپلی حاصل کرنے کی جستجو نے یورپ کی تجارتی کمپنیوں کو فوجی کیمپ میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہالینڈ اور انگلینڈ کی سمندری طاقت یورپ کے دیگر ممالک کے مقابلے میں برتر تھی۔ لہذا ایسٹ انڈیز میں ہالینڈ کے تاجروں نے آخر کار اپنا سیاسی تسلط قائم کیا۔ ہندستانی حکمراں ۱۸ ویں صدی کے نصف اوّل میں بہت کمزور ہو چکے تھے۔ اس لیے انگریزوں کو ہندستان میں اپنا سیاسی تسلط قائم کرنا آسان ہو گیا۔

۱۷۵۶ء میں بنگال میں نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے درمیان کشمکش شروع ہوئی۔ دراصل بنگال انگریز تاجروں کی سب سے مفید تجارتی بستی تھی۔ ۱۶۰۰ء سے ۱۷۵۷ء تک انگریز بنگال کی تجارت پر اس طرح چھا چکے تھے کہ وہ اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتے تھے۔

۱۶۵۱ء میں شاہجہاں کے زمانے سے انگریز بنگال میں تجارت کرنے کے عوض بنگال کے گورنر شاہ شجاع کو ۳۰۰۰ روپے سالانہ ٹیکس ادا کرتے تھے۔ ۱۶۸۰ء میں اورنگ زیب نے ایک فرمان کے ذریعہ ½ ۳ فیصد ٹیکس مقرر کیا تھا۔ ۱۶۹۸ء میں انگریزوں نے بنگال ہی میں ایک زمیندار شوبھا سنگھ سے تین گانو خریدے تھے۔ یہ گانو گووند پوری، کالی کتہ اور سوتانٹی کُل ۱۲۰۰ روپے میں خریدے تھے۔ ۱۷۰۰ء میں انگریزوں نے بنگال میں فورٹ ولیم پریسی ڈینسی قائم کر دی۔ ۱۷۱۶ء میں ایک انگریز مسٹر جین ہیملٹن نے شہنشاہ فرخ سیر کی ایک خطرناک بیماری کا علاج کیا جس سے خوش ہو کر اس نے نہ صرف اورنگ زیب کے فرمان کو تسلیم

کیا بلکہ دیگر مراعات بھی عطا کیں جو حسب ذیل تھیں۔

۱۔ بنگال میں انگریزوں پر ۳۰۰۰ روپے سالانہ خراج مقرر کر کے باقی ٹیکسوں سے معاف کر دیا گیا۔

۲۔ سورت میں انگریزوں پر ۱۰۰۰۰ روپے خراج مقرر کر کے باقی ٹیکسوں سے معاف کر دیا گیا۔

۳۔ مدراس میں پہلے کی طرح ٹیکس دیتے رہے۔

۴۔ حیدرآباد میں انگریزوں کو ۳۸ گانو کی جاگیر عطا کی گئی۔

۵۔ انگریزوں کو بمبئی میں ٹکسال قائم کرنے کی اجازت دی اور ان کے سکے مغلیہ حدود میں رائج کیے۔

اس فرمان کے بعد انگریزوں کی تجارت بنگال میں خوب پھلی پھولی۔

بنگال کے گورنر مرشد جعفر قلی خاں نے اورنگ زیب کے انتقال کے بعد انگریزوں سے ۳۰۰۰۰ روپے سالانہ محصول طلب کیا تھا۔ اور آخر میں انگریز ۲۵۰۰۰ روپے سالانہ محصول دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ فرخ سیر کے ۱۷۱۷ء کے فرمان کو بھی مرشد قلی خاں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن مرشد قلی خاں کے ۱۷۲۷ء میں انتقال کے بعد انگریز پھر من مانی کرنے لگے تھے۔ ان حقائق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو بنگال سے کس قدر اقتصادی فائدہ تھا اور وہ اپنی من مانی کر کے بنگال کو اس کی جائز آمدنی سے محروم کر رہے تھے۔ ۱۷۴۰ء میں جب علی وردی خان نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تب بھی وہ اپنی من مانی کرتے رہے۔ علی وردی خاں بہت تجربہ کار اور بہادر نواب تھا۔ صوبے میں اس کے زمانے میں خوشحالی تھی۔ اور عوام اس سے بے حد خوش تھے۔ اس نے صوبے کو مراٹھوں کے خطرے سے بچایا تھا اور جگت سیٹھ نے اس کے سامنے اپنے خزانے کھول دیے تھے جن کے استعمال سے وہ صوبے کو خطروں سے بچا سکتا تھا۔ لیکن علی وردی نے جان بوجھ کر انگریزوں کی من مانی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک تجارت پیشہ قوم کو دبانا اس کے شایانِ شان نہیں ہے[۲]

نواب سراجُ الدّولہ اور انگریز

۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں کے انتقال کے بعد جب سراجُ الدّولہ نواب بنا تو انگریزوں کو بنگال میں تجارت کی پوری آزادی ملی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ ہندُستانی تاجر انگریزوں سے دستک حاصل کر کے تجارت کرتے تھے۔ علاوہ ازیں انگریز جن گانوٗ کے زمیندار تھے اس کی پوری آمدنی اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور بنگال سرکار کو اس میں سے کچھ نہیں دیتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ اِن گانوٗ کے پوری طرح مالک ہیں۔ سراجُ الدّولہ نے جب میزان لگوایا تو پتا چلا کہ انگریزوں نے ۱۷۱۷ء سے ۱۷۵۶ء تک بنگال سرکار کو اٹھارہ لاکھ پچھتّر ہزار (۱۸،۷۵،۰۰۰) پونڈ کی آمدنی سے محروم کیا تھا۔ چنانچہ سراجُ الدّولہ نے انگریزوں کے دستک جاری کرنے پر پابندی لگائی۔

انگریزوں نے نواب کی اجازت کے بغیر اپنی فیکٹریوں کی قلعہ بندیاں کرائی تھیں۔ اس پر بھی سراجُ الدّولہ نے پابندی لگائی۔ سراجُ الدّولہ کی تخت نشینی کے وقت حسبِ دستور انگریز افسروں نے دربار میں حاضری نہیں دی۔ بلکہ وہ سراجُ الدّولہ کے مخالفین شوکت جنگ اور گھسیٹی بیگم سے سازشوں میں مصروف رہے تاکہ ان میں سے کسی کو سراجُ الدّولہ کی بجائے نواب بنایا جائے۔

اسی زمانے میں نواب کی ایک اسامی رام کرشن نے ۵۳ لاکھ روپے کا غبن کیا۔ انگریزوں نے اُسے پناہ دی۔ اور جب نواب نے خواجہ واجد کو انگریزوں سے اِن معاملات پر گفتگو کرنے بھیجا تو اس کی بے حد توہین کی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ انگریزوں کو نواب کے احکامات کی کوئی پروا نہیں تھی، اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ سراجُ الدّولہ ان کی تجارتی اجارہ داری کے راستے میں رکاوٹ پیدا کر رہا ہے۔ اس لیے وہ سراجُ الدولہ کو ہٹا کر کسی دوسرے شخص کو نواب بنانا چاہتے تھے۔ سراجُ الدولہ نے انگریزوں کی قاسم بازار کی فیکٹری پر قبضہ کر لیا۔ انچارج واٹس نے بے چوں وچرا تعمیل کی۔ اس کے بعد نواب نے فورٹ ولیم فیکٹری پر حملہ کیا۔ وہاں کے انچارج ڈریک نے مقابلہ کیا، مگر اسے شکست ہوئی۔ انگریز وہاں سے نکل کر

بھاگ گئے۔ اور کچھ انگریزوں کو گرفتار کر کے ایک کوٹھری میں قید کر دیا گیا۔

کالی کوٹھری کی حقیقت

جس کوٹھری میں انگریزوں کو قید کیا گیا اس قصے کو ہال ویل نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا تاکہ انگریز مشتعل ہو جائیں یہ قصہ تاریخ میں کالی کوٹھری کے نام سے مشہور ہے۔ بقول بی۔ کے۔ گپتا ہال ویل نے، جو اُن قیدیوں میں شامل تھا، ایک معمولی سے واقعہ کو مبالغہ آرائی سے پیش کیا تھا۔ ہال ویل کے بیان کے مطابق کوٹھری کا رقبہ صرف ۸' × ۱۴' تھا۔ اس میں نہ کھڑکیاں تھیں نہ روشن دان۔ ۱۴۶ انگریز مرد، عورتوں اور بچّوں کو بند کر دیا گیا تھا۔ جون کی گرمی تھی۔ دم گھٹ رہا تھا۔ جان بچانے کے لیے ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ پیاس میں کئی نے اپنا پیشاب تک پی لیا تھا۔ اس حالت میں ۱۲۳ جانیں گئیں اور صرف ۲۳ آدمی بچے۔

اوّل تو ہال ویل کے بیانات ہی میں تضاد ہے۔ پہلے بیان کے مطابق انگریز قیدیوں کی تعداد ۱۶۵ یا ۱۷۰ تھی۔ اپنے دوسرے بیان میں ہال ویل نے قیدیوں کی تعداد ۱۴۶ بتائی ہے۔ مورخین مِلس، وِلسن، اور ڈوڈویل اس بیان کی تائید کرتے ہیں۔ مگر مورّخ لِٹّل اس بیان سے متّفق نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قیدیوں میں عورتیں اور بچّے شامل نہیں تھے۔ ہال ویل کا یہ بیان کہ مسز کیرے قیدیوں میں شامل تھیں غلط ثابت ہو گیا ہے۔ جادو ناتھ سرکار کے بیان کے مطابق قیدیوں کی کُل تعداد ۶۰ تھی۔ بی۔ کے۔ گپتا نے اس واقعہ کی کافی چھان بین کی ہے اور آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مورّخ اورم (ORME) کی فراہم کی ہوئی اطلاعات کے مطابق انگریز قیدیوں کی کُل تعداد ۶۵ تھی اور ڈریک کی فراہم کی ہوئی اطلاعات کے مطابق انگریز قیدیوں کی تعداد ۴۰ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ کہانی تو ہال ویل نے انگلستان کے سمندری سفر کے دوران قلم بند کی تھی۔ اس لیے اس کہانی کا بنگال کے فوری معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑا[۲]۔

پلاسی کی جنگ اور نتائج

بہرحال اس واقعہ کی تو نہیں مگر بنگال میں انگریزوں کی شکست کی خبر مدراس پہنچی۔ کرناٹک کی دوسری جنگ میں انگریزوں کی فتح ہو چکی تھی۔ اس فتح میں ایک معمولی سپاہی کلائو نے اپنا کمال دکھایا تھا ارکاٹ کے محاصرے نے اسے صفِ اوّل کا سیاست داں بنادیا تھا۔ مدراس کا گورنر اس کی کارکردگی سے بے حد خوش تھا۔ لہٰذا اس نے کلائو کو بنگال کی مہم پر تعینات کیا۔ مدد کے لیے واٹسن کو سمندری بیڑے کا انچارج مقرر کیا گیا۔

پہلے اس نے ایک خط میں نواب کو لکھا کہ انگریزوں کی تمام فیکٹریاں واپس کی جائیں اور جو نقصان ہوا ہے اس کا ہرجانہ طلب کیا۔ ساتھ ہی یہ دھمکی دی کہ انکار کی صورت میں نواب کو ایک ایسی فوج کا مقابلہ کرنا ہوگا جو اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی ہوگی۔

ملک کے حالات کے پیشِ نظر سراجُ الدّولہ نے آخرکار ۹ر فروری ۱۷۵۷ء کو کلائو سے معاہدہ کر لیا۔ اور انگریزوں کی فیکٹریاں واپس کرنا اور ہرجانہ دینا منظور کر لیا تھا۔ مگر کلائو کا مقصد سراجُ الدّولہ کو کسی نہ کسی بہانے تخت سے اتارنا تھا۔ چنانچہ اس نے میر جعفر سے سازش کی۔ چشم دید گواہ مانک چند کو بیوقوف بنانے کے لیے ایک جالی دستاویز تیار کیا جس میں اسے بنگال کی دولت کا کافی حصہ رشوت کے طور پر دینے کا وعدہ تھا تاکہ وہ اس سازش کے راز کو فاش نہ کرے۔ اس کے بعد نواب سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے لیے فرانسیسیوں کی فیکٹریوں پر قبضہ کرنے کا بہانا تراشا۔

نواب سراجُ الدّولہ نے نند کمار کو تاکید کی کہ اگر انگریز فرانسیسی فیکٹری پر حملہ کریں تو اُن کی حفاظت کی جائے۔ لیکن نند کمار نے انگریزوں سے رشوت لے کر فرانسیسی فیکٹری چندر نگر پر انگریزوں کا قبضہ کرا دیا۔ فرانسیسیوں نے نواب کے پاس جا کر پناہ لی۔ کلائو نے نواب سے فرانسیسیوں کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن

نواب نے انکار کر دیا۔

انکار کی شکل میں نواب اور کلائو کے درمیان جنگ ناگزیر ہو گئی۔ ۲۳/ جون ۱۷۵۷ء کو یہ جنگ پلاسی کے میدان میں ہوئی۔ نواب کی فوجوں کا سربراہ میر جعفر تھا۔ جو پہلے ہی انگریزوں سے جا ملا تھا۔ نواب سراج الدولہ کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا لیکن میر جعفر ہی کے بیٹے میران نے سراج الدولہ کا قتل کر دیا۔ کلائو نے میر جعفر کو نواب مقرر کیا۔ میر جعفر نے (۱۷۵۷ء۔ ۱۷۶۰ء) حسب ذیل شرائط منظور کیں۔

۱۔ کلائو کو ذاتی جاگیر کے طور پر ۲۴ پرگنے دیے گئے۔

۲۔ میر جعفر نے منظور کیا کہ انگریزوں کے دشمن نواب کے دشمن ہوں گے۔

۳۔ انگریزوں کی فوج قائم کی جائے گی خرچ نواب دے گا۔

۴۔ نواب کو ایک کروڑ ستتر لاکھ (۱۷۷,۰۰,۰۰۰) تاوان جنگ ادا کرنا ہوگا۔[۴]

نواب میر جعفر اور انگریز

اس فتح کے بعد انگریزوں نے بنگال میں اپنی براہ راست حکومت تو قائم نہیں کی۔ لیکن اپنی مرضی کا نواب بنگال کے تخت پر بٹھا کر عملاً بنگال کے مالک ہو چکے تھے۔ بہت جلد میر جعفر کو انگریزوں کی ماتحتی میں اپنی لاچاری، اور کمزوری کا احساس ہو گیا۔ میر جعفر کو ایک طرف تو انگریزوں کا قرضہ چکانا تھا اور دوسری طرف اس کے نائب دیوان رام نرائن اور رائے دُرلبھ انتظام حکومت میں من مانی کر رہے تھے۔ دراصل وہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ آخرکار میر جعفر نے ڈچ تاجروں سے مدد حاصل کر کے انگریزوں کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن انگریزوں نے اسے ناکام بنا دیا۔

۱۷۶۰ء میں میر جعفر کے بیٹے میران کا انتقال ہو گیا۔ قائم مقام گورنر ہال ویل میر جعفر کے بعد بنگال کی حکومت براہِ راست اپنے ہاتھ میں لینے کے حق میں تھا۔ میر قاسم جو میر جعفر کے عزیزوں میں تھا اس نے رشوت دے کر نئے گورنر ونیسی ٹارٹ کو اپنی جانشینی کے حق میں تیار کر لیا۔

میر جعفر نے میر قاسم کو اپنا جانشین تسلیم کرنے سے انکار کیا تو وینسی ٹارٹ نے میر جعفر کو تخت سے اُتار کر میر قاسم کو نواب بنا دیا۔

نواب میر قاسم اور بکسر کی جنگ

نواب میر قاسم (۱۷۶۰ء ۔ ۱۷۶۴ء) انگریزوں سے معاہدہ کیا اور تمام قرضے ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ اس نے بنگال کے علاقے جہاں بدامنی رہتی تھی جیسے مدنا پور، چٹا گونگ، اور بُردوان انگریزوں کو دے کر قرضہ چکا دیا۔ انگریزوں کے ہم نوا رام نرائن کو معطّل کیا۔ انگریزوں سے ایک فاصلہ رکھنے کے لیے مرشد آباد چھوڑ کر منگیر کو اپنی راجدھانی بنایا۔ یہاں رہ کر اس نے انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہتھیاروں کی فیکٹریاں قائم کیں۔ انگریزوں کو اپنی فوج سے نکالا۔ اس نے گورنر وینسی ٹارٹ کی شکایتوں کی بھی پروا نہیں کی۔ میر جعفر کے زمانے میں انگریزوں کو نمک اور پان کی تجارت بھی دے دی تھی۔ میر قاسم نے کمپنی کے یہ حقوق بھی رد کر دیے۔ انگریز بغیر ٹیکس دیے تجارت کرتے تھے لیکن ہندُستانی تاجروں کو انگریزوں سے دستک حاصل کرنی پڑتی تھی۔ میر قاسم نے ہندُستانی تاجروں کو بھی بغیر دستک اور بغیر ٹیکس ادا کیے تجارت کی اجازت دے دی۔

نواب بنگال کا یہ رویہ دیکھ کر وینسی ٹارٹ نے منگیر پر فوج کشی کر دی۔ میر قاسم نے اودھ کے نواب وزیر شجاع الدّولہ اور شہنشاہ شاہ عالم سے مدد مانگی۔

بکسر کے میدان میں ۲۲ راکتوبر ۱۷۶۴ء کو ان تینوں حکمرانوں کی متحد فوجوں کا مقابلہ انگریزوں کی فوج سے ہوا۔ کمانڈر منرو نے ان تینوں کی متحد فوج کو شکست دے دی۔ میر قاسم جنگ کے میدان سے ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کا کہیں پتا نہیں چلا۔ ان حالات کے پیشِ نظر کمپنی نے کلائو کو ۱۷۶۵ء میں دوبارہ گورنر بنا کر بھیجا۔

۱۷۶۵ء میں کلائو اور شاہ عالم کے درمیان معاہدۂ الہ آباد ہوا۔ اس معاہدے کی حسب ذیل شرطیں تھیں۔

۱۔ انگریزوں کو قانونی طور پر بنگال، بہار، اور اڑیسہ کی دیوانی دے دی
۲۔ انگریزوں نے شاہ عالم کو ۵۲ لاکھ روپے سالانہ خراج دینا منظور کیا۔
۳۔ شاہ عالم کو الٰہ آباد اور کڑہ کا علاقہ بھی دیا۔
۴۔ انگریزوں نے شاہ عالم کو مغل شہنشاہ تسلیم کیا مگر دہلی کے تخت پر قبضہ دلانے کی مدد کی درخواست کو انگریزوں نے نامنظور کر دیا۔

۱۷۷۳ء میں معاہدۂ بنارس کے تحت شجاع الدّولہ کو حسب ذیل شرطیں ماننی پڑیں۔

۱۔ شجاعُ الدّولہ نے ۳۰ لاکھ روپے تاوان جنگ ادا کرنا منظور کیا۔
۲۔ شجاعُ الدّولہ کو اپنے صوبے میں انگریزی فوجیں رکھنے اور تربیّت پر خرچ کی ذمہ داری لینی پڑی۔
۳۔ انگریزوں کے دشمن نواب شجاعُ الدّولہ کے دشمن اور انگریزوں کے دوست نواب، شجاعُ الدّولہ کے دوست مانے گئے۔

کلائیو نے میر جعفر کو دوبارہ نواب بنا دیا۔[5]

---

[1] آلفریڈ لائل، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۲۳۔ ۵۵
[2] بی۔ کے۔ گپتا، سراج الدولہ اینڈ دی ایسٹ انڈیا کمپنی
[3] ایضاً اور بار بر، دی بلیک ہول
مزید ملاحظہ کیجیے۔ ایس۔ بی۔ سین، دی فرینچ اِن انڈیا
[4] گپتا، مذکورہ بالا
[5] ایضاً، اور ملاحظہ کیجیے۔ ڈوڈویل، شورٹر کیمبرج ہسٹری

باب ۔ ۵

ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندستان پر سیاسی تسلّط

کلائو کی بنگال کی فتح کے بعد اس کے جانشین، وارن ہیسٹنگز، لارڈ کارنوالس اور جان شور مسلسل بنگال کی حکومت کے استحکام میں مصروف رہے۔ انھوں نے کمپنی کی ہدایت کے مطابق توسیعِ سلطنت سے گریز کیا۔ اس دور میں وارن ہیسٹنگز نے بنارس کے راجا چیت سنگھ کو تخت سے اتار کر اسی کے خاندان کے ایک دوسرے شخص کو راجا بنایا۔ چیت سنگھ سے جھگڑے کی وجہ خراج میں اضافہ تھی۔ روہیل کھنڈ کی جنگ میں اپنے دوست اودھ کے نواب کی مدد کی، اور بیگمات سے ان کی دولت نواب کو دلوائی۔ نواب پر انگریزوں کا قرض تھا۔ بمبئی پریسی ڈینسی نے سالسیٹ اور بسین کا علاقہ حاصل کرنا چاہا۔ تو مراٹھوں سے پہلی جنگ ہوئی۔ آخر کار وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲ء۔ ۱۷۸۵ء) کی حکمتِ علی سے ۱۷۸۲ء میں سالبائی کے معاہدے کے تحت مراٹھوں سے تقریباً ۲۰ سال کے لیے امن قائم ہوگیا۔

مدراس پریسی ڈینسی کی آزادانہ کارروائی کے باعث انگریزوں کو میسور کے حکمراں حیدر علی اور بعد کو ٹیپو سلطان سے دو جنگیں لڑنی پڑیں۔ حیدر علی نے مدراس کو تقریباً اپنے قبضے میں لے لیا تھا لیکن وارن ہیسٹنگز کی حکمت علی کی وجہ سے انگریزوں کی عزت بچ گئی۔ ان حالات کے پیشِ نظر توسیع سلطنت کا کام ناممکن تھا۔

لارڈ کارنوالس (۱۷۸۶ء-۱۷۹۳ء) امریکہ میں جنگ میں شامل ہو چکا تھا۔ لیکن کمپنی کی ہدایت کے مطابق اس نے بھی بنگال کی حکومت کو مستحکم بنانے پر زور دیا۔ ملک کے سیاسی حالات کے پیشِ نظر کارنوالس کو ٹیپو سلطان سے جنگ لڑنی پڑی۔ انگریزوں کو ٹیپو سلطان اور فرانسیسیوں کے درمیان تعلقات ناپسند تھے۔ ٹیپو سلطان نے جب ٹراونکور پر حملہ کیا تو کارنوالس نے اپنے ماتحت دوست راجا کی مدد کی۔ اس طرح میسور کی تیسری جنگ ہوئی۔ اس میں ٹیپو سلطان کی ہار ہوئی۔ کچھ اہم حصّوں کو حاصل کرنے کے بعد ٹیپو سلطان کی ریاست واپس کر دی گئی۔ کارنوالس نے شاہ عالم کی ذاتی درخواست پر بھی دہلی کے معاملات میں دخل اندازی کرنے سے انکار کر دیا۔

کارنوالس کے بعد جان شور (۱۷۹۳ء-۱۷۹۸ء) نے ان دونوں سے ایک قدم بڑھ کر غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی۔ اس طرح ۱۷۵۷ء سے ۱۷۹۸ء تک یعنی لارڈ ولزلی کے گورنر جنرل مقرّر ہونے تک انگریز حکمراں توسیع سلطنت سے گریز کرتے رہے۔ اسی دور کو مورّخ سر ولیم لی وارنر رِنگ فینس پالیسی کا دور کہتے ہیں اس کے تحت بنگال کی برطانوی سلطنت کی حفاظت کے پیشِ نظر پڑوسی ہندستانی ریاستوں سے دوستی کی پالیسی اپنائی اور دوستانہ معاہدے کیے ۱۷۹۷ء میں اودھ کے نواب وزیر علی کو تخت سے اتار کر سعادت علی کو نواب بنا دیا۔ یہ موقع تھا کہ جان شور اودھ کے کچھ علاقے حاصل کر لیتا۔

لارڈ ولزلی کی توسیع سلطنت کی پالیسی

۱۷۹۸ء میں جب لارڈ ولزلی (۱۷۹۸ء-۱۸۰۵ء) گورنر جنرل مقرّر ہوا تو ہندستان کے سیاسی حالات کافی بدل چکے تھے کمپنی کی غیر جانبدارانہ پالیسی کی وجہ سے ہندستانی حکمراں بدستور اپنی طاقت بڑھانے میں مصروف تھے۔ وہ خصوصاً انگریزوں کے بے حد خلاف تھے اور مخالف طاقتوں سے گٹھ جوڑ میں مصروف تھے۔ میسور میں ٹیپو سلطان انگریزوں کا سخت ترین دشمن تھا اور

فرانسیسیوں سے فوجی مدد حاصل کی تھی۔ ٹیپو سلطان فرانس کے جیکو بن کلب کا رکن بن گیا تھا۔ فوج میں متعدد فرانسیسیوں کو اونچے عہدوں پر فائز کر کے فوج کی تربیت کرا رہا تھا۔ اس نے ترکی اور دیگر مسلم ملکوں سے سفارتی تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ مراٹھے ہندستان میں سب سے زیادہ طاقتور تھے اور تمام حکمرانوں کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ نظام حیدر آباد کی فوج میں بھی فرانسیسی شامل ہو گئے تھے۔ فرانسیسی مراٹھوں کے ساتھ خصوصاً سندھیا کی دوستی کی وجہ سے دہلی کے تخت کے محافظ بن گئے تھے۔

اسی زمانے میں یورپ میں فرانس کے نیپولین بوناپارٹ کے عروج سے کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اس نے یورپ میں کئی ملکوں پر فتح پائی تھی وہ خصوصاً انگلینڈ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ انگلستان کی نو آبادیات پر اس کی نظر تھی اور ہندستان پر حملہ کرنے کی اس نے دھمکی دی تھی۔

ریگولیٹنگ ایکٹ کی ناکامی کے بعد اور وارن ہیسٹنگز کے تجربوں کی روشنی میں اب انگلستان کی حکومت نے کمپنی کے معاملات پر بھی خاص توجہ دی۔ جس کے نتیجے میں ۱۷۸۴ء میں پٹس انڈیا ایکٹ پاس کر کے ایک بورڈ آف کنٹرول کی تشکیل کی گئی۔ تجارت کو چھوڑ کر کمپنی کے زیادہ تر فوجی اور سیاسی معاملات بورڈ آف کنٹرول کے ماتحت آ گئے تھے۔ بورڈ آف کنٹرول کا صدر ہینری ڈنڈاز جو انگلستان کی حکومت کی طرف سے مقرر ہوا تھا لارڈ ولزلی کا دوست تھا۔ اس ایکٹ سے گورنر جنرل کے اختیارات میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ لیکن کمپنی اب بھی غیر جانبداری کی پالیسی کے حق میں تھی جس کو کارنوالس اور جان شور نے بنھایا تھا۔

ان حالات کے پیشِ نظر لارڈ ولزلی نے کمپنی کی غیر جانبداری کی پالیسی کو بالائے طاق رکھا اور ہندستان میں برطانوی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے ولزلی نے تین طریقے اپنائے۔ اوّل، ولزلی نے انگریزوں کی ماتحت حکومتوں کو اپنی حکومت میں ملایا۔ ان ریاستوں کے حکمراں بے حد کمزور تھے اور انتظامِ سلطنت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ ایسے حکمرانوں کو پنشن دے کر

ان کی ریاستوں کو اپنی حکومت میں ملا لیا۔۱۷۹۹ء میں تنجور کے راجا کو پنشن دے کر تنجور کو برطانوی حکومت میں شامل کر لیا۔ ۱۸۰۱ء میں محمد علی کے جانشین کو پنشن دے کر کرناٹک کو اپنی حکومت میں ملا لیا۔ اسی طرح سورت کے حکمراں کو بھی پنشن دے کر سورت برطانوی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔

امدادی صلح کی نوعیت اور شرائط

ولزلی نے دوسرا طریقہ امدادی صلح کا اپنایا۔ جو ریاست اسے منظور کرتی تھی اسے حسب ذیل شرائط ماننی پڑتی تھیں۔

امدادی صلح کی شرائط

۱۔ ہندستانی حکمراں کو اپنی ریاست میں انگریزی فوج رکھنی پڑتی تھی۔

۲۔ فوج کی تربیت پر جو خرچہ ہوتا تھا۔ وہ ہندستانی حکمراں کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

۳۔ ہندستانی حکمراں کو اپنی فوج کے بڑے حصے کو منسوخ کرنا پڑتا تھا۔

۴۔ انگریزوں کے علاوہ دیگر یورپین اقوام کو نکالنا پڑتا تھا۔

۵۔ ایک انگریزی ریزیڈنٹ ہندستانی ریاست میں رہتا تھا۔

۶۔ بیرونی پالیسی انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔

۷۔ ہندستانی حکمراں بغیر انگریزوں کی اجازت کے کسی حکمراں سے دوستی یا جنگ نہیں کر سکتے تھے۔

۸۔ انگریزوں کے دشمن ہندستانی حکمراں کے دشمن اور ان کے دوست ہندستانی حکمراں کے دوست ہوتے تھے۔

۹۔ اندرونی معاملات، انتظام سلطنت ہندستانی حکمراں کے ہاتھ میں تھا اور انگریزوں نے تحریری طور پر اسے آزاد رکھا تھا مگر عملاً وہ اندرونی معاملات میں بھی دخل اندازی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وزیر اور جانشین کا تقرر بغیر انگریزوں کی اجازت کے نہیں ہوسکتا تھا۔ اور انگریز ان ہی کو وزیر یا حکمراں کا جانشین مقرر کراتے تھے جو

انگریزوں کا وفادار ہوتا تھا۔

اس طرح امدادی صلح تسلیم کرنے والی ریاستیں عملاً انگریزوں کے ماتحت ہوگئیں۔ حکمرانوں کے لیے محض نظامِ حکومت کی ذمہ داری رہ گئی۔[۱]

حیدرآباد ولزلی کی امدادی صلح سب سے پہلے حیدرآباد کے نظام علی (۱۷۶۱ء۔ ۱۸۰۳ء) نے تسلیم کی۔ ۱۷۹۸ء میں سب سے پہلے ولزلی نے نظام علی کے سامنے امدادی صلح کی تجویز پیش کی۔ انگریزوں کے خیرخواہ وزیر ارسطوجاہ کے مشورے پر نظام علی نے آخرکار امدادی صلح تسلیم کرلی۔ اس طرح امدادی صلح کی تمام شرائط منظور کرکے ریاست حیدرآباد انگریزوں کی ماتحت ریاست بن گئی۔ فوج کی تربیت کے خرچے کے لیے حیدرآباد کے کچھ علاقے انگریزوں کو دے دیے گئے۔

نظام علی کے بعد اس کا جانشین سکندرجاہ (۱۸۰۳ء۔ ۱۸۲۹ء) حیدرآباد کا نظام بنا۔ اس نے انگریزوں کے چنگل سے نکلنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ سکندرجاہ کے جانشین نصیرالدّولہ (۱۸۲۹ء۔ ۱۸۵۷ء) کو انگریزوں کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ بلکہ اس نے اپنے جانشین افضال الدّولہ کو یہ ہدایت کی کہ انگریزوں سے دوستی رکھنے ہی میں خیر ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں افضال الدّولہ نے دریردہ انگریزوں کے خلاف انقلابیوں کی مدد کی۔[۲]

اودھ ولزلی کی امدادی صلح کو اودھ کے نواب سعادت علی نے قبول کرلیا۔ نواب سعادت علی خاں (۱۷۹۷ء۔ ۱۸۱۴ء) بہادر اور بہترین منتظم تھے۔ ولزلی نے اودھ میں انگریزی فوج کا خرچہ ½ ۱ ملین اسٹرلنگ کردیا۔ اس خرچے کو پورا کرنے کے لیے ولزلی ہی کی تجویز پر نواب کو روہیل کھنڈ اور دوآب کا زرخیز علاقہ انگریزوں کو دینا پڑگیا۔ یہ علاقہ نواب کی ریاست کا تقریباً نصف حصہ تھا۔ اس طرح ریاست اودھ بھی انگریزوں کی ماتحت ریاست بن گئی۔

سعادت علی خاں کے جانشین غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء۔ ۱۸۲۷ء) انگریزوں کی وجہ سے نواب بنے۔ مغل شہنشاہ کی ناراضگی کے سبب ہیسٹنگز نے نواب غازی الدین

حیدر کو بادشاہ کا خطاب دے دیا۔ اس طرح مغل حکومت سے اودھ کا ایک روایتی رشتہ بھی ختم ہوگیا۔

غازی الدین حیدر کا جانشین نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء۔ ۱۸۳۷ء) نہایت کمزور اور عیش پرست تھا۔ اس کے زمانے میں انگریزوں نے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی۔ وزیر اور جانشین ایسے ہی مقرر کیے جاتے تھے جو انگریزوں کے وفادار ہوتے تھے۔ نصیر الدین حیدر کے جانشین محمد علی شاہ (۱۸۳۷ء۔ ۱۸۴۲ء) نے حکومت کا بہترین انتظام کرکے انگریزوں کو مداخلت کا موقع نہیں دیا۔ ان ہی کے زمانے میں ایک ایماندار وزیر حکیم مہدی علی خاں نے بھی حکومت کا بہترین انتظام کرنے میں محمد علی شاہ کی مدد کی۔ اس کے بعد امجد علی شاہ (۱۸۴۲ء۔ ۱۸۴۷ء) کے دور میں حکومت کے حالات بہت خراب ہوگئے۔ امجد علی شاہ بے حد مذہبی تھا۔ انتظام سلطنت میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء۔ ۱۸۵۶ء) اودھ کے بادشاہ ہوئے۔ شہزادگی کے زمانے میں وہ فنونِ لطیفہ کی مشق، رقص موسیقی اور ڈراموں میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ انھیں یہ توقع نہیں تھی کہ انھیں تخت نشین کیا جائے گا لیکن جب انھیں بادشاہ بنایا گیا تو حکومت کے کاموں میں غیر متوقع دلچسپی دکھائی ایک دستور واجدی ترتیب دیا۔ فوجوں کی تنظیم میں دلچسپی لی۔ لیکن یہ بات انگریزوں کو اچھی نہیں لگی۔ ریاست میں بدعنوانیوں کے بہانے ڈلہوزی نے انھیں پنشن دے کر اودھ کو ۱۸۵۶ء میں برطانوی حکومت میں ملا لیا۔[۳۵]

حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی جدّوجہد

میسور ریاست کا اصل حکمراں چکّا کرشن راج تھا۔ اس کی کمزوری کی وجہ سے دو بھائی نندراج اور کمانڈر انچیف دیوراج ریاست کے مالک بن گئے تھے۔ حیدر علی نندراج کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اس نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ مگر نہایت عقلمند اور بہادر تھا۔ نندراج نے بہادری سے خوش ہوکر اُسے ۵۰۰ سپاہیوں کی کمانڈ پر مقرر کردیا تھا۔ میسور حیدرآباد ریاست کی ماتحت ریاست

تھی ۔ ۱۷۴۸ء میں ناصر جنگ کی جانشینی کے موقع پر میسور کی طرف سے حیدر علی نے دربار میں حاضری دی ۔ ناصر جنگ کے قتل کے بعد حیدر علی بے انتہا مال و دولت لوٹ کر لے گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ جنگ پلاسی کے بعد جو انگریزوں کو دولت ہاتھ لگی اس سے کہیں زیادہ حیدر علی کو ہاتھ لگی تھی ۔ اس دولت سے حیدر علی نے اپنی فوج بڑھائی اور اپنی فوج کی تربیت فرانسیسیوں سے کرائی ۔

کرناٹک کی دوسری جنگ میں نندراج نے محمد علی کا ساتھ دیا تھا۔ محمد علی نے اس مدد کے عوض ترچناپلی کا علاقہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جنگ کے بعد محمد علی نے اس علاقے کو دینے سے انکار کر دیا۔ میسور کو مجبوراً کرناٹک پر حملہ کرنا پڑا۔ میسور فوج میں ہری سنگھ جیسا بہادر اور حیدر علی جیسا چالاک دونوں شامل تھے۔ انگریز اور تنجور کی فوجیں محمد علی کی مدد کو جا رہی تھیں ۔ ۱۴ اگست ۱۷۵۴ء کو حیدر علی نے ان فوجوں پر پیچھے سے حملہ کر کے انھیں شکست دی اور تمام ہتھیار چھین لیے۔ اس کامیابی سے خوش ہو کر نندراج نے حیدر علی کو ڈنڈی گل کے علاقے کا دیوان مقرر کر دیا۔

جب وہ دیوان کی حیثیت سے ڈنڈی گل جا رہا تھا تو اس علاقے کے پولیگار قبیلے نے نندراج کے خلاف بغاوت کر دی اور لگان دینے سے انکار کر دیا۔ حیدر علی نے ان سے دوستی کی اور لگان معاف کرانے کا وعدہ کیا۔ ڈنڈی گل پہنچ کر فوجی تیاری کر کے ۲۰۰۰۰ ہزار پولیگار پر حملہ کر دیا اور انھیں شکست دی۔ ان کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پولیگار حیدر علی سے متاثر ہو کر اس کی فوج میں شامل ہو گئے۔

۱۷۵۸ء کے بعد میسور کے راجا اور وزیر نندراج میں بے حد اختلاف ہو گئے ۔ راجا کی فوج اور نندراج کی فوج کے درمیان جنگ ہوئی اور راجا کی ہار ہوئی۔ اس کے بعد نندراج اور اس کے بھائی دیوراج میں بھی اختلاف ہو گیا۔ میسور کو مراٹھوں سے بھی بہت خطرہ تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر ملک کی اقتصادی حالت بہت خراب ہو گئی تھی ۔ فوج کے سپاہیوں کی تنخواہیں کافی مدت سے ادا نہ ہو سکیں تھیں۔ فوج بغاوت پر آمادہ تھی ۔ حیدر علی نے اس موقع پر بہت اچھا رول ادا کیا۔ راجا اور نندراج

کی صلح کرائی۔ دیوراج اور نندراج کی صلح کرائی۔ حیدر علی کی کارکردگی کی وجہ سے میسور سلطنت کا پورا انتظام اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ حیدر علی نے بڑی عقلمندی سے انتظامِ سلطنت کو ٹھیک کر کے فوج کی تنخواہیں بھی ادا کر دیں۔

کچھ عرصے کے بعد ریاست کے حالات پھر خراب ہو گئے۔ فوج کے سپاہی حیدر کے پاس آئے۔ حیدر علی نے نندراج کو پنشن دے دی اور سلطنت کا پورا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے راجا کی حیثیت کو برقرار رکھا اور قائم مقام کی حیثیت سے کام کرتا رہا اور خود کوئی لقب اختیار نہیں کیا۔

۱۷۸۰ء میں حیدر علی کو انگریزوں سے دوسری جنگ لڑنی پڑی۔ دراصل حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اثر سے انگریز بے حد خائف تھے۔ انگریزوں کو حیدر علی اور فرانسیسیوں کے درمیان تعلقات بھی پسند نہیں تھے۔ وہ میسور کی ریاست کو مراٹھوں کی مدد سے بفر اسٹیٹ میں بدلنا چاہتے تھے۔

حیدر علی نے مراٹھوں کو ۴۰ لاکھ روپے سالانہ چوتھ دینا منظور کیا اور انھیں غیر جانبدار بنا دیا۔ حیدر علی کو فرانسیسی پوری مدد دے رہے تھے۔ جب جنگ چھڑی تو حیدر علی نے انگریزوں کو کئی مورچوں پر مات دی۔ اس نے ایک مورچے پر اپنے لائق اور بہادر بیٹے ٹیپو سلطان کو بھی بھیجا تھا۔ اس جنگ کے دوران ۱۷۸۲ء میں حیدر علی کا انتقال ہو گیا۔ اب میسور کو بچانے کی پوری ذمہ داری ٹیپو سلطان پر آپڑی۔ ٹیپو نے جنگ جاری رکھی۔ لیکن یورپ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان ۱۷۸۴ء میں معاہدۂ امن ہونے کی وجہ سے ٹیپو کو فرانس سے مدد نہیں ملی۔ اسی وقت وارن ہیسٹنگز نے مدراس پریسیڈنسی کی بروقت مدد کی اور ٹیپو سلطان سے باعزت طریقے سے ۱۷۸۴ء میں سمجھوتہ ہو گیا۔ مدراس کے گورنر میکارتنی نے مارچ ۱۷۸۴ء میں منگلور میں ٹیپو سلطان سے معاہدہ کیا جس میں انگریزوں کو ٹیپو سلطان کی شرطیں منظور کرنی پڑی تھیں۔

اس معاہدے کے تحت ایک دوسرے کے جیتے ہوئے علاقے واپس کر دیے گئے۔

انگریزوں نے ٹیپو سے دوستانہ تعلقات رکھنے اور مشکل کے وقت مدد کرنے کا وعدہ کیا۔

ٹیپو کے خوف نے کارنوالس جیسے غیر جانبدار گورنر جنرل کو جنگ پر آمادہ کر دیا۔ کارنوالس کا خیال تھا کہ ٹیپو سلطان سے جنگ ناگزیر ہے۔ کارنوالس کو بھی ٹیپو کی بڑھتی ہوئی طاقت اور فرانسیسیوں سے تعلقات ناپسند تھے۔ ۱۷۸۹ء میں ٹیپو سلطان نے ٹراونکور پر حملہ کیا۔ ٹراونکور کا راجا انگریزوں کا دوست تھا۔ راجا کی اپیل پر کارنوالس نے فوراً امداد کرنا منظور کر لیا۔ ۱۷۹۰ء میں کارنوالس نے میسور پر حملہ کر دیا۔ دو سال تک جنگ جاری رہی۔ ٹیپو نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا مگر شکست ہوئی۔ ۱۷۹۲ء میں ٹیپو اور انگریزوں میں معاہدہ ہو گیا۔ جس کے تحت میسور کی تقریباً نصف سلطنت انگریزوں کے حوالے کرنی پڑی۔ تیس لاکھ پونڈ جنگ کا ہرجانہ ادا کیا اور دو بیٹوں کو ضمانت کے طور پر کارنوالس کے حوالے کیا گیا۔

حیدرآباد اور اودھ کے بعد ولزلی کے سامنے دو اور ریاستوں کو ماتحت بنانے کا مسئلہ درپیش آیا۔ ایک نئی میسور ریاست اور دوسری مراٹھوں کی پونا ریاست۔ ولزلی نے ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کے سامنے امدادی صلح کرنے کی تجویز رکھی۔ ٹیپو سلطان نے ولزلی کی امدادی صلح کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجے کے طور پر ولزلی نے اپنے بھائی آرتھر ولزلی کی سرکردگی میں انگریزی فوجیں ٹیپو کی ریاست پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیں۔ بمبئی کی فوجوں نے میسور پر مغرب کی طرف سے حملہ کیا ملاولی میں ٹیپو کی ہار ہوئی۔ اس نے سرنگاپٹم کے قلعے میں پناہ لی۔ انگریزی فوج نے اس قلعے کا محاصرہ کیا۔ ایک بار پھر ٹیپو کے سامنے انگریزوں نے اپنی شرائط رکھیں۔ صوبے کا آدھا حصہ مانگا اور ۲۰ لاکھ پونڈ کی بھی مانگ کی۔ ٹیپو سلطان پھر بھی راضی نہیں ہوا۔ آخرکار انگریزوں نے ٹیپو کے وزیر پورنیا کے ساتھ سازش کی۔ ٹیپو کے سیناپتی قمرالدین خاں اور دیوان میر صادق نے بھی غداری کی اور انگریزوں سے مل گئے۔ ان لوگوں کی سازش سے انگریز قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ٹیپو سلطان نے وہاں آخری جنگ

ہوئی۔ٹیپو سلطان ۱۸۹۹ء میں جنگ میں شہید ہوئے۔[۵]

ولزلی کو امید سے زیادہ کامیابی ہوئی اور میسور کا پورا صوبہ مل گیا۔ ولزلی نے میسور کے زرخیز علاقے جیسے کوکی ناڈا کا مغربی علاقہ کوئمبتور کا دکنی علاقہ، مشرقی ضلع اور سرنگا پٹم کا قلعہ اپنی حکومت میں ملا لیے۔ میسور کے کچھ علاقے نظام حیدرآباد کو اس کی مدد کے عوض دے دیے۔ باقی ماندہ چھوٹی سی ریاست میسور کے پشتینی واڈیار راجا کو دے دی گئی۔ ٹیپو کے جانشینوں کی پنشن مقرر کر دی۔

انگلستان میں اس فتح کی بڑی خوشیاں منائی گئیں جنرل ہیرس کو بیرن کا خطاب ملا اور ولزلی کو مارکوئیس کا خطاب عطا کیا گیا۔ جو اس کی نظر میں اس کی خدمات کے مقابلے میں بہت کم تھا۔[۶]

انگریز مورخین نے ٹیپو سلطان کی بحیثیت ایک حکمراں بڑی بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ مگر پروفیسر محب الحسن نے اپنی ضخیم تحقیقی کتاب "ہسٹری آف ٹیپو سلطان" میں انتظام سلطنت، مذہبی رواداری اور بہادری کے ثبوت دے کر انصافانہ تصویر پیش کی ہے۔ ان کے مطابق ٹیپو سلطان کے زمانے میں میسور اقتصادی طور پر بے حد خوش حال تھا۔ زراعت کے ساتھ ساتھ وہاں صنعتی ترقی بھی ہوئی تھی۔ ٹیپو سلطان نے مذہبی رواداری کی پالیسی اپنائی تھی۔ اونچے اونچے عہدوں پر ہندوؤں کو فائز کیا تھا۔ اسے تعلیم سے بے حد شغف تھا۔ تعلیمی ادارے اور لائبریریاں قائم کیں۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے حکمرانوں کو ایک ہندوستانی ہونے کے ناتے متحد کر کے برطانوی سامراج کو ختم کرنا چاہتا تھا مگر اس کا ساتھ کسی نے نہیں دیا۔[۷] اس لحاظ سے اگر ٹیپو سلطان کو جنگ آزادی کا پہلا شہید کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

ولزلی اور مراٹھے

ہندوستان پر برطانوی سیاسی تسلّط کے قیام میں ابھرتے مراٹھے مانع تھے

۱۸۰۰ء میں نانا فرنویس کے انتقال تک ہندستان پر مراٹھوں کا تسلط چھایا رہا۔ مراٹھوں کے دیگر سردار سندھیا، ہولکر، بھونسلے، گائکواڑ وغیرہ بھی بہت بہادر تھے۔ اس وقت سندھیا تو شاہ عالم کا فرزند دلی بند بنا ہوا تھا۔

آخر کار ولزلی کو نانا فرنویس کے انتقال کے بعد مراٹھوں کو زیر کرنے کا بہانہ مل گیا۔ پیشوا باجی راو کی کمزوری کی وجہ سے مراٹھا سرداروں میں آپس میں پونا دربار پر تسلط قائم کرنے کی جدوجہد چھڑ گئی۔ باجی راو سندھیا کو ترجیح دیتا تھا۔ لیکن جسونت راو ہولکر زیادہ طاقتور تھا اس نے سندھیا اور باجی راو کی فوجوں کو شکست دے دی۔ باجی راؤ نے انگریزوں کی پناہ لی اور ۳۱ دسمبر ۱۸۰۲ء کو بسین کے مقام پر ولزلی کی امدادی صلح منظور کر لی اور اس طرح ریاست پونا بھی انگریزوں کی ماتحت ریاست بن گئی۔ برار کے راجا بھونسلے نے سندھیا اور ہولکر میں صلح کرا کے امدادی صلح کو رد کرادیا۔ چنانچہ مرہٹوں سے جنگ ہوئی۔ مراٹھوں کی فوجوں کی تعداد دو لاکھ پچاس ہزار تھی جبکہ انگریزوں کے پاس صرف پچپن ہزار (۵۵،۰۰۰) فوج تھی ولزلی نے اس جنگ کی منصوبہ بندی میں اپنی عاقلانہ سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا۔ اس نے آرتھر ولزلی کو دکن میں حملہ کرنے کے لیے بھیجا اور جنرل لیک کو شمال میں بھیجا۔ گجرات، اڑیسہ بنگال کے دکنی صوبوں، مدراس کے شمالی علاقوں پر بھی حملہ کرنے کے لیے تیاریاں کریں۔ ۲۹ نومبر ۱۸۰۳ء میں ارگاؤں کے مقام پر سندھیا اور بھونسلے کی ہار ہوئی۔ انھوں نے انگریزوں سے معاہدۂ امن کرلیا۔ شمالی مہم میں جنرل لیک نے ۱۸۰۳ء میں پہلے علی گڑھ اور آگرہ پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد دہلی میں سندھیا کے قائم مقام فرانسیسی جنرل پیرون کو لاسوری کے مقام پر نومبر ۱۸۰۳ء میں شکست دی۔ ادھر گجرات بڑوچ اور اڑیسہ میں راجا بھونسلے کی فوجوں کو ہرایا۔ لیکن انگریز ہولکر کو شکست دینے میں ناکام رہے۔ مگر مراٹھوں کو انگریزوں سے معاہدے کرنے پڑے دیوگانو کا معاہدہ راجا بھونسلے سے کیا گیا۔ اور سرجی ارجن گانو کا معاہدہ سندھیا سے ہوا۔ ان معاہدوں کے تحت مراٹھوں کو ولزلی کی امدادی صلح قبول کرنی پڑی ۔

ولزلی کو ۱۸۰۵ء میں واپس بلا لیا گیا۔ اور اس کی جگہ لارڈ کارنوالِس کو گورنر جنرل بنا کر بھیجا۔ کارنوالس کا اُسی سال انتقال ہوگیا۔ ۱۸۰۵ء سے ۱۸۰۷ء تک جارج بارلو قائم مقام گورنر جنرل رہے۔ اس کے بعد لارڈ مِنٹو (۱۸۰۷ء۔ ۱۸۱۳ء) گورنر جنرل رہے۔

لارڈ ہیسٹنگز کی توسیعِ سلطنت کی پالیسی

لارڈ ہیسٹنگز (۱۸۱۳ء۔ ۱۸۲۳ء) نے توسیعِ سلطنت کی پالیسی اپنا کر ولزلی کے بچے ہوئے کام کی تکمیل کی۔ کارنوالِس اور لارڈ مِنٹو کے عہد میں مراٹھوں کو پھر ابھرنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے امدادی صلح کی شرائط کی پابندی میں بھی لاپرواہی کی۔ وزیر ترمبک جی کے بہکانے پر باجی راؤ نے انگریزوں کی پرواکرنا بند کر دی۔ اس نے بھڑکا کر انگریزوں کے دوست گائکواڑ کے وزیر گنگا دھر شاستری کا قتل کرادیا۔ انگریز ریزیڈنٹ ایلفنسٹن نے باجی راؤ سے ترمبک جی کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔ پیشوا نے پس و پیش کے بعد ترمبک جی کو گرفتار تو کر لیا مگر اسے فرار ہونے کا موقع بھی دے دیا۔ ۱۲ر جون ۱۸۱۷ء کو ایلفنسٹن نے باجی راؤ کو بھاری شرطوں پر امدادی صلح پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ ۱۸۱۶ء میں ناگپور کے کمزور راجا کے وکیل اپّا صاحب سے بھی امدادی صلح ہو چکی تھی۔ ۵ر نومبر ۱۸۱۷ء کو سندھیا کو بھی امدادی صلح پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا۔ جس دن سندھیا نے امدادی صلح پر دستخط کیے پیشوا نے اسی دن بغاوت کر دی۔ انگریزوں کی ریزیڈنسی کو جلا دیا گیا۔ ایلفنسٹن کسی طرح جان بچا کر بھاگ گیا۔ ایلفنسٹن نے آخر کار مراٹھوں کو کھڑکی کے مقام پر شکست دی۔ اپّا صاحب اور ہولکر نے بغاوت میں حصّہ لیا۔ مگر ۲۷ر نومبر ۱۸۱۷ء کو اپّا صاحب کی فوجوں کو انگریزوں نے ہرا دیا۔ ہولکر کی فوج کو مہدی پور میں ۲۱ر دسمبر ۱۸۱۷ء میں ہرایا۔ دونوں کو امدادی صلح قبول کرنی پڑی۔ کورے گانو کے مقام پر انگریزی فوجوں کا پیشوا کی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ آخر کار ۱۸ر جون ۱۸۱۸ء کو پیشوا نے بھی ہار تسلیم

کرلی۔ باجی راو کو اسی ہزار پونڈ سالانہ پنشن دے کر کانپور کے قریب بِتھور میں رکھا گیا۔ ترمبک جی کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ ستارا کی چھوٹی سی ریاست شیواجی کے خاندان کے جانشیں کو دے دی گئی۔ ناگپور کے اپّا صاحب بھونسلے کی حکومت اس کے خاندان کے دوسرے رکن کو دی گئی۔ اسی طرح ۱۸۱۸ء میں مراٹھوں سے تیسری جنگ میں مراٹھوں کی شکست کے بعد انگریز پورے ہندستان کے مالک بن گئے۔[۹]

لارڈ ہیسٹنگز ہی کے زمانے میں مراٹھوں کے حملوں سے تنگ آکر راجپوت ریاستوں نے انگریزوں کی امدادی صلح قبول کرلی تھی۔ ان میں ادے پور، جودھپور، جیپور اور بوندی، شامل تھیں۔

امیر خاں ہولکر کا دوست تھا۔ جب ۱۸۱۷ء میں ہولکر کی ہار ہوئی تو مجبوراً امیر خاں کو بھی صلح کرنی پڑی۔ امیر خاں کے قبضے میں ہولکر کی آدھی ریاست تھی۔ جسونت رائے ہولکر کی شکست کے بعد وہ تقریباً آزاد ہو گیا تھا۔ وہ پنڈاریوں کا بھی سربراہ تھا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے اس کو بھی ہرا کر ۹ نومبر ۱۸۱۷ء کو معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس معاہدے کے تحت اُسے ٹونک کا امیر تسلیم کرلیا گیا۔ امیر خان کے بھائی غفور خاں کو بھوپال کا نواب تسلیم کرلیا۔ ۲۷ نومبر ۱۸۱۸ء کو اس نے بھی انگریزوں کی امدادی صلح منظور کرلی۔[۱۰]

لارڈ ڈلہوزی کی توسیعِ سلطنت کی پالیسی

لارڈ ڈلہوزی (۱۸۴۸ء - ۱۸۵۶ء) جب گورنر جنرل بن کر آیا تو اس نے بھی ولزلی کی طرح توسیعِ سلطنت کے تین طریقے اپنائے بلکہ اس معاملے میں ڈلہوزی کو ولزلی پر سبقت حاصل رہی۔ کیوں کہ لارڈ ڈلہوزی نے مکمل طور پر انگریزوں کے تسلّط اور برتری کو قائم کرنا حق بجانب سمجھا۔ انگریزوں کی مرکزی حیثیت کو ایک حقیقت مان کر ولزلی اور لارڈ ہیسٹنگز کی ماتحتی علاحدگی (SUBORDINATE ISOLATION) کی پالیسی کو رد کیا۔ بقول سر ویلیم لی وارنر امدادی صلح کی پالیسی

سے ماتحتی علاحدگی کا دور شروع ہوا جس کے تحت انگریزوں کو ہندستانی ریاستوں پر تو اختیارات بہت حاصل ہو گئے تھے۔ ریاستوں کی بیرونی پالیسی انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی۔ مگر انتظام سلطنت کی ذمہ داریاں ریاستی حکمرانوں کے لیے چھوڑ دی تھیں۔ ڈلہوزی کے خیال میں ایک مرکزی حکومت ہونے کے ناتے برطانوی حکومت کی یہ اخلاقی ذمہ داری تھی کہ وہ ماتحت ریاستوں کی رعایا کے حالات کو بھی سدھاریں گے اور اگر ریاستی حکمراں حالات سدھارنے میں ناکام ہوں تو ریاست کو برطانوی حکومت میں شامل کر لیا جائے۔ اخلاقی ذمہ داری کے نظریے کے تحت کئی ریاستوں کو اصول الحاق (ڈاکٹرن آف لیپس) کے مطابق اپنی حکومت میں ملا یا۔ یعنی جن ریاستوں کے حکمراں لاولد تھے۔ ان کی ریاست متبنیٰ اولاد کو نہیں دی جا سکتی تھی۔ وہ ریاستیں برطانوی حکومت میں شامل کر لی گئیں۔ ایسی ریاستوں میں ستارا (۱۸۴۸ء) جیت پور اور سمبل پور (۱۸۴۹ء) باغت (۱۸۵۰ء) اُدے پور (۱۸۵۲ء) جھانسی (۱۸۵۳ء) اور ناگپور (۱۸۵۴ء) وغیرہ شامل ہیں۔ اسی اصول کے تحت پیشوا باجی راو کے متبنیٰ بیٹے نانا صاحب کی ۱۸۵۳ء میں پنشن بند کر دی گئی۔

دوسرے طریقے کے تحت جن ریاستوں میں حکمرانوں کی لاپروائی کی وجہ سے ریاست میں بدحالی تھی ایسی ریاستوں کو بھی برطانوی حکومت میں ملا لیا۔ ایسی ریاست میں صرف اودھ ریاست شامل تھی۔ ۱۸۵۶ء میں ڈلہوزی نے کرنل سلیمن اور اوٹرم کے ذریعہ چھان بین کرا کر الحاق کا جواز پیدا کیا۔ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کو سلطنت سے ماخوذ کر کے مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا۔ ڈلہوزی نے خود ملکہ کو لکھا کہ اس نے انگلستان کی کروڑوں روپے کی آمدنی اودھ کو حاصل کر کے بڑھا دی ہے۔[۱۱]

ڈلہوزی نے توسیع سلطنت کا تیسرا طریقہ جنگ کا ہی اپنایا۔ پنجاب اور اپر برما کو ڈلہوزی نے جنگ کے ذریعے اپنی حکومت میں ملایا۔ اس سلسلے میں رنجیت سنگھ کے عروج اور انگریزوں سے تعلقات کا جائزہ لینا ضروری ہے

۱؎ پی۔ ای۔ رابرٹ، ہسٹری آف انڈیا، ص ص۔ ۲۲۲ - ۲۴۲
مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے، سر ولیم لی وارنر، دی نیٹو اسٹیٹس آف انڈیا۔

۲؎ پی۔ ای۔ رابرٹ، انڈیا انڈر ولزلی
مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے، مجیب اشرف، مسلم ایٹی چیوڈ...
ص ص۔ ۳۱ - ۱۱۶

۳؎ ایضاً

۴؎ شیخ علی، اینگلو میسور ریلیشنس
سنہا، حیدر علی

۵؎ رابرٹ، ج نمبر ۲
پرتاب سنگھ، بھارت کا آدھونک اتہاس، ص ص۔ ۲۶۵، ۲۶۹

۶؎ ایضاً

۷؎ محب الحسن، دی ہسٹری آف ٹیپو سلطان

۸؎ رابرٹ، مذکورہ بالا

۹؎ پرتاب سنگھ، مذکورہ بالا

۱۰؎ اشرف، مذکورہ بالا

۱۱؎ ایضاً

باب ۔ ۶

مہاراجا رنجیت سنگھ

عروج شمال مغرب کے سرحدی علاقے کو صحیح معنوں میں ہندوستان کا اصل گیٹ وے آف انڈیا قرار دیا جا سکتا ہے۔ آریوں سے لے کر شاہ ابدالی تک انگنت حملہ آور ہندوستان میں اسی راستے سے داخل ہوئے۔ اسی وجہ سے پنجاب اور سندھ کی حیثیت ہر زمانے میں اہم رہی ہے۔

۱۸ ویں صدی کے آخر میں پنجاب میں سکھوں کی ۱۲ سرکش مثلوں میں سے سیکر چکیہ مثل کے راجا رنجیت سنگھ کا پنجاب میں عروج ہوا۔

رنجیت سنگھ (۱۷۸۰ء۔ ۱۸۳۹ء) ۱۳ رنومبر ۱۷۸۰ء میں جیند کے ایک چھوٹے سے قصبہ بدروخاں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مہان سنگھ سیکر چکیہ مثل کے سردار تھے۔ ۱۷۹۲ء میں جب مہان سنگھ کا انتقال ہوا تو رنجیت سنگھ کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی۔ اس لیے ایک کونسل کی سرپرستی میں رنجیت سنگھ اپنی مثل کے سردار بنے۔ رنجیت سنگھ نے تعلیم بہت کم پائی تھے۔ بلکہ تقریباً ناخواندہ تھے۔ تاہم ان کے والد نے فوجی تربیت اور امور حکمرانی سکھا دیے تھے۔ تین ماہ کے بعد کونسل کی سرپرستی کو ختم کر کے رنجیت سنگھ نے انتظام سلطنت براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اب رنجیت سنگھ نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے سکھ سرداروں کو اپنا ماتحت بنایا۔ ۷ رجولائی ۱۷۹۹ء میں زماں شاہ سے لاہور لے لیا۔ انگریزوں کو رنجیت سنگھ

کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ پیدا ہوا تو اس کو مناسب حدود میں رکھنے کے لیے ۱۸۰۸ء میں لارڈ منٹو نے ڈیوڈ آکٹر لونی کو ایک بھاری فوج کے ساتھ رنجیت سنگھ سے معاہدہ کرنے کے لیے بھیجا۔ رنجیت سنگھ کو انگریزوں کی جدید تربیت یافتہ فوج کی برتری کا علم تھا اور بعض سرداروں کی وفاداری مشتبہ تھی۔ اس لیے رنجیت سنگھ نے ۱۸۰۹ء میں انگریزوں سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدے کی رُو سے کچھ علاقوں کے علاوہ رنجیت سنگھ کو پورے پنجاب کا آزاد حکمراں تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۸۳۱ء میں ولیم بینٹنک نے رنجیت سنگھ سے قدیم معاہدے کی تجدید کی۔ اس طرح رنجیت سنگھ کی ریاست نے انگریزوں کے لیے شمال مغربی علاقے میں ایک بفر اسٹیٹ کا کام انجام دیا۔[۱]

۱۸۰۹ء میں افغانستان میں تخت نشینی کی جنگ چھڑی تو رنجیت سنگھ کو اپنی حکومت کی حدود بڑھانے کا موقع ملا۔ دوست محمد نے شاہ شجاع کو تخت سے اتار کر کشمیر میں قید کر دیا۔ شجاع کی بیوی وفا بیگم اور کچھ پٹھانوں نے رنجیت سنگھ کی حکومت میں پناہ لی۔ وفا بیگم کے اصرار پر اور کوہِ نور ہیرا دینے کے وعدے پر رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع کو کشمیر سے رہائی دلائی۔ ۱۸۳۳ء میں شاہ شجاع نے معاہدے کے تحت سندھ کے علاقے رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیے۔[۲]

۱۴ مارچ ۱۸۲۴ء میں رنجیت سنگھ نے پشاور پر حملہ کر کے عظیم خاں کو شکست دے دی اور پشاور کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اسی علاقے میں سید احمد بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد شروع کیا۔ ۱۸۲۷ء میں سید احمد بریلوی نے پشاور پر قبضہ کر لیا۔ بعد کو رنجیت سنگھ نے مقابلے کے لیے فوج بھیجی۔ یہ جنگ ۱۸۳۱ء تک جاری رہی۔ بالاکوٹ کی جنگ میں سید احمد، شاہ اسمٰعیل اور ان کے ساتھی کام آئے اور پشاور پر رنجیت سنگھ کا ہمیشہ کے لیے قبضہ ہو گیا۔[۳]

طرزِ حکومت مہاراجا رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت کی بنیاد مذہبی رواداری کے اصول پر رکھی تھی۔ رنجیت سنگھ یہ بخوبی سمجھتے تھے کہ انھیں

ایک ایسی ریاست پر حکومت کرنی ہے جس کی آبادی مختلف مذہب کے ماننے والوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے انھوں نے سکھوں کے سیاسی اور مذہبی طریقۂ حکومت سے گریز کیا۔ رنجیت سنگھ مذہبی فرائض کی ادائیگی کرتے تھے۔ انھوں نے سکھوں کی ایک متحدہ حکومت قائم کر کے گرو گووند سنگھ کے سیاسی خواب کی تعبیر پوری کی تھی۔ مگر رنجیت سنگھ نے شروع ہی سے اکال تخت اور گرمتہ کے مذہبی ڈھانچے کو نہیں اپنایا۔ بلکہ امور حکمرانی میں وہ اکبرِ اعظم کے سیکولرزم اور گرو نانک کی مذہبی رواداری کی تعلیم سے متاثر نظر آتے ہیں۔

گرو گووند سنگھ کی تعلیمات کے مطابق سکھوں کا برہمنوں سے ہر قسم کا ربط ضبط ممنوع تھا۔ کیوں کہ برہمنوں نے ذات پات کی مخالفت کی بنا پر سکھوں کو ہندو مذہب سے خارج کر دیا تھا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے اعلا صلاحیتوں کے ہندوؤں کو اپنی حکومت میں اونچے اونچے عہدوں پر فائز کیا۔ دیوان دینا ناتھ ایک غیر پنجابی ہندو تھے جن کو لگان اور خزانے کا وزیر مقرر کیا تھا۔ مشر دیوان چند آرٹلری کے انچارج تھے۔ راجا گلاب سنگھ، راجا سچیت سنگھ اور سب سے زیادہ وفادار اور بھروسے کے آدمی راجا دھیان سنگھ حکومت کے مخصوص وزرا میں تھے۔ دھیان سنگھ کو رنجیت سنگھ سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد ان کی چتا میں جلنے پر بضد تھے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ ہندو تیوہاروں کا بڑے جوش و خروش سے اہتمام کرتے تھے۔ خاص طور سے دسہرا، ہولی، دیوالی، بسنت پنچمی بیساکھی اور لوہڑی بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے۔[۲۸]

گرو گووند سنگھ کے زمانے سے سکھ اور مسلمان حکمرانوں میں اَن بَن تھی۔ ۱۸ ویں صدی میں سکھوں کی تحریک کا مقصد مسلم حکومت کی بیخ کنی کرنا تھا، لیکن مہاراجا رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت میں مسلمانوں کو اعلا عہدوں پر فائز کیا تقریباً ۴۱ مسلمان اونچے عہدوں پر اور ۹۲ مسلمان پولس کے عہدوں پر فائز تھے۔ رنجیت سنگھ نے وزارت خارجہ کا اہم عہدہ ایک مسلم فقیر عزیزالدین کو سپرد کیا تھا۔ تمام یورپین

عزیزالدین سے بے حد متاثر تھے ۔ اور اُن کو حکومت کا روح و رواں سمجھتے تھے ۔ جنگ و امن کے معاملات میں عزیزالدین کی رائے فیصلہ کُن ہوتی تھی ۔ چنانچہ انگریزوں سے جنگ کا خیال چھوڑ کر مصالحت کی پالیسی رنجیت سنگھ نے عزیزالدین ہی کے مشورے پر اپنائی ۔

فقیر عزیزالدین کے برادرِ خورد خلیفہ نورالدین رنجیت سنگھ کے وزیر داخلہ تھے ۔ میاں غوث توپ خانہ کے انچارج تھے ۔ قاضی نظام الدین ، مفتی محمد شاہ پوری اور سعداللہ چشتی مسلمانوں کے مسائل شریعت سے طے کرتے تھے مہاراجا رنجیت سنگھ مسلم صوفی اور علما کی بڑی قدر کرتے تھے ۔ وہ اکثر مزاروں کی بھی زیارت کرتے تھے ۔ عید الفطر کے تیوہار میں شرکت کرتے تھے ۵ھ

رنجیت سنگھ اور یورپین رنجیت سنگھ نے یوُرپین کی فوجی تکنیک ، تربیت اور صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے ۔ اپنی فوج کی تربیت کے لیے رنجیت سنگھ نے فرانسیسیوں پر بڑا بھروسا کیا ۔ تقریباً ۴۲ یوُرپین افراد ان کی حکومت میں اونچے عہدوں پر فائز تھے ۔ لیکن رنجیت سنگھ نے یوُرپین افراد کی تعداد کو حد سے بڑھنے نہیں دیا ۔ فرانس کا جنرل جین وینتورا نپولین کی فوج میں شامل تھا ۔ نپولین کی ہار کے بعد ہندستان آیا ۔ رنجیت سنگھ نے اُسے فوج خاص کا کمانڈر مقرر کیا ۔ جنرل جین فریکوائز الارڈ بھی نپولین کی فوج سے آیا تھا اُسے اپنی گھوڑ سوار فوج کی تربیت پر مامور کیا تھا ۔ کرنل کورٹ نے گورکھا پلٹن تیار کی تھی ۔ اینگلو انڈین جنرل ایوٹیبل ، کرنل وان کورٹ لمنٹ ، رابرٹ ڈِک ، جیکب تھومس وغیرہ مختلف عہدوں پر فائز تھے ۔ مہاراجا یوُرپین کو نوکری دینے سے پہلے اپنی نرالی شرطیں رکھتے تھے ۔ اوّل یہ کہ وہ ہندستانی لڑکی سے شادی کر کے یہاں کے باشندے بن جائیں ، دوم سگریٹ نوشی اور گائے کا گوشت کھانے سے گریز کریں ۶ھ

جسمانی اعتبار سے رنجیت سنگھ کی شخصیت نہایت بے اثر تھی ۔ پستہ قد

چہرے پر گہرے چیچک کے داغ اور بائیں آنکھ سے محروم لیکن بہادری، سیاست اور ذہانت میں رنجیت سنگھ کا شمار جدید دور کے ممتاز حکمرانوں میں ہوتا ہے مستقل مزاجی عزم اور محنت رنجیت سنگھ کے کردار کے اعلا اوصاف تھے۔ وہ اپنی مہم میں ناکامی لفظ کا سننا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ غالباً ان ہی اوصاف کی بنا پر فرانسیسی مورخ وکٹر جیک مونٹ نے رنجیت سنگھ کو نپولین خورد، کے خطاب سے نوازا ہے۔ کیپٹن مرّے کو بھی رنجیت سنگھ کی شخصیت میں نپولین بوناپارٹ کی جھلک نظر آتی ہے۔ بقول جان مارشمین، رنجیت سنگھ اصل میں شیواجی اور حیدر علی کی طرح غیرمعمولی ذہین شخصیت کے حامل تھے۔ جنگ تو مجبوری تھی، ورنہ انسانوں کا خون بہانا اور جبر و تشدد کرنا رنجیت سنگھ پسند نہیں کرتے تھے انھوں نے سزائے موت کو ختم کر دیا تھا۔ انتظام سلطنت کا کام کونسل کے وزرا کے صلاح و مشورے سے کرتے تھے۔ ہر قوم کے مسائل ان کے قومی دستور کے مطابق طے کیے جاتے تھے۔[۷]

۱۔ فقیر سید وحید الدین، دی رئیل رنجیت سنگھ، ص ص۔ ۵۸۔ ۵۹
بکرم جیت حسرت، اینگلو سکھ ریلیشنس، ص ص۔ ۹۴، ۹۵، ۱۰۳

۲۔ ڈی۔ آر۔ سود، رنجیت سنگھ، ص ص۔ ۳۷۔ ۴۰

۳۔ ایضاً

۴۔ گریفن، رولرس آف انڈیا، ص۔ ۱۱۴
مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے، لالہ سوہن لال سوری، عمدت التواریخ

۵۔ وحید الدین، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۲۸۔ ۴۱

۶۔ سوری، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۷۸، ۷۹، ۱۶۶
گریفن، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۱۲۷۔ ۱۳۸

۷۔ ایضاً، ص ص۔ ۸۸، ۸۹، ۲۰۸

باب ۔ ۷

ایسٹ اِنڈیا کمپنی کا نظامِ حکومت

اہم چارٹر

ایسٹ اِنڈیا کمپنی کی حکومت کا قیام بتدریج ہوا ۔ نظامِ حکومت کی بنا تجارتی مفاد اور سیاسی موقع پرستی پر رکھی گئی تھی ۔ کرداری اعتبار سے برطانوی نظام کی نوعیت دفتری ثنویت رہی ۔ ہم اس طرح کے نظام کو بیوروکریٹک ڈیسپاٹزم کہہ سکتے ہیں ۔

ابتدا میں کمپنی کی ضرورت اور مفاد کے مطابق کمپنی کے نظام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں ۔ ۳۱ر دسمبر ۱۶۰۰ء میں ملکہ ایلزبیتھ نے برطانوی تاجروں کو ہندستان سے سمندری راستے سے براہِ راست تجارت کرنے کو ۱۵ سال کے لیے چارٹر دیا تھا ۔ شروع میں برطانوی تاجروں کی انجمن محض ایک ریگولیٹڈ کمپنی کی حیثیت رکھتی تھی ۔ یعنی کچھ قوانین کی پابندی کر کے تمام تاجر اپنے اپنے سرمایے سے تجارت کر سکتے تھے ۔ جیمس اوّل نے ۱۶۱۵ء میں یہ اجازت ہمیشہ کے لیے دے دی ۔ ۱۶۵۷ء میں مستقل طور پر برطانوی تاجروں کی انجمن جوائنٹ اسٹاک کمپنی میں تبدیل کر دی گئی ۔ پانچ پونڈ داخلہ فیس اور سو پونڈ کا سرمایہ لگا کر کوئی بھی اس کمپنی کا ممبر ہو سکتا تھا ۔ ۵۰۰ سو پونڈ کا سرمایہ لگانے والے کو اس کمپنی کی جنرل میٹنگ میں حصّہ لینے کا حق تھا ۔ ایک ہزار پونڈ کا حصّہ دار کمپنی کی کمیٹی کا ممبر چُنا جا سکتا تھا چار ہزار پونڈ کے

حصّہ دار کو کمپنی کے گورنر یا ڈپٹی گورنر کی حیثیت سے دو سال کے لیے چُنا جا سکتا تھا۔ شروع میں کمپنی کی کمیٹیوں کی تعداد ۷، اتھی بعد کو ۲۴ ہو گئی۔ انھیں کمیٹیوں کو ڈائرکٹر کے نام سے جانا گیا۔ تجارتی سفر کا انتظام، سامان کی درآمد، خرید و فروخت، گورنر کے فرائض میں شامل تھا۔ کمیٹیاں کمپنی کے انتظام کے سلسلے میں قوانین بنا سکتی تھیں۔ گورنر کی مدد کے لیے ڈپٹی گورنر اور خزانچی ہوتا تھا۔

۲ر اپریل ۱۶۶۱ء میں چارلس دوم نے ایک اہم چارٹر کمپنی کو دیا۔ جس کے مطابق کمپنی کو مزید اختیارات حاصل ہو گئے۔ اس وقت تک کمپنی کی تجارت کافی بڑھ گئی تھی۔ انگلستان کو افادیّت کا بھی احساس ہو چلا تھا۔ لہٰذا اس چارٹر کے تحت کمپنی کو اپنی فیکٹریوں کی قلعہ بندی کرنے، جنگی سامان، ہتھیار وغیرہ رکھنے، ضرورت پڑنے پر جنگ کرنے اور معاہدۂ امن کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اسی چارٹر کے تحت کمپنی کو ہندُستان میں تجارت کرنے کی اجارہ داری بھی حاصل ہو گئی۔ کمپنی کو اس کے تحت آزاد تاجروں کو سزا دینے اور انگلستان واپس بھیجنے کا اختیار حاصل تھا۔

۵ر اکتوبر ۱۶۷۷ء کے چارٹر کے مطابق بمبئی پریسی ڈنیسی کو سکّے جاری کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ مدراس پریسی ڈنیسی پہلے ہی ٹکسال قائم کر چکی تھی۔ ۹ر اگست ۱۶۸۳ء میں کمپنی کے مطابق جو شیا چائلڈ کے اصرار پر کمپنی کو ہندُستان میں یا اس کے کسی حصّے میں سیاسی تسلط قائم کرنے کے اختیارات دے دیے گئے تھے۔ اس کے مطابق کمپنی کو ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں دیگر قوموں (غیر عیسائی) کے خلاف جنگ کرنے اور ضرورت پڑنے پر معاہدۂ امن کرنے کا اختیار دے دیا تھا۔ کمپنی کو فوج رکھنے، اور فوجی افسروں کا تقرّر کرنے کا اختیار تھا۔ اس فوج سے وہ اپنی فیکٹریوں کو بیرونی حملوں سے بچا سکتے تھے۔ اور اندرونی بغاوتوں کو دبا سکتے تھے۔ کمپنی کے افسروں اور کارکنوں پر قابو رکھنے کے لیے کمپنی کو عدالتی (جوڈیشیل) اختیارات بھی دیے گئے۔

جیمس دوم نے ۱۲ر اپریل ۱۶۸۶ء کو ایک نئے چارٹر کے ذریعے کمپنی کے

تمام اختیارات کی از سرِ نو تصدیق کر دی ۔ اور جہازی بیڑے کے عہدیداروں کا تقرر کرنے کا بھی اختیار دیا۔ ساتھ ہی جہازی طاقت بڑھانے کا اختیار دیا۔ اسی چارٹر کے بعد مدراس پریسی ڈینسی میں میونسپل دستور عائد کیا گیا۔ اس طرح اس چارٹر سے جوائنٹ اسٹاک کمپنی کی حیثیت ایک کارپوریشن کی ہوگئی۔ اس چارٹر کے بعد کمپنی کے دستور میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔[۱]

ریگولیٹنگ ایکٹ، ۱۷۷۳ء

۱۷۵۷ء میں بنگال کی فتح ہوئی ۱۷۶۵ء میں کمپنی کو بنگال، بہار، اڑیسہ کی دیوانی حاصل ہوگئی۔ کلائو نے دوعملی حکومت قائم کرکے ہندستانیوں ہی کے ذریعے بنگال کی حکومت کو چلایا۔

۱۷۶۹ء سے انگلستان کی پارلیمنٹ نے ہندستان کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی۔ حالات کا جائزہ لینے کے لیے تین ہندستانی ماہرین پر مشتمل ایک ڈیلی گیشن بھیجا۔ اس میں وینسی ٹارٹ، فورڈ اور اسکرافٹن شامل تھے۔ یہ ڈیلی گیشن ایک حادثے کی وجہ سے ہندستان نہیں پہنچ سکا۔

مارچ ۱۷۷۳ء میں جب کمپنی نے انگلستان کی پارلیمنٹ سے قرضہ مانگا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پارلیمنٹ نے کمپنی کو چودہ لاکھ پونڈ قرض کی منظوری دی۔ اسی کے ساتھ ایک ریگولیٹنگ ایکٹ نے کمپنی پر کچھ پابندیاں عائد کیں۔ اسی ایکٹ کے مطابق کمپنی کی حکومت میں کچھ آئینی تبدیلیاں بھی آئیں۔ مثلاً

۱۔ ۲۰ ڈائرکٹرز پر مشتمل ایک ڈائرکٹریٹ قائم کی گئی۔ اس کی مدت کارکردگی ۴ سال رکھی۔ ۶ ڈائرکٹر ہر سال ریٹائر ہوتے تھے اور ۶ ڈائرکٹروں کا ہر سال انتخاب کیا جاتا تھا۔ ایک ہزار پونڈ والے حصہ داروں کو الیکشن میں ووٹ دینے کا حق تھا۔

۲۔ فورٹ ولیم پریسی ڈینسی کے لیے ایک گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ اسی کو مدراس اور بمبئی پریسی ڈینسیز کا سرپرست بھی بنایا۔

۳۔ گورنر جنرل کی مدد کے لیے ۴ ممبروں پر مشتمل ایک کونسل قائم کی گئی۔
لیفٹیننٹ جنرل کلیورنگ، کرنل مانسن، بارویل اور فلپ فرانسس اس کونسل کے ممبر تھے۔ مدت کارکردگی پانچ سال مقرر کی گئی۔ ڈائرکٹرز کی سفارش پران ممبروں کو تاج برطانیہ نامزد کرتا تھا۔

۴۔ اس ایکٹ کے تحت کلکتہ میں ایک سپریم کورٹ کا قیام ہوا۔ ایلیجا ایمپے اس کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ ان کی مدد کے لیے تین مددگار ججوں کا تقرر کیا گیا۔

۵۔ تمام عہدیداروں کی تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ گورنر جنرل کی تنخواہ ۲۵ ہزار پونڈ کونسلروں کی تنخواہ دس ہزار پونڈ اور چیف جسٹس کی آٹھ ہزار پونڈ تنخواہ مقرر کی۔

۶۔ گورنر جنرل کی غیر موجودگی میں کونسل کے سینئر ممبر کو قائم مقام گورنر جنرل بنایا جاسکتا تھا۔

۷۔ گورنر جنرل کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے علاقوں کے تمام دیوانی اور فوجداری معاملات کا اختیار دیا گیا۔

۸۔ گورنر جنرل کو بمبئی اور مدراس کی پریسی ڈینسیز کی حکومت چلانے کا بھی اختیار دیا گیا۔ لیکن یہ پریسی ڈینسیز، ڈائرکٹرز کی اجازت حاصل کر کے ضرورت کے مطابق جنگ اور معاہدۂ امن کر سکتی تھیں۔

۹۔ گورنر جنرل اور کونسل کو کورٹ آف ڈائرکٹرز کے احکامات کی پابندی لازمی تھی۔ ڈائرکیٹرز کو کمپنی کے حالات سے مطلع رکھنا اور ۱۴ دن کے اندر خطوط کا جواب دینا ضروری تھا۔ ساتھ ہی مقررہ وقت پر مالیات میں رقم جمع کرنا ضروری تھا۔

ریگولیٹنگ ایکٹ میں حسب ذیل خامیاں تھیں۔

۱۔ اس ایکٹ میں نہ تو بنگال کے نواب کی حیثیت کو واضح کیا گیا اور نہ ہی

انگلستان کے بادشاہ کے کلّی اقتدار کا اعلان کیا تھا۔
۲۔ گورنر جنرل کے مقابلے میں کونسل کو برتری حاصل تھی۔ گورنر جنرل کو صرف کاسٹنگ ووٹ کا اختیار دیا تھا۔ اس سے کونسل اور گورنر جنرل کے اختیار میں ٹکراؤ پیدا ہوا۔
۳۔ بمبئی اور مدراس پریسی ڈینسیز کو ڈائرکٹرز کی اجازت سے آزادانہ کام کرنے کا اختیار دے کر گورنر جنرل کی حیثیت کو کمزور کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے وارن ہیسٹنگز کو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔[۲۵]

پٹس انڈیا ایکٹ، ۱۷۸۴ء کمپنی کے بگڑتے حالات اور بنگال حکومت کی خامیوں سے انگلستان کی پارلیمنٹ کو اس بات کا احساس ہوا کہ کمپنی کی حکومت کے لیے ایک واضح اور مناسب دستور کی بے حد ضرورت ہے۔ ریگولیٹنگ ایکٹ ناقص ثابت ہوا۔ ۱۷۸۳ء میں ایک بار پھر کمپنی کو انگلستان کی پارلیمنٹ سے قرض لینے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ انگلستان کے وزیر اعظم پٹ دی ینگر نے ایکٹ مرتب کر کے پارلیمنٹ میں ۱۷۸۴ء میں پاس کرایا۔ اسی کو پٹس انڈیا ایکٹ کہا جاتا ہے اس ایکٹ کے مطابق تجارتی معاملات کو چھوڑ کر تمام فوجی، سیاسی، دیوانی معاملات انگلستان کی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس ایکٹ کی قرارداد حسب ذیل ہے۔
۱۔ ایک بورڈ آف کنٹرول کی تشکیل کی گئی۔ یہ بورڈ چانسلر آف ایکسچیکر، ایک سکریٹری آف اسٹیٹ اور چار ممبروں پر مشتمل تھا۔ اس بورڈ کا ایک صدر ہوتا تھا۔ پہلا صدر ہینری ڈنڈاز تھا۔ آفس کی مدت تاج برطانیہ کی مرضی پر منحصر تھی۔
۲۔ کمپنی کے تمام دیوانی اور فوجی معاملات پر خط و کتابت بورڈ آف کنٹرول کے سامنے پیش کرنی پڑتی تھی۔
۳۔ تین ڈائرکٹروں کی ایک سیکریٹ کمیٹی بنائی گئی جو رازدارانہ معاملات کی خط و کتابت ڈائرکٹروں کو بتائے بغیر بورڈ آف کنٹرول سے کرتی تھی۔
۴۔ بورڈ آف کنٹرول کے فیصلوں کو بدلنے کا اختیار نہ تو ڈائرکٹرز کو تھا اور نہ ہی کورٹ آف پروپرائٹرز کو۔
۵۔ بورڈ آف کنٹرول کی بیجا مداخلت کے خلاف کمپنی کے ڈائرکٹرز کو بادشاہ

سے اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔

۶۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ممبروں کی تعداد چار سے گھٹا کر تین کر دی گئی۔ جن میں ایک کمانڈر انچیف ہوتا تھا۔ گورنر جنرل کو اب بھی صرف کاسٹنگ ووٹ کا اختیار حاصل تھا۔ مگر لارڈ کارنوالس نے اپنے خصوصی اختیارات کی منظوری کرا کے گورنر جنرل کی حیثیت کو کونسل سے برتر کرا لیا۔ اب گورنر جنرل کونسل کے فیصلوں کی پروا کیے بغیر کام کر سکتا تھا۔ کونسل محض ایک مددگار کونسل رہ گئی۔ کارنوالس خود کمانڈر انچیف بھی تھا۔

۷۔ بمبئی اور مدراس کی پریسی ڈینسیز کو گورنر جنرل کے ماتحت کر دیا گیا۔

۸۔ پریسی ڈینسی کا گورنر اور گورنر کی کونسل تین ممبروں پر مشتمل تھی جس میں ایک کمانڈر ہوتا تھا۔

۹۔ گورنر کی غیر موجودگی میں کمانڈر قائم مقام گورنر ہوتا تھا۔

۱۰۔ اِن تمام عہدیداروں کا تقرّر کورٹ آف ڈائرکٹرز ہی کرتا تھا۔ ڈائرکٹرز یا شہنشاہ برطانیہ کسی بھی عہدیدار کو واپس بلا سکتے تھے۔ تحریری استعفا دینے کی ہدایت تھی۔

۱۱۔ گورنر جنرل کے بعد کمانڈر انچیف کا درجہ تھا۔ گورنر جنرل کی غیر موجودگی میں کونسل کا سینیر ممبر قائم مقام گورنر جنرل بنایا جاتا تھا۔

۱۲۔ بیرونی پالیسی میں توسیعِ سلطنت، اور کمپنی کی حدود بڑھانے کا گورنر جنرل کو حق نہیں تھا۔ تاوقتیکہ کمپنی اجازت نہ دیدے۔

پٹس انڈیا ایکٹ پاس ہونے کے باوجود ڈائرکٹرز کی رائے ہمیشہ اہم رہی۔ کیوں کہ وہ براہ راست ہندستان کے معاملات سے واقفیت رکھتے تھے۔ ۱۸۳۴ء سے ۱۸۳۳ء تک ۵۰ فیصد تجاویز ڈائرکٹرز کی مانی گئیں۔ بورڈ آف کنٹرول اور پارلیمنٹ کے ممبروں سے رسوخ حاصل کر کے ڈائرکٹرز اپنی تجاویز منظور کراتے تھے۔ ہندستان کی حکومت کے عہدیداروں کا تقرّر اب بھی ڈائرکٹرز کے ہاتھ میں تھا۔[۱۵]

ہندستان میں فوج بھیجنے کے معاملے میں اور کچھ عہدیداروں کو مقرر کرنے میں بورڈ آف کنٹرول کے صدر نے اپنے خصوصی اختیارات کا استعمال کیا۔ اس طرح گورنر جنرل کو اندرونی معاملات میں ڈائرکٹرز اور بیرونی معاملات میں بورڈ آف کنٹرول کے صدر کو ہم نوا بنانا پڑتا تھا۔ اس دفتری ثنویت کا سلسلہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے بعد بھی جاری رہا۔

۱۷۹۳ء کے چارٹر میں گورنر جنرل کے کُلّی اختیارات کی تصدیق کردی گئی۔ گورنر جنرل کو اپنی کونسل کا وائس پریسیڈنٹ مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا۔ گورنر جنرل کو سول سرونٹس منتخب کرنے کا بھی اختیار دیا گیا، کمانڈر انچیف کی کونسل سے ممبرشپ ختم کردی گئی۔ بورڈ آف کنٹرول کے عہدیدار اور ممبروں کو ہندستانی آمدنی سے تنخواہیں دی جانے لگیں۔ ۵ لاکھ روپے ہر سال جمع کرنا طے پایا تاکہ قرضے کی ادائگی کی جاسکے۔

۱۸۱۳ء کے چارٹر میں کمپنی کی چین کی تجارت کو چھوڑ کر تمام تجارتی اجارہ داری کو ختم کردیا گیا۔ حکومت کے بجٹ میں ایک لاکھ روپے سالانہ تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے منظور کیا گیا۔ سول سرونٹس کی تربیت کے لیے ادارے کھولنے، بشپ اور آرک بشپ کا تقرر کرنے کا بھی کمپنی کو اختیار دیا گیا۔

۱۸۳۳ء کے چارٹر کے تحت کمپنی کی باقی ماندہ تجارتی اجارہ داری کو بھی ختم کردیا گیا۔ طے پایا کہ کمپنی کے حصے داروں کو ہندستان کی آمدنی کا ساڑھے دس فیصد حصہ ۴۰ سال تک ملتا رہے گا۔ بورڈ آف کنٹرول کے صدر کو ہندستانی معاملات کا وزیر بنا دیا گیا۔ مدد کے لیے دو مددگار کمشنر مقرر کیے گئے۔ ڈائرکٹرز ایکسپرٹ ایڈوائزر کی حیثیت سے مدد کرتے تھے۔ اسی چارٹر کے تحت گورنر جنرل کی کونسل میں ایک قانونی ایکسپرٹ کو ممبر بنایا گیا۔ اور کونسل کو ہندستانی معاملات کے لیے قانون بنانے کا اختیار بھی دے دیا۔

ولیم بینٹنک کی کونسل میں لارڈ میکالے پہلا قانونی ممبر تھا جس نے پہلی بار انڈین پینل کوڈ تیار کیا۔ اس ایکٹ میں یہ بھی اہتمام کیا گیا کہ ہندستانیوں کو تمام عہدوں

پر فائز کیا جائے گا۔ لارڈ مارلے کے مطابق اس لحاظ سے یہ بہت اہم ایکٹ تھا۔ حالانکہ عملی طور پر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ کیتھ کے مطابق منرو مالکوم، ایلفنسٹن، سلیمن، بشپ ہیبر کی نیک خواہشات کے باوجود یہ ایکٹ بھی عملی طور پر ۱۷۹۳ء کی امتیازی پالیسی کو ختم نہ کرسکا جس کے تحت ۵۰۰ پانچسو پونڈ سے زیادہ کے عہدے پر ہندستانیوں کا تقرر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

۱۸۵۳ء کے چارٹر میں گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل اور قانون سازی صیغوں کو الگ الگ کر دیا گیا۔ قانون کے ممبر کو گورنر جنرل کی کونسل کا ممبر بنا دیا گیا۔ صوبوں کو مرکزی قانون ساز مجلس میں پریسی ڈینسی سے ایک ممبر بھیجنے کا حق دیا۔ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو بھی کونسل کا ممبر بنا دیا گیا گورنر جنرل کو یہ اختیار تھا کہ سول سرونٹس میں سے دو ممبروں کو قانون ساز مجلس میں اور نامزد کر سکتا تھا۔

ڈائرکٹروں کی تعداد ۲۴ سے گھٹا کر ۱۸ کر دی گئی۔ ان میں سے ۶ ڈائرکٹرز کو شہنشاہ برطانیہ نامزد کرتا تھا۔ اس ایکٹ سے کمپنی کے اختیارات میں مزید کمی ہوگئی۔[۳۲]

بنگال میں برطانوی حکومت کا استحکام

کلائو رابرٹ کلائو (۱۷۶۵ء۔ ۱۷۶۷ء) کے کارناموں سے متاثر ہو کر کمپنی نے اسے دوبارہ بنگال کا گورنر مقرر کر کے بھیجا۔

۱۷۵۹ء میں کلائو نے انگلستان کے وزیر اعظم سے صوبے بنگال کی حکومت کا انتظام کرنے کی اپیل کی تھی۔ مگر وزیر اعظم نے اس پر توجہ نہیں دی۔ آخر کار کلائو نے بنگال میں دو عملی حکومت قائم کی۔ کلائو نے دو ہندستانی دیوان مقرر کیے۔ بنگال میں محمد رضا خاں اور بہار میں شتاب رائے۔ نواب کی پنشن ۵۳ لاکھ روپے مقرر کی۔ ۱۷۶۶ء میں پنشن کی رقم گھٹا کر ۴۰ لاکھ روپے سالانہ کر دی گئی۔ ۱۷۶۹ء میں صرف ۳۲ لاکھ روپے سالانہ رہ گئی تھی۔
کلائو کی دو عملی حکومت میں ہندستانی عہدیداروں نے صوبے کی آمدنی کا کافی حصہ اپنے پاس رکھ کر حالات کو اور بھی بدتر کر دیا۔

کلائیو نے کمپنی کے معاملات میں کافی اصلاحیں کیں۔ کمپنی کے ملازموں پر تحائف لینے پر پابندی لگائی۔ اس نے خود بھی تحفے لینا بند کر دیے۔ خالی عہدوں پر مدراس پریسی ڈینسی کے تجربہ کار انگریزوں کو فائز کیا۔ نمک کی اجارہ داری کمپنی کے صرف اُن ملازمین کو دی گئی جو نیلام بولی میں زیادہ سے زیادہ بولی لگاتے تھے۔ کمپنی کے افسروں کی تنخواہوں میں اضافہ کیا تاکہ وہ رشوت خوری سے باز آئیں۔ بھتّے کی رقم کم کر دی گئی۔ کلائیو نے بندرگاہوں کے معاملات بھی سُدھار کیے۔

وزیر اعظم پِٹ نے ایک جنرل کی حیثیت سے کلائیو کے کارناموں کی بے حد تعریف کی ہے۔ بقول چارلس وِلسن وہ ایک باہمت شخص تھا۔ لوگوں میں بھروسا پیدا کرنے کی اس میں زبردست صلاحیت تھی۔ دراصل کلائیو اپنے دور کا ریکاڈلی تھا جو کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہر جائز اور ناجائز طریقے کو صحیح سمجھتا تھا۔ وہ اپنے ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے ہاتھ میں تلوار رکھنے کا قائل تھا۔ لیکن بنگال میں دو عملی حکومت کی وجہ سے وہاں کے حالات خراب ہو گئے اور ۱۷۷۰ء میں اتنا بھیانک قحط پڑا کہ انسانی تاریخ میں اس کی دوسری مثال نہیں تھی[۴۵]۔

وارن ہیسٹنگز گورنر ورلسٹ (VERLST) (۱۷۶۷ء - ۱۷۶۹ء) اور گورنر کارٹیر (۱۷۶۹ء - ۱۷۷۲ء) کے زمانے میں حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ۱۷۷۲ء میں وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲ء - ۱۷۸۵ء) کو بنگال کا گورنر مقرر کیا گیا۔ وہ مدراس پریسی ڈینسی کا سینئر ممبر تھا اور کافی عرصے سے ہندستان میں کام کر رہا تھا۔ ۱۷۷۴ء میں جب ریگولیٹنگ ایکٹ پر عمل کیا گیا تو وہی فورٹ ولیم پریسی ڈینسی اور دیگر پریسی ڈینسیز کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔

کمپنی کی ہدایت کے مطابق وارن ہیسٹنگز نے سب سے پہلے دو عملی حکومت کو ختم کیا۔ وارن ہیسٹنگز نے صیغۂ دیوانی براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ محمد رضا خاں اور شتاب رائے کو ڈپٹی دیوان کے عہدوں سے برطرف کیا اور بدعنوانی کے مقدمے چلائے۔ لیکن بعد کو معاف کر دیا گیا۔ وارن ہیسٹنگز نے

ایک بورڈ آف ریونیو قائم کیا جس کو مال گزاری کا کام سپرد کیا گیا۔ بنگال کی راجدھانی مرشد آباد سے منتقل کر کے کلکتہ میں قائم کی گئی۔ وارن ہیسٹنگز نے بنگال کے نواب کی پنشن ۳۲ لاکھ روپے سالانہ سے گھٹا کر ۱۶ لاکھ روپے سالانہ کر دی۔ میر جعفر کی بیوہ منی بیگم کو نابالغ نواب کا وکیل مقرر کیا۔

وارن ہیسٹنگز نے مال گزاری کے محکمے میں کئی تجربے کیے۔ پہلے ۱۷۷۲ء میں زمینداریوں کا ۵ سالہ انتظام کیا گیا۔ اس کے تحت نیلام بولی لگائی جاتی تھی۔ زیادہ بولی لگانے والے کو زمینداریاں ۵ سال کے لیے دے دی جاتی تھیں۔ ۱۷۷۷ء میں وارن ہیسٹنگز نے سال بہ سال زمینداریوں کو نیلام کرنے کا طریقہ اپنایا۔ لگان وصول کرنے اور دیوانی معاملات طے کرنے کے لیے وارن ہیسٹنگز نے انگریز کلکٹروں کا تقرر کیا۔ انگریز کلکٹر ضلع کی عدالتوں میں دیوانی مقدمے طے کرتے تھے اور فوجداری یا جرائم کے مقدمے ہندستانی ججوں کے سپرد کیے گئے۔

وارن ہیسٹنگز نے دو سپریم عدالتیں قائم کیں۔ ایک صدر دیوانی عدالت جس کا گورنر جنرل صدر ہوتا تھا اور اس کے دو ممبر ہوتے تھے۔ اور دوسری سپریم نظامت عدالت جس کا صدر ہندستانی ہوتا تھا۔

وارن ہیسٹنگز نے کمپنی کی تجارت میں بھی اصلاحیں کیں دستک کا طریقہ بند کر دیا گیا۔ زمینداری علاقوں میں متعدد چنگیاں، چنگی وصول کرتی تھیں ان سب کو ختم کر کے صرف پانچ بڑی چنگیاں قائم کی گئیں۔ یعنی بڑے شہر کلکتہ، ہگلی مرشد آباد، پٹنہ اور ڈھاکہ میں چنگیاں قائم کیں۔ تمام چیزوں پر یکساں طور پر ۲ ½ فیصد کسٹم ڈیوٹی مقرر کی۔ نمک، چھالی اور تمباکو پر کمپنی کی اجارہ داری رکھی۔[۵]

بیرونی پالیسی میں وارن ہیسٹنگز نے کمپنی کی ہدایت کے مطابق غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی اور توسیع سلطنت سے گریز کیا۔ لیکن بنگال کی حکومت کی حفاظت اور کمپنی کے تجارتی مفادات کو پیش نظر رکھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وارن ہیسٹنگز نے دشواریوں کے باوجود اپنے ۱۳ سال کے دور میں کمپنی کی حکومت کو ایک مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا تھا۔ وارن ہیسٹنگز پر کچھ الزامات کی بنیاد پر مقدمہ چلایا گیا۔ مگر لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ جب وہ پارلیمنٹ میں داخل ہوتا تو تمام لوگ عزت کا اظہار کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔[۵۶]

نظام مال گزاری

۱۷۶۵ء کے بعد کمپنی کی حکومت کے سامنے جو سب سے مشکل مرحلہ درپیش تھا وہ دیوانی کا انتظام خصوصاً مال گزاری کے نظام کا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے کلائو کی دوعملی حکومت کو ختم کر کے اس میدان میں کئی تجربے کیے۔ لیکن اس کو ناکامی ہوئی۔

کارنوالس کا استمراری بندوبست

لارڈ کارنوالس (۱۷۸۶ء۔ ۱۷۹۳ء) جب گورنر جنرل بن کر آیا تو اس نے وارن ہیسٹنگز کے استحکام سلطنت کے کام کو جاری رکھا۔ خصوصاً اس نے بنگال کے مال گزاری نظام کو مستحکم کیا۔ کارنوالس کو اس کام میں بڑی دقت پیش آئی۔ لگان کے معاملات کو طے کرنے کے لیے زمین پر مالکانہ حقوق کا تعین ضروری تھا۔ جیمس گرانٹ کا خیال تھا کہ زمین پر مالکانہ حقوق حکومت کے ہونے چاہییں۔ جان شور اور کارنوالس کا خیال تھا کہ زمین پر مالکانہ حقوق زمینداروں کے ہونے چاہییں۔ دراصل انگلستان میں زمین پر مالکانہ حقوق زمینداروں ہی کو حاصل تھے۔ مالکانہ حقوق سے مراد یہ ہے کہ زمین کا مالک اپنی زمین کو بیچنے اور گروی رکھنے کا اختیار رکھتا ہو اور اپنی اولاد کو وراثت میں دے سکے۔ جب انگریزوں نے بنگال فتح کیا تو اس وقت تک مغلوں کا منصبداری نظام کافی بدل چکا تھا۔ اس سے انگریزوں کو یہ خیال ہوا کہ ہندستان میں بھی مالکانہ

حقوق زمینداروں ہی کو حاصل ہیں لیکن ہندستان میں مالکانہ حقوق کسانوں کو حاصل تھے۔

حکمراں محض کسانوں کی زمین کے محافظ ہوتے تھے جس کا محنتانہ لگان کی شکل میں لیتے تھے۔ بڑے جاگیردار یا زمیندار حکمرانوں کی طرف سے لگان وصول کرنے کے لیے مقرر کیے جاتے تھے جو بدلتے رہتے تھے۔ مگر بعد کو انھیں وراثتی حقوق حاصل ہو گئے تھے۔ کسان عموماً پیداوار کا ⅓ حصہ حکومت کو لگان کی شکل میں ادا کرتے تھے۔

کارنوالس اور جان شور نے کسانوں کی بجائے زمینداروں کو زمین کا مالک قرار دیا اور طے پایا کہ دس سال کے لیے زمینداروں کو زمینوں کا ٹھیکہ دیا جائے۔ چنانچہ ۱۷۹۰ء میں استمراری بندوبست کا اعلان ہوا۔ کارنوالس کا خیال تھا کہ اس کو مستقل طور پر قائم کر دیا جائے مگر جان شور کے کہنے پر ۱۰ سال کے لیے قائم کیا گیا۔ کارنوالس نے ۱۰ سال کا انتظار نہیں کیا اور ۱۷۹۳ء میں اس طریقے کو مستقل طور پر قائم کر دیا۔

استمراری بندوبست کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ لگان کی کل جمع ہمیشہ کے لیے مقرر کر دی گئی۔ یہ رقم گورنر شجاع (۱۷۲۸ء) کے دور کے مقابلے میں تقریباً دوگنی تھی۔ یعنی لگان کی سالانہ رقم دو کروڑ اڑسٹھ لاکھ نوسو نواسی روپے مقرر کی گئی۔ زمینداروں کو کل جمع کا ۹۰ فیصد یا ۹/۱۰ فیصد حصہ کمپنی سرکار کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ ۱/۱۰ اپنے حصے کی شکل میں رکھ سکتے تھے۔

۲۔ محدود طور پر زمینداروں کو مالکانہ حقوق حاصل تھے۔ لگان ادا نہ ہونے کی صورت میں کسانوں کو زمین سے بے دخل کیا جا سکتا تھا۔ اگر زمیندار مقررہ رقم ادا نہ کریں تو حکومت ان کو زمین سے بے دخل کر سکتی تھی۔

۳۔ مقررہ رقم حاصل کرنے کے بعد حکومت نے دیگر ٹیکس یا نذرانے وصول کرنے کا حق چھوڑ دیا۔

۴۔ کسانوں سے لگان وصول کرنے کی ذمہ داری زمینداروں کی ہو گئی اور حکومت کو اس کام سے بالکل نجات مل گئی۔

۵۔ زمینداروں کو پولیس اور عدالتی ذمّہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا یہ کام برطانوی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

لارڈ کارنوالس کے اِستمراری بندوبست پر مختلف مورّخوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مارشمین نے کارنوالس کے اس کام کو ایک بہت ہی عاقلانہ قدم کہا ہے۔ مگر ہومس اس کو ایک ظالمانہ قدم بتاتے ہیں۔

برطانوی حکومت کے ابتدائی دور میں یقیناً یہ قدم قابلِ تعریف تھا کیوں کہ اس طرح کمپنی ایک بڑی ذمّہ داری سے باآسانی سبکدوش ہو گئی، وقت بھی بچا اور پیسا بھی۔ لگان اس وقت جو زیادہ سے زیادہ لیا جا سکتا تھا وہ مقرّر کر دیا گیا تھا اور حکومت کو سال بہ سال ایک مقرّرہ رقم بغیر کوئی کام کیے مل جاتی تھی۔ اس طرح حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوا۔

اِستمراری بندوبست قائم کر کے کارنوالس نے زمینداروں کا ایک وفادار طبقہ ہندستان میں پیدا کر دیا جو ہمیشہ انگریزوں کا ہمنوا اور دوست رہا۔ ۱۸۵۷ء میں اسی زمیندار طبقے نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اور بقول سیٹن کار "استمراری بندوبست سے مستقبل میں اقتصادی نقصان کا امکان تھا وہ سیاسی فائدے نے برابر کر دیا۔

اس انتظام سے صوبے کی حکومت میں بڑی مضبوطی پیدا ہو گئی۔ ایک یہ فائدہ ہوا کہ زمینداروں اور کسانوں میں بھروسا پیدا ہو گیا۔ اور انھیں یہ یقین ہو گیا کہ اگر وہ محنت کر کے پیداوار کرتے رہے اور لگان وقت پر ادا کرتے رہے تو ان کی زمینوں کو چھینا نہیں جائے گا۔ رمیش دت اس بندوبست کو کسانوں کے حق میں ایک انصافانہ قدم بتاتے ہیں۔[۲]

اِستمراری بندوبست کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ مستقبل میں حکومت لگان نہیں بڑھا سکتی تھی۔ زراعت کو فروغ دینے کی ذمہ داری بھلا کر صرف مقررہ آمدنی پر نظر رکھی گئی۔

اس بندوبست سے بڑے بڑے زمینداروں کو تو بہت فائدہ ہوا۔ کیوں کہ وہ کسانوں سے من مانی رقم لگان کی شکل میں اور دیگر ٹیکسوں کی شکل میں وصول کر لیتے

تھے مگر زمینداروں پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی ۔ لیکن چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کسانوں کو اس بندوبست سے نقصان ہوا ۔ بڑے بڑے زمینداروں کے ظلم کی وجہ سے اور لگان ادا نہ کر پانے کی وجہ سے انھیں اپنی زمینیں بیچنی پڑیں اور وہ شہروں میں جاکر مزدوری کرنے لگے ۔ نئے زمیداروں کو کسانوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی کیونکہ اب نئے زمیندار زیادہ تر تجارتی طبقے سے تعلق رکھتے تھے ۔

حکومت نے کسانوں کی حفاظت کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا تھا اس لیے کسان کو زمینداروں کے ظلم کا شکار ہونا پڑا ۔ ۱۸۵۸ء کے بعد کسانوں کی حفاظت کے لیے کچھ قانون بنائے گئے ۔

رعیّت واری بندوبست

کارنوالس نے جب بنگال میں استمراری بندوبست قائم کیا تو اس وقت شمالی مدراس اور بمبئی کی زمینداریوں میں بھی اسی طریقے کو رائج کر دیا گیا ۔ ولزلی اور لارڈ ہیسٹنگز کی توسیع سلطنت کی پالیسی کی وجہ سے ۱۸۱۸ء تک پورے ہندستان میں برطانوی حکومت قائم ہو گئی ۔ مراٹھوں کی حکومت ختم کرنے کے بعد مغربی ہند کے علاقے بمبئی پریسی ڈینسی میں شامل کر لیے گئے ۔ ٹیپو سلطان کی ہار کے بعد میسور کے علاقے اور کرناٹک مدراس پریسی ڈینسی میں شامل ہو گئے ۔ اودھ کے الحاق اور پنجاب کی فتح کے بعد ایک نئی پریسی ڈینسی نارتھ ویسٹ پروونسز وجود میں آ گئی تھی ۔

اب کمپنی کے سامنے یہ سوال تھا کہ ہندستان کے دیگر علاقوں میں کس طرح کا مال گزاری نظام قائم کیا جائے ۔ ایک گروپ کارنوالس کے استمراری بندوبست ہی کو ترجیح دیتا تھا ۔ کچھ علاقوں میں ایسا کیا بھی گیا ۔ مگر لارڈ ہیسٹنگز کے دور میں جب تھومس منرو مدراس پریسی ڈینسی کا گورنر بنا تو اس نے کارنوالس کے استمراری بندوبست کو رد کر دیا ۔ اور ۲۲-۱۸۲۰ء میں اس نے براہِ راست کسانوں سے لگان وصول کرنے کا معاہدہ کیا ۔ اسی معاہدے کو رعیّت واری بندوبست کہتے ہیں ۔

اس بندوبست کے تحت حکومت کے افسر زمین کی کاشت کے ہر پہلو کو بڑی محنت سے جانچتے تھے۔ بغیر سینچائی والی زمینوں کی کُل پیداوار کا ۳۳ فیصد حصہ کسانوں کو لگان کی شکل میں حکومت کو دینا ہوتا تھا اور سینچائی والی زمینوں کی کُل پیداوار کا ۵۰ فیصد حصہ دینا پڑتا تھا۔ ۲۰ سال یا ۳۰ سال بعد سیٹلمینٹ آفیسر زمین کی دوبارہ جانچ کرتا تھا۔ اس سے حکومت کے لگان میں اضافہ کا امکان رہتا تھا۔ کسان کو اس کے تحت مالکانہ حقوق حاصل تھے۔ رعیت واری بندوبست دکنی مدراس بمبئی، برار، مشرقی پنجاب، آسام اور کُرگ کے کچھ علاقوں میں قائم کیا گیا تھا۔ ۲۸-۱۸۲۷ء تک ہندوستان میں ۵۲ فیصد علاقے میں رعیت واری بندوبست قائم ہو گیا تھا۔ لگان وصول کرنے میں بارش کی کمی قحط اور سیلاب کی وجہ سے لچک رکھی جاتی تھی۔ لیکن لگان کی وصولیابی میں حکومت بہت سختی کرتی تھی۔

محال واری بندوبست

شمال مغربی صوبے کے قیام کے بعد، اودھ کے الحاق اور تعلقداری ختم کرنے کے بعد اس صوبے میں بھی مال گزاری کے نظام کا مسئلہ درپیش ہوا۔ یہاں بھی کافی عرصے تک استمراری بندوبست قائم کرنے پر غور کیا گیا۔ لیکن بعد کو یہ خیال چھوڑ دیا گیا۔ یہاں حکومت نے کسانوں کے ایک گروہ یا کسی خاص علاقے سے جس کو محال کہتے ہیں لگان کا معاہدہ کیا۔ یہ کسانوں کا گروہ حکومت کا مقررہ لگان یعنی بغیر سینچائی والی زمینوں پر پیداوار کا ۳۳ فیصد حصہ یا سینچائی والی زمینوں پر پیداوار کا ۵۰ فیصد جمع کر کے حکومت کو ادا کر دیتے تھے۔ ہر ۲۰ یا ۳۰ سال کے بعد زمین کی کاشت کی جانچ ہوتی تھی اور پیداوار کے مطابق لگان مقرر کر دیا جاتا تھا۔ گانو کا مقدم اس کام میں مدد کرتا تھا۔ اسی طریقے کو محال واری بندوبست کہتے ہیں۔

۱۸۳۳ء کے ریگولیشن کے تحت پہلے اس کو اودھ کے علاقے میں جو برطانوی حکومت کو دے دیے گئے اور بعد کو پنجاب میں اس طریقے کو اپنایا گیا۔

رعیت واری بندوبست اور محال واری بندوبست کئی اعتبار سے استمراری بندوبست کے مقابلے میں بہتر تھے۔ کسان، زمینداروں کے ظلم سے بچ گئے۔ اور کسانوں کو مالکانہ حقوق حاصل ہو گئے۔ کسانوں کو محنت کر کے پیداوار بڑھانے کا موقع حاصل تھا۔ لیکن حکومت لگان وصول کرنے میں سختی کرتی تھی۔

عدالتی نظام وارن ہیسٹنگز نے دو سطح پر عدالتیں قائم کی تھیں۔ لارڈ کارنوالس نے عدالت کے محکمے میں مزید اضافے کر کے وارن ہیسٹنگز کے کام کو مکمل کیا۔ ۳ دسمبر ۱۷۹۰ء میں ایک ریگولیشن پاس کیا جس کے تحت ۱۷۹۳ء میں چار سطحوں پر عدالتیں قائم کی گئیں (۱) اوّل تحصیل کی سطح پر عدالتیں چھوٹے چھوٹے قرضوں کے مقدمے طے کرتی تھیں۔ ہندستانی کمشنر ان مقدموں کو طے کرتے تھے۔ (۲) ضلع کی سطح پر شہری عدالتیں قائم کی گئیں۔ ان عدالتوں کے جج انگریز ہوتے تھے۔ (۳) چار صوبجاتی عدالتیں قائم کی گئیں۔ ان کے بھی جج انگریز ہوتے تھے۔ (۴) اور مرکزی سطح پر صدر دیوانی عدالت قائم کی گئی۔ اس عدالت کا صدر خود گورنر جنرل ہوتا تھا۔

اسی طرح ہر سطح پر فوجداری عدالتیں قائم کی گئی تھیں اور مرکز میں صدر نظامت عدالت قائم کی گئی تھی۔ وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں ہندستانیوں کو اونچے اونچے عہدوں پر فائز کیا جاتا تھا۔ خصوصاً فوجداری کے مقدموں میں سزا دینے میں ہندستانی روایات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن کارنوالس نے اونچے اونچے عہدوں پر انگریزوں کو مقرر کیا اور ہندستانیوں پر بھروسا نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر برطانوی حکومت کو محفوظ رکھنا ہے تو ہندستانیوں پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ ولیم بینٹنک کے زمانے میں تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد یہی عدالتی نظام ہندستان میں قائم رہا۔

پولیس کا محکمہ جرموں کی پیش بندی اور مجرموں کو پکڑنے کے لیے لارڈ کارنوالس نے ۱۷۹۲ء میں پہلی بار ہندستان میں پولیس کا محکمہ قائم کیا۔ اس سے پیشتر مجرموں کو پکڑنے اور انھیں سزائیں دینے کی

ذمہ داری زمینداروں کی تھی۔ کارنوالس نے ہر ضلع کو تھانوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر تھانے کا ایک داروغہ یا تھانیدار ہوتا تھا۔ یہ تھانے براہِ راست ضلع جج کے ماتحت ہوتے تھے۔ ۱۸۰۸ء میں تین ضلعوں میں پولیس کے سپرنٹینڈنیٹ مقرر کیے گئے۔ ۱۸۲۷ء میں یہ طریقہ تمام صوبوں میں رائج کر دیا گیا۔ خصوصاً پولیس کا محکمہ ڈکیتی کی وارداتیں کم کرنے اور ڈاکوؤں کو پکڑنے میں بہت کارگر ثابت ہوا۔ آخر وقت تک کچھ تبدیلیوں کے ساتھ پولیس نظام اسی طرح برقرار رہا۔[۸]

۱۔ اے۔ بی۔ کیتھ، اے کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا، ص ص۔ ۱۔ ۱۵۹
سرجان ولیم کے، ایڈمنسٹریشن آف ایسٹ انڈیا کمپنی

۲۔ پی۔ ای۔ رابرٹ، ہسٹری آف انڈیا، ص ص۔ ۱۸۱۔ ۱۸۳

۳۔ کیتھ، مذکورہ بالا

۴۔ رابرٹ، مذکورہ بالا

۵۔ ایضاً، پینڈرل مُون، وارن ہیسٹنگز

۶۔ رمیش دت، اکنامک ہسٹری آف انڈیا، جلد اوّل، ص ص۔ ۵۹۔ ۶۴

۷۔ ایضاً

۸۔ رابرٹ، مذکورہ بالا

باب - ۸

ولیم بینٹنک کی سماجی اصلاحات

عوام کی فلاح و بہبود، ملک کی ترقی اور ملک میں امن وامان قائم رکھنا ایک اچھی حکومت کا فرضِ اوّلین ہوتا ہے۔

۱۸۱۸ء کے بعد جب پورے ہندستان پر انگریزوں کا سیاسی تسلّط قائم ہوگیا اور انھیں سیاسی معاملات سے فرصت ملی تو سماجی اصلاح پر توجہ کی ۱۹ویں صدی کے شروع میں ولبرفورس نے ہندستانی عوام کی فلاح بہبودی کی طرف برطانوی حکومت کی توجہ دلائی تھی۔ اس کے نتیجے میں مشنریوں کو اصلاحی کام، انگریزی تعلیم کے فروغ اور عیسائی مذہب کو تبلیغ کی اجازت مل گئی تھی۔

متعدد انگریزوں نے اور خصوصاً ولیم بینٹنک نے ہندستانی سماج کی برائیوں کو دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ وہ یہاں کے رسم و رواج کو دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ ہندستانی سماج میں ذات پات کی تفریق کے علاوہ لڑکیوں کو پیدائش کے بعد مار ڈالنا یا بچپن ہی میں شادی کر دینا، شوہر کے انتقال کے بعد ستی کی رسم ادا کرنا شادی میں بے انتہا جہیز دینا۔ ٹھگی، ڈکیتی وغیرہ ان تمام برائیوں نے آخرکار انگریز حکمرانوں کو سماجی اصلاحات کی طرف راغب کیا۔ بظاہر انھوں نے محسوس کیا کہ یہ تمام برائیاں یہاں کے فرسودہ عقائد کی وجہ سے ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ بھی ضروری

سمجھی۔

صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان میں بھی اصلاحات کا دور دورہ تھا۔ آدم اسمتھ کی کتاب "ویلتھ آف نیشنس" نے اقتصادی اور سماجی معاملات میں انفرادی آزادی کے اصول کی تبلیغ کی تھی۔ بنتھم، جیمس مِل، رُوسو اور والٹیر کے خیالات کا اثر یہ ہوا تھا کہ برطانوی حکمراں یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ہندستانی سماج کی اصلاح اور ترقی بھی ان کا فرض ہے۔ لارڈ ہیسٹنگز اور ولیم بنٹنک انگلستان کے لبرل گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ولیم بنٹنک کے ساتھی بہت قابل اور با صلاحیت تھے۔ اِدھر ہندستانیوں کو بھی اپنے سماج کی بُرائیوں کا احساس ہو چلا تھا۔ راجا رام موہن رائے پہلے ہی اس جانب پیش قدمی کر چکے تھے۔ اس طرح ولیم بنٹنک کو سماجی اصلاحات کرنے کے لیے ہموار زمین مل گئی۔

ستی کی رسم کا انسداد

ہندستان میں ستی کی رسم پُرانی تھی۔ اس رسم کے مطابق بیوی کو اپنے شوہر کے انتقال کے بعد شوہر کی ہی چتا میں جلنا پڑتا تھا۔ چوں کہ ہندو ستی کو ایک مذہبی فریضے کے طور پر مانتے تھے اس لیے اس میں غیر قوم کے حکمراں کی دخل اندازی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ یہ رسم عموماً اونچی ذات کے لوگوں میں تھی۔ لیکن چھوٹی ذات کے لوگ بھی یہی کرنے لگے۔ مغلوں نے اس رسم کو بند کرنے کی کوشش کی۔ اکبر نیز اورنگ زیب نے مغلیہ حدود میں ستی کی رسم کو ممنوع قرار دیا تھا۔

۱۷۸۰ء میں مارواڑ کے راجا اجیت سنگھ کے انتقال کے بعد ان کی ۶۴ بیویوں نے ستی کی رسم ادا کی۔ سچیت سنگھ کے انتقال کے بعد ان کی دس بیویوں اور ۳۰۰ داشتاؤں نے ستی کی رسم ادا کی۔ ۱۸۰۳ء میں ۴۳۸ عورتوں نے ستی کی رسم ادا کی۔

ولیم بنٹنک سے پہلے ولزلی نے بھی اس رسم کو روکنے کی کوشش کی مگر کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا۔ ۱۷۸۹ء میں شاہ آباد کے کلکٹر برکس نے بڑی سختی

سے ایک عورت کو جلنے سے روکا۔ گیا (بہار) کے کلکٹر نے ۱۸۰۵ء میں ایک ۱۲ سال کی بچّی کو جلنے سے بچایا۔ لارڈ ہیسٹنگز اور لارڈ ایمہرسٹ بھی اس رسم کو غلط سمجھتے تھے۔ لیکن بغاوت کے ڈر سے انھوں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ راجا رام موہن رائے نے بھی اس کے خلاف تحریک شروع کی تھی لیکن وہ بھی قانون کے ذریعے اس پر پابندی لگانے کے حق میں نہیں تھے۔ ولیم بینٹنک نے بغاوت کی پروا نہیں کی اور ۴ دسمبر ۱۸۲۹ء میں ایک قانون پاس کرکے ستی کی رسم کو جرم قرار دے دیا۔

ٹھگی اور ڈکیتی کا انسداد

ہندستان کے کچھ علاقوں میں ٹھگی بہت عام ہو گئی تھی۔ خصوصاً شمالی ہند میں ٹھگ یا پھانسی دار ایک خاص قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا یہ خاندانی پیشہ تھا۔ یہ لوگ ایک گروہ میں کام کرتے تھے۔ سب کالی دیوی کی قسم لیتے تھے کہ وہ اس کام کو ایمانداری اور وفاداری سے کریں گے۔ علاقے کے زمیندار بھی پشت پناہی کرتے تھے۔ کیوں کہ مالِ غنیمت کا کچھ حصّہ انھیں بھی ملتا تھا۔ ولیم بینٹنک نے ٹھگی بند کرنے کو ایک الگ محکمہ قائم کیا اور کرنل سلیمن کو اس کا انچارج بنایا۔

کرنل سلیمن نے پہلے پوری طرح چھان بین کی۔ یہ کام بڑی منصوبہ بندی سے کیا جاتا تھا۔ گروہ کے ہر شخص کو کام تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ کچھ لوگ مسافر کو بہکا کر لاتے تھے۔ کچھ قبر تیار کرتے تھے اور کچھ لوگ گلا گھونٹنے کے ماہر ہوتے تھے جو صرف ایک رومال سے کام کر دیتے تھے۔ ۲۷۴ ٹھگ جو گرفتار ہوئے اور سرکاری گواہ بنے ان میں سے ایک نے اقرار کیا کہ ۴۰ سال کے عرصے میں اس نے ۹۳۱ قتل کیے۔ دوسرے نے اقرار کیا کہ ۲۰ سال کے عرصے میں ۵۰۸ قتل کیے۔ ۱۸۳۶ء میں آخر کار ٹھگی کو جرم قرار دے دیا۔

لڑکیوں اور میریا بچّوں کی قربانی کا انسداد

میریا بچّوں کی قربانی کی رسم اڑیسہ کے کچھ قبیلوں میں کی

جاتی تھی۔ یہ قربانی زرخیزی کی دیوی کو خوش کرنے کے لیے کی جاتی تھی۔ یہ لوگ کسی دوسرے علاقے کی لڑکی کو پکڑ لاتے تھے اور اسے اپنے مذہبی پیشوا کے یہاں رکھ دیتے تھے۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ رہتی تھی تاوقتیکہ اس کے اولاد نہ ہو جائے۔ ان بچوں کو بڑے پیار محبت سے پالا جاتا تھا۔ جب بچے قربانی کے قابل ہو جاتے تھے تو دوسرے قبیلے یا گانو کے اسی طرح کے بچوں سے بدل لیا جاتا تھا تاکہ پیار مانع نہ آئے۔ قربانی سب کے سامنے ہوتی تھی۔ بچوں کو کاٹ کر کسان گوشت کا ٹکڑا اپنے اپنے کھیتوں میں دبا دیتے تھے۔ کیمپ بیل کو اس کام پر تعینات کیا گیا۔ اس نے بہت مشکل سے ان لوگوں کو بچوں کی جگہ بھینسے کی قربانی کرنے پر آمادہ کیا۔

اسی طرح چھوٹی لڑکیوں کو مارنے کی رسم مرکزی اور مغربی ہندستان میں بہت زیادہ تھی۔ راجپوتانہ میں یہ کام خود مائیں کرتی تھیں۔ دودھ پینے والے بچے کو زہر لگا کر دودھ پلا کر مار دیتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ لڑکیوں کی پیدائش شروع ہی سے معیوب سمجھی جاتی تھی۔ اوّل تو ان کی شادی مشکل سے ہوتی تھی۔ دوم جہیز دینا پڑتا تھا۔ اس سلسلے میں بھی برطانوی حکومت نے کچھ اصلاحیں کیں۔ لڑکیوں کی شادی کے لیے فنڈ جمع کیے اور جہیز کا مسئلہ حل کیا۔

انگریزی تعلیم کا فروغ

اب تک انگریزوں نے مغربی تعلیم کے فروغ پر توجہ نہیں دی تھی۔ ۱۸۱۳ء میں چارٹر کے مطابق بجٹ میں ایک لاکھ روپے سالانہ تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے دیا گیا تھا۔ لیکن یہ روپیا صرف دیسی تعلیم یعنی اورینٹل ایجوکیشن پر خرچ کرنے کے لیے دیا تھا۔ انگریزی تعلیم کے فروغ میں تھوڑا بہت کام مشنریوں نے کیا تھا۔ ولیم بنٹنک کے دور میں پہلی بار لارڈ میکالے کی تجویز پر یہ پاس کیا گیا کہ ہندستانیوں کو انگریزی تعلیم دی جائے۔ میکالے اور بنٹنک کا خیال تھا کہ اس تعلیم کو حاصل کر کے ہندستانی خاطر خواہ ترقی کر سکیں گے۔ میکالے کا یہ خیال بلکہ پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔ میکالے کے منٹس کے چند جملے حسب ذیل ہیں:

"HAVING BECOME INSTRUCTED IN EUROPEAN KNOWLEDGE, THEY MAY IN SOME FUTURE AGE DEMAND EUROPEAN INSTITUTION. WHETHER SUCH A DAY WILL EVER COME I KNOW NOT AND WHENEVER IT COMES IT WILL BE THE PROUDEST DAY IN ENGLISH HISTORY"

ولیم بنٹنک نے جو کام شروع کیا اس کے ساتھیوں نے مدد کی اس کے جانشینوں نے اسے جاری رکھا۔ بہت سی سماجی بُرائیوں کو ڈلہوزی کے زمانے تک دور کرنے کی کوشش جاری رہی۔ انگریزی تعلیم کا فروغ شروع ہوا تو ۱۸۵۷ء تک تین پریسی ڈینسیز میں یونی ورسٹیاں قائم ہوگئیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ولیم بنٹنک نے ایک نئے دور کو جنم دیا۔ ایک نئے رویے کی ابتدا کی جو اس کے جانے کے بعد بھی جاری رہا۔

ا؎ اس باب کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ کیجیے

پی۔ ای۔ رابرٹ، ہسٹری آف انڈیا

ڈوڈویل، شورٹر کیمبرج ہسٹری آف انڈیا

این۔ کے۔ بوس، دی اویکننگ اِن بنگال

باب - ۹

۱۹ویں صدی کے نصفِ اوّل میں اصلاحی تحریکیں، مذہبی و سماجی

راجا رام موہن رائے اور برہمو سماج تحریک

نشاۃِ ثانیہ نے یورپ کے سماج کو نیا ذہن اور زندگی دی۔ ہندستان میں نشاۃِ ثانیہ تقریباً چار سو سال کے بعد شروع ہوئی۔ ہندستان کے نشاۃِ ثانیہ میں مغربی خیالات محرک ہوئے۔ مذہب اور کلچر کو بھی اسی روشنی میں پرکھا گیا۔

ہندستان میں ۱۹ ویں صدی کی نشاۃ ثانیہ کا بانی راجا رام موہن رائے کو سمجھا جاتا ہے۔ مورخ ایچ۔ سی۔ سرکار راجا رام ہی کو جدید دور کا بانی مانتے ہیں۔ راجا رام موہن رائے (۱۷۷۲ء۔ ۱۸۳۳ء) ۲۲ مئی ۱۷۷۲ء میں رادھانگر بنگال کے ایک اونچے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت، انگریزی اور دیگر زبانوں پر عبور حاصل کیا تھا۔ ہندو، اسلام بدھ اور عیسائی مذہب کا مطالعہ کیا تھا۔

۱۷۸۸ء میں والد رام کانت رائے سے اختلافات ہونے کی وجہ سے تبت گئے وہاں بدھ مذہب کے لاماؤں سے مناظرے ہوئے۔ بحث میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر وہاں کی عورتوں نے راجا رام موہن رائے کو بچایا۔ اسی وقت سے راجا رام موہن رائے کے دل میں عورتوں سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ وہاں سے واپسی پر وہ بنارس گئے۔ وہاں انھوں نے سنسکرت پڑھی اور ہندو مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔

۱۸۰۳ء میں والد کے انتقال کے بعد دیوان کی حیثیت سے انگریزی حکومت کی نوکری اختیار کی۔ ۱۸۰۹ء میں ڈِگبی کی ماتحتی میں سرشتہ دار کی جگہ ملی۔ انگریزی اور ہیبرو زبان پڑھی۔ بائیبل کا مطالعہ کیا اور اس طرح عیسائی مذہب کے اخلاقی پہلوؤں سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے ایک کتاب یسوع مسیح کے فرمان انگریزی میں لکھی۔

مختلف مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد راجا رام موہن رائے کو ہندو سماج کی برائیاں صاف نظر آنے لگیں۔ ہندو سماج میں عورتوں کی خراب حالت اور ذات پات کے طریقے کو بدلنے کے لیے فکرمند تھے۔ راجا رام کی برہمو سماج کی تحریک ایک ہمہ گیر تحریک تھی جس نے زندگی کے ہر پہلو پر اپنی چھاپ چھوڑی تھی۔

مذہبی اصلاحیں

۱۸۱۵ء میں راجا رام موہن رائے نے ایک آتمیا سبھا قائم کی جس میں ہر مذہب اور ہر قوم کے لوگ شامل ہوسکتے تھے۔ اور آپس میں بحثیں کرسکتے تھے۔ اسی زمانے میں راجا رام موہن رائے نے وید اور اپنشد کا بنگالی میں ترجمہ کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عوام براہِ راست یہ مذہبی کتابیں پڑھ سکیں اور مذہب کے اصل مطالب کو سمجھ سکیں۔ راجا رام مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندو مذہب ایک خدا کی عبادت میں یقین رکھتا ہے۔ بتوں کی پوجا کرنا، توہم پرستی اور بیجا رسم و رواج کا اصل مذہب سے کوئی تعلق نہیں اسی لیے راجا رام موہن رائے نے ایک کتاب تحفۃ المواحدین بھی لکھی۔

۲۰ اگست ۱۸۲۸ء میں راجا رام نے برہمو سماج قائم کیا۔ اس میں ہر مذہب اور ذات کے لوگ شامل ہوسکتے تھے۔ اور سب ایک خدا کی عبادت کرتے تھے۔ بُت پرستی ممنوع تھی۔ ہر سنیچر کو سبھا کی میٹنگ ہوتی تھی۔ ویدوں اور اُپنشدوں کے کچھ حصے پڑھے جاتے تھے۔ بھجن گائے جاتے

تھے۔ قربانی کرنا، چڑھاوا، شراب پینا اور گوشت کھانا ممنوع تھا۔ اس مذہب کے ماننے والوں کے لیے ایک خاص ڈریس لازمی قرار دیا تھا۔ متوسط طبقے کے لوگ کافی تعداد میں اس مذہب میں شامل ہو گئے۔ ۲۷ ستمبر ۱۸۳۳ء میں راجا رام موہن رائے کا انگلینڈ ہی میں انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد برہمو سماج کو کیشپ چندر سین نے جاری رکھا۔ لیکن اس زمانے میں برہمو سماج میں عیسائیت کا عنصر غالب ہو گیا۔ اسی انداز پر بمبئی میں بھی پرارتھنا سماج شروع کیا گیا۔ یہ محض اصلاحی تحریکیں تھیں۔

سماجی اصلاحیں

راجا رام موہن رائے کا سب سے بڑا کارنامہ ستی کی رسم کے خلاف تحریک چلانا تھا۔ ان کے بھائی جگ موہن کا جب ۱۸۱۱ء میں انتقال ہوا تو ان کی بیوی کو ستی کی رسم ادا کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ راجا رام نے بہت سمجھایا انھوں نے مذہبی کتابوں کے حوالے دیے مگر لوگوں نے پروا نہیں کی اور انھیں چتا کے حوالے کر دیا۔ جب راجا رام کی بھابی بہت چیخیں تو شور مچا کر ان کی چیخوں کو دبا دیا اور انھیں چتا میں ڈھکیل دیا۔ اسی وقت سے راجا رام موہن رائے نے پُر زور طریقے سے ستی کی رسم کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں گورنر جنرل ولیم بنٹنک ستی کی رسم کے خلاف قانون بنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے راجا رام سے بھی مشورہ لیا۔ حالاں کہ راجا رام قانون کے ذریعہ ستی کی رسم ختم کرنے کے بجائے لوگوں کو سمجھا کر اس رسم کو ختم کرنے کے حق میں تھے لیکن ۴ دسمبر ۱۸۲۹ء کو بینٹنک نے قانون پاس کر کے ستی کی رسم کو جرم قرار دے دیا۔

راجا رام نے کئی شادیاں کرنے اور چھوٹی عمر میں شادی کرنے کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ عورتوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔ انھوں نے ہندوؤں میں ذات پات کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔

انھوں نے کہا کہ انسان کی برتری اور کمتری اس کی صلاحیت پر منحصر ہونی

چاہیے نہ کہ محض پیدائش کے حادثے پر، مذہبی رسموں نے نیچی ذاتوں کو بڑے بڑے کام کرنے کے قابل نہیں رکھا ہے۔ اور ذات پات کی تفریق نے وطن پرستی کے جذبے کو زبردست ٹھیس پہنچائی۔

راجا رام نے ہندستانیوں کو انگریزی اور مغربی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے ڈیوڈ ہیرے کی مدد سے ۱۸۱۷ء میں ہندو کالج کھلوایا۔ ۱۸۲۵۔۱۸۲۶ء میں ویدانت کالج قائم کیا۔ جہاں ہندستانی تعلیم کے علاوہ انگریزی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

۱۸۲۳ء میں راجا رام نے پریس کی پابندی پر احتجاج کیا اور پریس آرڈیننس کے خلاف سپریم کورٹ میں عرضی پیش کی۔ یہ پہلا دستوری احتجاج تھا جس کے تحت انھوں نے آزادئ رائے کی مانگ کی تھی۔ اپنے بنیادی حقوق کا دعوا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندستانی بھی دیگر ملک کے رہنے والوں کی طرح حق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے راجا رام موہن رائے کو سیاسی تحریک کا بانی کہا جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ اور سیّد احمد بریلوی کی اصلاحی تحریک

حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء۔ ۱۷۶۲ء) دہلی کے قریب قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحب سے پائی۔ حضرت محمد افضل سیالکوٹی سے کتب حدیث کی تکمیل کر کے سند حاصل کی۔ یوں تو آپ کا تعلق فقہ میں حنفی مکتبِ خیال سے اور تصوّف میں مجدّد شاخ کے نقشبندی سلسلے سے تھا لیکن آپ کی یہ مسلسل کوشش رہی کہ سُنّی مذاہب فقہ کے اختلافات اور صوفیانہ نظریوں کے فرق کو ختم کر کے ایک نقطۂ عدل تک لایا جائے۔ چنانچہ آپ کی تصنیف "فیصلۂ وحدت الوجود و وحدت الشہود" دو مختلف صوفی نظریوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اسی طرح آپ کی دوسری مشہور تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" حنفی اسکول کے نظریے اور عمل میں تطابق اور دوسرے مکاتبِ خیال

سے مطابقت پیدا کرنے کا ایک روشن ثبوت ہے۔

شاہ ولی اللہ جب پیدا ہوئے تو مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ مذہبی پیچیدگیاں بڑھ گئیں تھیں اور سیاسی اور سماجی حالات ابتر تھے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کے حالات اور بھی زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ تقریباً تمام مغل سلاطین امرا کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بنے رہے۔ بادشاہوں کی کوتاہ اندیشی، عیش پرستی اور پست ہمتی نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا۔ ملک کے طول و عرض میں باغیانہ قوتیں کام کرنے لگیں۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔

سیاسی حالات کا اتار اور چڑھاو امرا کے رحم و کرم پر تھا جو مختلف گروہوں میں تقسیم تھے۔ اور ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے۔ صوبائی حکومتیں خود مختار ہو گئیں، مرہٹہ، جاٹ اور سکھوں کی ریشہ دوانیاں بڑھنے لگیں۔ خصوصاً مرہٹے مغلیہ سلطنت کو ختم کر کے مرکز میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔

اس سیاسی ابتری نے شاہ ولی اللہ کو ملک کی سیاست میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے ایک صاف ذہن مورخ کی طرح مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب اقتصادی بدنظمی اور بدحالی قرار دیا۔ آپ نے بتایا کہ حکومت کے خزانے پر ناکارہ لوگوں کا ناجائز بوجھ ہے۔ دوسری وجہ یہ بتائی کہ حکومت کسانوں سے اور عوام سے ناجائز ٹیکس وصول کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے عوام میں معاشی ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ عدم ادائگی کی صورت میں ان پر ظلم و جبر کیا جاتا ہے اور اسی لیے غیر وفاداری، خود غرضی، موقع پرستی، بے ایمانی اور بدکرداری کا دور دورہ ہے۔

اپنے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے شاہ ولی اللہ نے تحریر و تقریر کے ساتھ عملی اقدامات بھی کیے۔ قوم کے اندازِ فکر اور زاویۂ نگاہ کو بدلنے کی کوشش کی۔ قرآن شریف کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ (بعد کو اُن کے بیٹے عبدالقادر نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں بھی کیا) انھوں نے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی ہر ممکن

کوشش کی۔

حکومت کی برائیوں کو دور کرنے کے لیے پہلے تو براہِ راست بادشاہ، وزیر امرا اور سپاہیوں کو نصیحتیں فرمائیں اور ان کے فرائض ان پر واضح کیے۔ امرا میں سب سے زیادہ عقلمند نظام الملک تھے۔ انھوں نے نظام الملک کو خطوط لکھے اور انھیں آمادہ کیا کہ وہ مرکزی حکومت کی وزارت کو سنبھال کر حکومت کی ابتر تنظیم کو سنوار دیں۔ نظام الملک نے شاہ صاحب کی مرضی کے مطابق اصلاحات کا منصوبہ پیش کیا۔ لیکن بادشاہ نے اس منصوبے پر عمل نہیں کیا۔ مجبوراً نظام الملک کو مرکز چھوڑ کر حیدر آباد جانا پڑا۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ نے نجیب الدولہ کو خط لکھے۔ ۱۷۵۶ء میں ملہار راو ہولکر اور رگھوناتھ راو شمالی ہندستان کی طرف مرہٹہ حکومت قائم کرنے کے لیے بڑی طاقت کے ساتھ رونما ہوئے اور جاٹ، سکھ اور باغی مسلم امرا سے دوستی کر کے نجیب الدولہ کو ناکام کر دیا۔

اس کے بعد شاہ ولی اللہ کی نظر احمد شاہ ابدالی کی طرف گئی۔ آپ نے یہ آخری بار کوشش کی اور ابدالی کو مغلیہ حکومت کے زبوں حالات کے بارے میں تحریر کیا۔ یہ بھی نصیحت کی کہ وہ نادر شاہ کی طرح تباہی و بربادی نہ پھیلائے بغیر قصور کے کسی کو نہ ستائے۔ صرف باغی عناصر پر توجہ دے۔ چنانچہ شاہ ابدالی آیا اور ہندستان کے باغی عناصر پر ضرب کاری لگائی۔

بعض مبصرین کے نزدیک شاہ ولی اللہ کا یہ قدم یعنی شاہ ابدالی سے امداد طلب کرنا نامناسب تھا۔ بعض لوگ اسے وطن پرستی کے منافی سمجھتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ شاہ صاحب کا مقصد ہندستان پر ابدالی کا تسلّط قائم کرانا نہیں تھا بلکہ صرف اُن باغی عناصر کا استیصال مقصود تھا جو مغل حکمرانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہندستان جیسے شاداب ملک کو اجاڑنے اور امن عامّہ میں انتشار پیدا کرنے میں بے دریغ مصروف تھے۔

شاہ ولی اللہ کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا دل بغیر کسی امتیاز کے

ہندو مسلم کسانوں اور مزدوروں کے دُکھ درد سے یکساں اور بے حد متاثر تھا چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے نجیب الدّولہ کو نصیحت بھی فرمائی کہ جنگ کی صورت میں شہر دہلی کے ہندو مسلمانوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔[۲۵]

سید احمد بریلوی کی اصلاحی تحریک[۲۶]

۱۹ ویں صدی ہندستانی مسلمانوں کے لیے بے حد کشمکش کا زمانہ تھا۔ ایک طرف مسلمانوں کی حکومت زوال پذیر تھی اور دوسری طرف مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی زندگی میں بہت خامیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ مسلمان پیروں اور قبروں کے سجدے کرتے تھے۔ اور ان سے مرادیں مانگتے تھے۔ احکام اسلام کی پابندی، اعمالِ حسنہ اور سنّت نبوی کی پیروی ضروری نہیں تھی۔ تعویذوں اور گنڈوں کا بہت زور تھا۔ پوری مسلم قوم وہم پرستی کا شکار تھی۔ بیواؤں کی شادیاں نہیں ہوتی تھیں۔ بیاہ، شادی اور تجہیز و تکفین پر فضول خرچی اور بے جا رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔

۱۹ ویں صدی کے نصف اوّل میں مسلمانوں کے سامنے ایک دوسرا مسئلہ درپیش ہوا۔ اور وہ یہ کہ انگریزوں کے ہندستان پر سیاسی تسلّط کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم اور مغربی خیالات کی تبلیغ شروع ہو چکی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ دیگر قوموں کی طرح مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کریں یا نہ کریں؟

امام الہند شاہ ولی اللہ نے ۱۸ ویں صدی میں قوم کی روحانی اور اخلاقی قباحتوں کو اپنی تصانیف میں بے نقاب کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسی صالح جماعت کی بنیاد ڈال گئے جو ان کی اصلاحی تجاویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ کے لائق بیٹے اور جانشین شاہ عبدالعزیزؒ (۱۷۴۶ء۔ ۱۸۲۳ء) نے اس دور کے تمام مسائل پر قرآن و حدیث کی روشنی میں فتوے جاری کیے۔ انگریزی تعلیم سے متعلق اور انگریزوں کی نوکری میں داخل ہونے سے متعلق بھی اہم فتوے جاری کیے۔ ان کے فتووں کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ مغربی تعلیم حاصل کرنے

میں اور انگریزوں کی نوکریاں اختیار کرنے میں مسلمانوں کو احتیاط کی تلقین کرتے تھے۔ انھیں یہ خطرہ لاحق تھا کہ ایسی صورت میں مسلمان اپنے راستے سے نہ بھٹک جائیں۔ ان کے فتووں میں صاف انکار بھی نہیں ہے۔

شاہ عبدالعزیز کے شاگرد اور جانشین سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ء-۱۸۳۱ء) نے شاہ ولی اللہ کی تحریک کو بہت موثر انداز سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ سید احمد بریلوی ۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ مکتب میں قرآن مجید کی تعلیم شروع کی مگر مکمل نہیں کر پائے تھے۔ ۱۸ سال کی عمر میں تلاشِ روزگار کے لیے نکلے۔ پہلے لکھنؤ گئے۔ پھر دہلی آئے اور شاہ عبدالعزیزؒ سے علم دین حاصل کیا۔ چار سال کے بعد رائے بریلی واپس گئے۔ ۱۸۱۰ء میں ٹونک کے نواب امیر خاں کی فوج میں ملازمت کی۔ تقریباً چھ سات سال فنِ سپاہگری میں بسر کیے اور اچھا رسوخ پیدا کیا۔ ۱۸۱۶ء میں دہلی واپس آئے۔ مولانا عبدالحیٔ اور شاہ اسمٰعیل آپ کے مرید ہو گئے۔ ملک کے خاص خاص مقامات کا دورہ کیا اور پھر اپنے وطن واپس آ گئے۔ وہاں انھوں نے اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کیا۔

سید احمد بریلوی اپنی تقریروں میں معرفت الٰہی اور طریق سلوک کے شرعی اسلوب پر زور دیتے تھے۔ عوام و علما آپ کے طریق کو طریقۂ محمدیہؐ کہہ کر پکارتے تھے۔ یعنی ظاہری اعمال طریقۂ محمدیہؐ یعنی شریعت کے مطابق ہونے چاہییں۔ بعد کو یہی تحریک وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ شاہ اسمٰعیل نے سید احمد بریلوی کے اقوال صراطِ مستقیم میں ترتیب دیے ہیں۔ اس میں مرشد کی تعظیم میں افراط اور مبالغہ، قبروں پر جا کر سجدے کرنا اور مرادیں مانگنا اور اولیاء اللہ کی نذر و نیاز جس میں فضول خرچی کا عیب بھی پایا جاتا ہے۔ ان تمام بدعتوں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ ان کے علاوہ بیاہ اور شادی اور ختنے کے موقعے پر دھوم دھام اور فضول خرچی تجہیز و تکفین کی رسمیں اور ممانعت نکاحِ بیوگان کے خلاف مسلمانوں کو تلقین کی۔

سید احمد بریلوی نے سیاست میں بھی حصہ لیا۔ وہ ایک ایسی حکومت کے قیام کے

خواہاں تھے جو طریقۂ محمدیہ کے مطابق ہو۔ ان کے جانشینوں کی تحریک سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تحریک سیاسی اعتبار سے برطانوی اقتدار کے خلاف تھی۔

اسی طرح کی تحریکیں بنگال میں بھی رونما ہوئیں۔ فرائضی تحریک کے رہنما شریعت اللہ اور دودو میاں نے ایک طرف تو مسلم معاشرے کو بدعتوں سے پاک کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف برطانوی حکمرانوں کے ہمنوا طبقے زمینداروں کے خلاف بغاوتیں کیں۔ بنگال ہی کے تیتو میر نے بھی اسی طرح کی تحریک چلائی۔[۲۸]

مسلمانوں کا مغربی تہذیب کی جانب رویّہ

رجعت پسند مورخین نے مسلمانوں کے بارے میں یہ مشہور کر دیا ہے کہ وہ بے حد تعصبی رجعت پسند اور روایت پرست ہیں۔

ہندستان میں مغربی تعلیم اور انگریزی زبان کی طرف مسلمان دھیرے دھیرے ۱۹ ویں صدی کے شروع ہی سے راغب ہونے لگے تھے۔ حیدر آباد کے مشہور وزیر نواب شمس الدولہ اور سر سالار جنگ نے مغربی تعلیم کو بہت فروغ دیا۔ بنگال کے مسلمان بھی انگریزی تعلیم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ نواب عبداللطیف نے ۱۸۵۳ء میں بنگال میں محمڈن لٹریری سوسائٹی قائم کی۔ انھوں نے مغربی تعلیم کے فروغ کی بے حد کوشش کی۔ کلکتہ مدرسہ کے اینگلو پرشین ڈپارٹمنٹ کو کالج میں بدلنے کا مشورہ دیا۔ حاجی محمد محسن فنڈ سے یکم اگست ۱۸۳۶ء کو مدرسۂ عالیہ قائم کیا گیا، جس میں انگریزی پڑھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لطف اللہ (۱۸۰۲ء۔ ۱۸۵۴ء) انگریز افسروں کو تعلیم دیتے تھے۔ انھوں نے خود انگریزی زبان سیکھی۔ وہ پہلے مسلم تھے جنھوں نے انگریزی میں خود نوشت حیات لکھی وہ انگریزوں کی بہت سی باتوں سے متاثر تھے اور مسلمانوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں اور انگریزوں سے وقت کی پابندی کرنا صفائی سے رہنا وغیرہ سیکھیں۔ عبدالرحیم دہری (۱۷۸۵ء۔ ۱۸۵۰ء) گورکھپور

کے ایک معمولی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے انگریزی زبان پر اتنا عبور حاصل کیا کہ فورٹ ولیم کالج میں انگلش پڑھانے پر مامور ہوئے۔ انھوں نے بھی مغربی تعلیم کی اہمیت پر بے حد زور دیا۔ عظیم اللہ خان کانپوری انگریزی زبان کے ماہر تھے وہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں شریک تھے۔ مرزا ابو طالب لندنی (۱۷۵۲ء ۱۸۰۶ء) نے لندن کا دورہ کیا۔ وہ انگلستان کی ترقی دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اپنے سفرنامے میں انھوں نے انگریزی تعلیم، ان کے دستور اور قانون، عادات واطوار کی بے حد تعریف کی ہے۔ ۱۸۲۵ء میں اردو میڈیم میں دہلی کالج میں مغربی مضامین پڑھانے کا اہتمام کیا گیا۔ ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد اسی کالج میں پڑھے تھے[۱۶]

حوالہ باب۔ ۹

۱۔ راجا رام موہن رائے پر مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ کیجیے:

او۔ میلی، انڈیا اینڈ دی ویسٹ

اے۔ گپتا، اسٹڈیز اِن بنگال رناساں

این۔ کے۔ بوس، اویکننگ اِن بنگال

اقبال سنگھ، راجا رام موہن رائے

عرش ملسیانی، راجا رام موہن رائے

۲۔ مجیب اشرف، شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار، جامعہ جولائی ۱۹۶۵ء

ایضاً، مسلم ایٹی چیوڈس ٹو وارڈس .... ص ص۔ ۱۱۷۔ ۱۴۳

اطہر عباس رضوی، شاہ ولی اللہ اینڈ ہز ٹائمس

۳۔ سید احمد بریلوی پر مندرجہ ذیل کتابیں ملاحظہ کیجیے:

شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ص ص۔ ۱۳۔ ۴۵

قیام الدین، وہابی مومینٹ

۴۔ لطف اللہ کی پیدائش مرکزی ہند کے ایک مقام دارانگر (مالوہ) میں ہوئی

باب ۔ ۱۰

۱۸۵۷ء غدر یا آزادی کی پہلی جنگ

بغاوت کی نوعیت اور اسباب

۱۸۵۷ء کی بغاوت ۱۰ مئی کو میرٹھ چھاونی کے ہندستانی سپاہیوں نے شروع کی۔ انھوں نے اپنے یوُرپین افسروں کا قتل کیا۔ ۱۱ مئی کو دلی پہنچے، مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنا اصل حکمراں قرار دے کر بغاوت میں شامل کر لیا۔ پھر یہ چنگاری پورے ہندستان میں ہر قوم اور ہر طبقے میں شعلوں کی طرح بھڑکنے لگی۔

مورخین نے اس واقعہ کی اپنے اپنے طور پر وضاحت کی ہے۔ ابتدا میں انگریز مورخین نے اسے محض سپاہیوں کی بغاوت بتایا۔ ہندستانیوں میں کشوری چندر مترا شمبھو چندر اور ہریش چند مکرجی اسے فوجی بغاوت کہتے ہیں۔ سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب "اسبابِ بغاوتِ ہند" میں انگریزوں کی طرزِ حکومت اور پالیسیوں کو خصوصاً مذہبی پالیسی کو اس بغاوت کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔

خود وائسرائے کیننگ نے سپاہیوں کی بغاوت کے نظریے کی تردید کی ہے۔ جی۔ بی میلیسن نے اس کو مولویوں کی سازش بتایا۔ جی۔ بی نارٹن نے تمام مذہبی طبقوں کی بغاوت قرار دیا ہے۔[1]

ہندستانی مورخین خصوصاً وی۔ ڈی ساورکر نے اپنی کتاب میں اس کو آزادی کی

پہلی جنگ ثابت کیا ہے ؎۲ آر۔سی مجومدار اس خیال سے بالکل متفق نہیں ہیں۔ اور ان کو اس واقعہ میں کوئی قومی جذبہ نظر نہیں آتا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے کہ یہ پُرانے حکمراں طبقے کے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی۔

اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"THESE WERE NOT THE BIRTH PANGS OF FREEDOM STRUGGLE BUT DYING GROANS OF OBSOLETE AUTOCRACY" ؎۳

ہندُستان میں قومی تصور بیرونی حکومت کے تجربات کے ساتھ پروان چڑھ رہا تھا۔ مشہور مورّخ ایس۔ این۔ سین نے اپنی کتاب ۱۸۵۷ء میں ثابت کیا ہے کہ اگر پورے ہندُستان میں نہیں تو کم از کم اودھ میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے ایک قومی تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ کیوں کہ وہاں ہر طبقے اور ہر مذہب کے لوگ متحد ہو کر برطانوی سامراج سے ملک کو نجات دلانے کی جدّوجہد کر رہے تھے ؎۴

ایس۔ بی۔ چودھری ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو ایک قومی بغاوت مانتے ہیں۔ اور اس میں بیرونی حکومت کے خلاف اب تک کی بغاوتوں میں تسلسل پاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندُستانی سماج کے مختلف طبقوں نے ۱۸۵۷ء میں برطانوی حکومت کے ظلم کے خلاف اپنی بے چینی اور بے اطمینانی کا بڑے اونچے پیمانے پر مظاہرہ کیا تھا۔ یہ سطور ملاحظہ کیجیے۔

"IT WAS A MAJOR EXPRESSION OF THE DISCONTENTMENT OF THE VARIOUS SECTIONS OF THE PEOPLE OF INDIA AGAINST THE HIGH HANDEDNESS OF THE BRITISH RULE IN INDIA" ؎۵

اِن تمام تشریحات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہندُستان کے تمام طبقے برطانوی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف تھے۔ انگریزوں نے بیرونی قوم کی حکومت کے تصوّر کو باقی رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندُستان کے تمام طبقے بیرونی قوم کے حکمرانوں کو ملک سے نکال کر اپنے پُرانے حکمرانوں کو ترجیح دے رہے تھے۔

جدید مورّخین کی تحقیقات زیادہ حقیقت پسندانہ ہیں۔ جان ہیرس کو بھی ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں آزادی کی تحریک کی ابتدا مل جاتی ہے۔

"HE FINDS IN 1857, THE "FIRST STIRRINGS OF THE INDEPENDENCE MOVEMENT". ۵۶

فوجی اسباب ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ہر سبب اپنی جگہ اہم تھا۔ لیکن ابتدا فوج نے کی۔ بنگال کی فتح سے پیشتر فوج میں ہندُستانیوں کو اونچے اونچے عہدوں پر فائز کیا جاتا تھا۔ پھر فوج میں یوُرپین کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی۔ لارڈ کارنوالس کو ہندستانیوں پر بھروسا نہیں تھا۔ اس نے اونچے اونچے عہدوں پر یوُرپین کو فائز کرنا شروع کیا۔ حالانکہ برطانوی فوج میں ہندُستانیوں کی تعداد پھر بھی زیادہ رہی مگر اہلیت کے لحاظ سے ان کی ترقی محدود ہو گئی اور انھیں نچلے درجے کے عہدوں پر ہی اکتفا کرنی پڑی اور امتیاز بھی برتا گیا۔ ایک ہی عہدے پر ہندُستانی افسر کے مقابلے میں انگریز کی تنخواہ زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ انگریزی افسروں کا اپنے ماتحت ہندستانی افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ بڑا خراب رویّہ تھا۔ وہ انھیں کمتر سمجھتے تھے۔ باہر لڑنے کے سلسلے میں ہندُستانی سپاہیوں نے بھتّے کی مانگ کی جو نامنظور کر دی گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۲ سال قبل چار بار ہندستانی سپاہی بغاوت کر چکے تھے۔ نئی پالیسی کے تحت اہلیت کے بجائے سینئرٹی کی بنیاد پر ترقی کی جاتی تھی۔ اور آخر میں چربی کے کارتوس کے استعمال کی خبر نے ایندھن میں ماچس لگانے کا کام کیا۔ دراصل ۱۸۵۴ء میں کریمیا کی جنگ میں یہ کارتوس موثر ثابت ہوئے تھے اس لیے

ہندستان میں بھی ان ہی کارتوسوں کا استعمال شروع ہوا۔ ان کارتوسوں کو بنانے میں گائے یا سور کی چربی استعمال کی جاتی تھی، اور سپاہیوں کو اپنے مُنہ سے کاٹ کر استعمال کرنا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے مسلم اور ہندو سپاہی یہ کارتوس استعمال نہیں کرسکتے تھے۔ جب اس خبر سے ہندستانی سپاہیوں میں بے چینی پھیلی اور انھوں نے اعتراض کیا تو انھیں گرفتار کرکے قید کردیا گیا۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے پہلے ۲۶ فروری ۱۸۵۷ء کو بیرام پور (کلکتہ) کی چھاونی میں سپاہیوں نے بغاوت کردی تھی۔ بیرک پور کی چھاونی میں منگل پانڈے نے علمِ بغاوت بلند کیا تھا منگل پانڈے کو ۲۹ مارچ ۱۸۵۷ء کو پھانسی پر چڑھادیا گیا تھا۔ امبالہ اور لکھنؤ میں بھی بے چینی کے آثار نمایاں ہورہے تھے۔ منگل پانڈے کو پھانسی دینے پر اور چربی کے کارتوس کے استعمال کرنے سے انکار پر سپاہیوں کو قید کرنے پر میرٹھ کے سپاہیوں میں بے حد غم و غصّہ تھا۔ سپاہیوں نے جیل سے آزاد ہوکر پہلے اپنے انگریز افسروں کا قتل کیا اور ۱۱ مئی کو دہلی پہنچے اور یہاں آکر بہادر شاہ ظفرؔ کو اپنا شہنشاہ مان کر تعاون کی درخواست کی۔

سیاسی اسباب

انگریزوں کی توسیعِ سلطنت کی پالیسی نے تمام ہندستانی حکمرانوں کو بدظن کردیا تھا۔ ولزلی نے شاہ عالم سے ۱۸۰۵ء میں معاہدہ کیا۔ اس کے تحت مغلیہ سلطنت کے محافظ کی حیثیت سے کام کرنے کا اختیار دیا تھا۔ دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ مغل بادشاہ کی رسمی عزت کرنے میں بھی اپنی توہین سمجھنے لگے تھے۔ گورنر جنرل نے بادشاہ کو نذر پیش کرنا بند کردی۔ ولزلی نے بادشاہ کو جو خراج دینا منظور کیا تھا اسے پنشن کا نام دیا گیا۔ انگریزوں نے خراج میں اضافے کا وعدہ کیا تھا اکبر ثانی اس تمنّا ہی میں مرگئے مگر خراج میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ انگریزوں کی شرط تھی کہ بادشاہ کے اخراجات کا وہ خود انتظام کریں گے۔ ڈلہوزی نے مغل بادشاہ کے خطاب کو ختم کردیا اور شہزادوں سے ساز باز کرکے لال قلعہ کو خالی کرانے کا انتظام کرلیا تھا۔

لال قلعہ کو اسلحہ خانہ میں تبدیل کرنے کا منصوبہ تھا۔ ڈلہوزی نے شہزادے مرزا فخرالدین کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ بادشاہ کے انتقال کے بعد اسے جانشین مان کر پنشن دی جائے گی۔ اور مہرولی میں رہائش پذیر ہوگا۔ بہادر شاہ اس وقت ستر سال کے تھے اور کسی نہ کسی طرح انگریزوں سے خوشگوار تعلقات برقرار رکھے ہوئے تھے۔ انھیں یہ تمام باتیں ناگوار گزرتی تھیں مگر وہ مجبور تھے۔ باغی سپاہیوں کی درخواست پر پہلے بادشاہ نے انھیں سمجھایا کہ وہ انگریزوں سے گفتگو کرکے کچھ مانگیں منوا دیں گے۔ لیکن سپاہی باز نہیں آئے اور دہلی کے کچھ معتبر لوگوں کے مشورے پر اور جنرل بخت خان کے بر وقت ہمت دلانے پر بہادر شاہ بھی آزادی کی جنگ میں بنفس نفیس شریک ہو گئے۔[۴]

ڈلہوزی (۱۸۴۸ء۔ ۱۸۵۶ء) بہت کم عمر صرف ۳۶ سال کا نوجوان گورنر جنرل تھا۔ لیکن توسیع سلطنت میں ولزلی سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ اس نے جنگ کے ذریعے پنجاب اور اپر برما کو اپنی حکومت میں ملایا۔ اور اصولِ الحاق کے تحت تقریباً آٹھ ہندستانی ریاستوں کو حکومت میں ملالیا۔ پیشوا نانا صاحب کی پنشن بند کر دی گئی۔ ناگپور اور برار کو جہاں کپاس پیدا ہوتی تھی برطانوی حکومت میں ملایا۔ چھترپتی کی ستارا ریاست، رائے پور، نل درگ، کرناٹک، تنجور، کرولی، سنبھل پور وغیرہ ریاستیں ملائیں ۱۸۵۳ء میں جھانسی کے مراٹھا راجا گنگادھر راے کا انتقال ہوگیا وہ لاولد تھا، اس کی بیوی لکشمی بائی نے ریاست کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر ڈلہوزی نے اس ریاست کو بھی اپنی حکومت میں ملا لیا۔

ڈلہوزی نے سب سے زیادہ بے انصافی اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ کے ساتھ کی تھی۔ ۱۳ر فروری ۱۸۵۶ء میں اودھ میں بدنظمی اور بدامنی کا بہانہ تراش کر واجد علی شاہ کو تخت سے اتار دیا اور پنشن مقرر کر کے مٹیا برج کلکتہ میں رہنے پر مجبور کیا۔ ڈلہوزی نے اپنی تعریف کرتے ہوئے ملکہ وکٹوریہ کو ایک

خط میں لکھا کہ آپ کے خدمت گار نے اودھ کو حکومت میں ملا کر کروڑوں روپے کی مالیت کا اضافہ کیا ہے ۸؎

اقتصادی اسباب

کمپنی کی حکومت کو تجارت کی اجارہ داری ملی ہوئی تھی۔ بعد میں تجارت کو آزاد کر دیا گیا۔ انگلستان کی مصنوعات ہندستان میں بیچی جانے لگیں۔ اس طرح ہندستان کی صنعت و حرفت بالکل برباد ہو گئی۔ ہندستان کی تجارت سے زیادہ فائدہ برطانیہ کو ہو رہا تھا۔ مال گزاری کے طریقوں نے کسانوں کو تباہ برباد کیا۔ بنگال میں استمراری بندوبست قائم کرکے زمینداروں کو حسب مرضی لگان وصول کرنے کی آزادی تھی۔ کسانوں کی حفاظت اور ترقی کے لیے کوئی قانون پاس نہیں کیا۔ اور دیگر صوبوں میں رعیت واری اور محال واری طریقہ اپنایا بھی تو لگان وصول کرنے میں بڑی سختی کی۔ ڈلہوزی نے شمال مغربی ہند میں تعلقداری کو ختم کرکے براہ راست کسانوں سے لگان وصول کیا۔ اور زمین بیچنے کا قانون لاگو کرکے لگان نہ ادا ہونے کی شکل میں کسانوں کو زمین بیچنے پر مجبور کیا۔ اسی وجہ سے اودھ میں کسان اور زمیندار دونوں ہی طبقے برطانیہ حکومت کے خلاف متحد ہو گئے۔ ولیم بنٹنک نے ایک قانون (LAND RESUMPTION ACT) پاس کرکے بغیر پٹے کی زمینوں کو چھین لیا۔ جس سے علماء اور مخصوص لوگ متاثر ہوئے مغلیہ سلطنت نے ان کی علمیت اور دیگر صلاحیتوں کی وجہ سے انھیں زمینیں مفت دے رکھی تھیں ۹؎

مذہبی اور سماجی اسباب

۱۸۱۳ء تک انگریزوں نے مذہبی معاملات میں غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی تھی۔ اس کے بعد عیسائی مشنریوں کو ہندستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی اجازت مل گئی۔ ملک کے کونے کونے میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی گئی اور عیسائی مذہب کا ادب تقسیم کیا گیا۔ مشنریوں نے ان مقاصد کے حصول کے لیے اسکول کھولے انگریزی تعلیم کے ساتھ عیسائی مذہب کی تبلیغ بھی کی۔ دھیرے دھیرے ہندستان کے مذاہب اور کلچر کی نکتہ چینی کرنے

لگے۔ انھیں اپنے مذہب اور کلچر کی برتری کا احساس ہوگیا۔ ہندستانی مذہب اور کلچر کو بہت پچھڑا ہوا سمجھتے تھے۔ ولیم بنٹینک نے ہندو مذہب کی کچھ رسومات کو بند کرنے کے لیے قانون پاس کیے۔ خصوصاً ستی کی رسم کو ختم کرنے کے لیے ۱۸۲۹ء میں ایک قانون پاس کر کے ستی کو جرم قرار دے دیا۔ بعد کو بیواؤں کی شادی کے لیے بھی قانون پاس کیا گیا۔ ایک قانون ایسا پاس کیا جس سے اگر کوئی ہندستانی عیسائی مذہب اپنائے تو وہ اپنے والدین کی جایداد کا وارث بھی رہ سکتا تھا۔ بقول سرسید احمد خاں ۱۸۵۰ء کے زمانے میں انگلستان سے کئی پادری ہندستان آئے جنھوں نے ہندستانی مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مباحثہ کیا۔[۱۲] ولیم بنٹینک کے زمانے تک عدالت کی زبان فارسی تھی۔ اس کو ختم کر کے ورنا کلر زبان رائج کی۔ جس کی وجہ سے فارسی جاننے والا طبقہ متاثر ہوا۔[۱۳] میکالے نے انگریزی تعلیم کے فروغ پر بہت زور دیا۔ ان تمام اسباب کا اثر ظاہر ہے ہر طبقے پر ہوا۔ جس کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت رونما ہوئی۔

واقعات اور مراکز منگل پانڈے کی رہنمائی میں بنگال کی بیرک پور اور بیرام پور چھاونیوں میں ہندستانی سپاہیوں نے بغاوت کی۔ انگریز افسروں کا قتل کیا۔ مگر انگریزوں نے اس بغاوت کو بہت جلد دبا دیا۔ آسام میں دیوان منی رام دت نے بغاوت کی۔ بہار میں جگدیش پور کے بابو کنور سنگھ اور اس کے بعد بابو امر سنگھ نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں حصہ لیا۔

۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو جب میرٹھ چھاونی میں ہندستانی سپاہیوں نے انگریز افسروں کا قتل کیا تو یہ بغاوت پورے ملک میں پھیل گئی۔ میرٹھ کے سپاہی ۱۱ رمئی کو دہلی پہنچے اور بہادر شاہ ظفر کو اپنا حکمراں مان کر مدد کی اپیل کی۔ جنرل بخت خاں کی ہمت افزائی پر بہادر شاہ نہ صرف مدد کرنے پر آمادہ ہوئے بلکہ خود بھی آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ دہلی میں فضل حق خیرآبادی کی رہنمائی میں علما نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتوا جاری کر دیا۔ بخت خاں نے دلی میں ہندستانی حکومت قائم کر دی۔ ہندو مسلمان اس مہم میں شیر و شکر تھے مسلمانوں نے ہندوؤں کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے گئوکشی ممنوع کر دی تھی۔

لیکن یہ حکومت ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء تک ہی قائم رہ سکی۔ جب انگریز دوبارہ دہلی پر قابض ہوگئے جنرل بخت خاں لکھنؤ کی طرف گئے۔ بہادر شاہ کو گرفتار کرکے برما بھیج دیا گیا۔ ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ بقول ایف۔ ڈبلو۔ بکلر "بادشاہ باغی نہیں تھا اگر کوئی باغی تھا تو وہ کمپنی سرکار تھی جس نے وعدہ خلافی کی تھی"، بادشاہ کے بیٹوں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔[۱۲]

اودھ میں واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل نے بغاوت کا علم اٹھایا اور ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو انگریزی ریزیڈنسی کے انگریز افسروں کو قتل کیا۔ اس مہم میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ احمد اللہ شاہ فیض آبادی نے بھی اس میں حصہ لیا۔ انھوں نے گوریلا جنگ کے طریقے اپنا کر انگریز فوج کو زک پہنچائی۔ انگریزوں نے انھیں مردہ یا زندہ پکڑنے کا سب سے زیادہ انعام رکھا تھا۔ ایک ہندستانی راجا پواسے نے غداری کی اور انھیں دھوکے سے قتل کرا دیا۔ ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو لکھنؤ پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ بیگم حضرت محل وہاں سے نکل کر نیپال چلی گئیں۔ اور ۱۸۷۴ء تک تادم مرگ وہیں مقیم رہیں۔

۴ جون ۱۸۵۷ء کو کانپور میں نانا صاحب نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ نانا صاحب نے بہادر شاہ ظفر کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا اور کانپور کے انگریز افسروں کو قتل کرکے اپنی حکومت قائم کی۔ اس مہم میں نانا صاحب کو عظیم اللہ خاں کی بڑی مدد حاصل تھی۔ ۱۲ جون ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے کانپور پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ نانا صاحب کانپور سے نکل کر لکھنؤ پہنچے اور جنگ جاری رکھی۔

۷ جون ۱۸۵۷ء کو رانی لکشمی بائی نے جھانسی میں بغاوت کر دی۔ اس بغاوت میں جھانسی کے بااثر مسلمانوں نے رانی کا ساتھ دیا۔ خصوصاً رسالدار کالے خاں اور تحصیلدار محمد حسین نے بغاوت میں لکشمی بائی کا ساتھ دیا۔ کالپی میں لکشمی بائی کا ساتھ تانتیا ٹوپے نے دیا۔ آخر کار انگریز جھانسی کی بغاوت کو بھی دبانے میں کامیاب ہوگئے۔ اور لکشمی بائی شہید ہوئیں۔

اگست ۱۸۵۷ء میں گوالیار میں مندیسر پر شہزادہ فیروز شاہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں سے وہ دہلی، آگرہ، دھولپور، فرخ آباد اور پھر آخر میں لکھنؤ میں شریک جنگ ہوئے۔ انھوں نے بیگم حضرت محل، احمد اللہ شاہ اور تانتیا ٹوپے کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا۔ اور وہاں سے عراق چلے گئے۔

۲۰ مئی ۱۸۵۷ء کو آگرہ میں وزیر خاں اور رحمت اللہ خاں کی رہنمائی میں بغاوت ہوگئی۔ علما نے جہاد کا فتوا جاری کر دیا۔ وہ بذاتِ خود جہاد میں شامل ہوئے۔ مولانا قاسم نانوتویؒ نے تھانہ بھون پر قبضہ کر کے حکومت قائم کی بعد میں کیرانہ، شاملی اور بڑہنہ میں بھی یہ تحریک پھیل گئی۔ ہمیر پور کے ڈپٹی کلکٹر وحید الدین زماں نے بھی بغاوت کر دی۔ روہیل کھنڈ میں ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو خان بہادر خاں کی رہنمائی میں اور الہ آباد میں مولوی لیاقت علی کی رہنمائی میں مہم جاری رہی۔ فتح گڑھ میں نواب تفضل حسین خاں نے بغاوت کی۔ اُن کی رہنمائی میں باندہ، رام پور مراد آباد، بجنور، بدایوں، امروہہ، شاہجہاں پور، فرخ آباد میں بغاوت ہوئی۔ امروہے میں سید گلزار علی کی رہنمائی میں بغاوت ہوئی۔ بلند شہر میں نواب ولی داد خاں نے بغاوت کی۔ بجنور میں نواب محمود خان نے بغاوت کی۔ فتح پور (میوات) میں لال بہادر خاں اور دولہ شاہ نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی۔ اعظم گڈھ اور جونپور میں بھی ۵ رجون ۱۸۵۷ء کو بغاوت ہوگئی۔ دکن میں حیدرآباد میں بغاوت ہوئی مگر وزیر سالار جنگ نے اس بغاوت کو دبا دیا۔ اس طرح ملک کے کونے کونے میں یہ آزادی کی پہلی جنگ لڑی گئی۔ آخرکار دھیرے دھیرے انگریزوں کی فوجی طاقت نے اس تحریک کو دبا دیا۔[۱۳]

بغاوت کی ناکامی کے اسباب

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی بھی تاریخ میں ایک بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ یہ بات واقعی قابلِ حیرت ہے کہ انگریزوں کے خلاف اتنی زبردست تحریک ناکام ہوگئی۔ اصل میں لڑنے والے رہنماؤں کے پاس ہتھیار اور

فوجی وسائل پُرانے اور ناکافی تھے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ ہندستانی سپاہیوں میں بغاوت ہونے کے باوجود ہندستانی فوج کا کافی حصہ انگریزوں کے ساتھ تھا۔ چھوٹے چھوٹے عہدے والے جن سپاہیوں نے بغاوت کی تھی ان کے پاس جنگ لڑنے کے اچھے ہتھیار نہیں تھے۔ انگریزوں کے پاس ملک کے مختلف مراکز میں جنگ کا سامان اور لڑنے کے لیے وفادار فوج موجود تھی۔ انگریزوں نے سائنس کی ایجادات خصوصاً ٹیلی گراف کے ذریعے آپسی ربط ضبط اور اتحاد قائم رکھا۔

ہندستانیوں کے کچھ طبقے بغاوت کے دوران انگریزی حکومت کے وفادار رہے۔ خصوصاً کچھ حکمراں اور امرا نے انگریزوں کی مدد کی۔ وزیر سر سالار جنگ نے پورے دکن کو انگریزوں کے لیے محفوظ رکھا۔ نواب یوسف علی نے روہیل کھنڈ میں بغاوت دبانے میں انگریزوں کی مدد کی۔ سر دِنکر راو نے گوالیار میں انگریزوں کو بچایا۔ سر سید احمد خاں نے بجنور میں انگریز افسروں کی جانیں بچائیں۔

زمیندار اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ بھی بغاوت میں شامل نہیں تھا۔ ان لوگوں کے مفاد برطانوی حکومت سے جُڑے ہوئے تھے۔

پنجاب میں خصوصاً سکھ بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لے سکے۔ وجہ یہ تھی کہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد سکھ قوم ایک بار پھر منتشر ہو گئی تھی اور پنجاب کو ڈلہوزی نے اپنی حکومت میں ملا کر سکھوں کے قومی جذبے کو کمزور کر دیا تھا۔ کافی تعداد میں سکھوں کو انگریزی فوج میں تازہ تازہ شامل کیا تھا۔ نیپال کے گورکھوں نے انگریزی فوج میں بغاوت کو دبانے میں بہت کام کیا۔

لیکن بظاہر ناکامی کو ناکامی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس بغاوت کے اثرات بہت دوررس ثابت ہوئے۔ آگے چل کر یہی بغاوت وطن کی آزادی کی جانب پہلا قدم ثابت ہوئی اور اس آزادی کی پہلی جنگ میں اپنی جانیں قربان کرنے والے رہنماؤں کی محنت رائیگاں نہیں گئی آزادی کی جدّوجہد میں ان رہنماؤں کی قربانی نے بڑا جوش پیدا کیا۔ جب جب آزادی کی تحریک کا تذکرہ آتا

ہے سب سے پہلے ان ہی رہنماؤں کے نام کا تذکرہ کیا جاتا ہے

نتائج اور اثرات

سر سید احمد خاں جنھیں انگریزوں کا خیر خواہ بتایا جاتا ہے انھوں نے بھی اپنی کتاب " اسبابِ بغاوتِ ہند ، میں انگریزی حکومت کی پالیسیوں کی خامیوں کی نشاندہی کی تھی ۔

چنانچہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد برطانوی حکومت کو نئے انداز سے منظم کیا گیا ۔ سب سے پہلے کمپنی کی حکومت کو ختم کرکے ۲ ؍ اگست ۱۸۵۸ء کو برطانوی تاج نے ہندستان کی حکومت کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ نظام سلطنت میں یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے ایکٹ کے تحت تبدیلی کی گئی ۔ لارڈ کیننگ جو کمپنی حکومت کی طرف سے گورنر جنرل تھے اب ملکۂ وکٹوریہ کی طرف سے وائسرائے مقرر کیے گئے ۔ چارلس وُڈ جو بورڈ آف کنٹرول کے صدر تھے انھیں سیکریٹری آف اسٹیٹ کا عہدہ دے دیا گیا ۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو الہ آباد میں ایک دربار منعقد کیا گیا جس میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے ایک فیض رساں حکومت قائم کرنے کا ہندستانیوں سے وعدہ کیا گیا ۔ مثلاً عوام کی اقتصادی ترقی ، فلاح و بہبود کا پورا خیال رکھا جائے گا ۔ ان کے ساتھ ملازمتوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا ۔ ہندستانی حکمرانوں کو اندرونی معاملات میں آزادانہ حکومت چلانے کا اختیار دیا جائے گا ۔ مذہبی اور سماجی معاملات میں غیر جانب داری کی پالیسی اپنانے کا وعدہ کیا ۔

برطانوی فوج کی تنظیمِ نو

بغاوت کی ابتدا ہندستانی سپاہیوں نے کی تھی ۔ اس لیے ہندستانی فوج کی نئی تنظیم کے لیے پیل کمیشن مقرر کیا گیا ۔ جس کی سفارشات کی بنیاد پر فوج کو ڈویزن اور کاؤنٹر پوائز کے اصول پر دوبارہ منظم کیا گیا ۔ اس اصول کے تحت اوّل تو ہندستانی سپاہیوں کی تعداد کو یورپین سپاہیوں کے مقابلے میں کم کیا گیا ۔ دوسرے اسلحہ کے صیغے کو پوری طرح سے یورپین افسروں کے ماتحت رکھا

گیا۔ تیسرے فوج کی جماعت بندی ذات اور قبیلوں کی بنیاد پر کی گئی۔ تاکہ آپس میں اتحاد نہ ہو سکے۔ ہندستانی فوجیوں کو قومی تحریک کے ادب اور خبروں سے بے خبر رکھا گیا۔ ہندستانیوں کو کچھ مخصوص اونچے عہدوں پر رکھنا بالکل بند کر دیا۔ ہندستانی سپاہی یورپین افسروں کے ماتحت رہتے تھے تاکہ وہ آپس میں سازش نہ کر سکیں۔

برطانوی حکومت اور ریاستی حکمراں

لارڈ کیننگ نے سب سے پہلے لارڈ ڈلہوزی کے توسیع سلطنت کے اصول کو رد کیا اور اصول الحاق کو ختم کر دیا۔ ہندستانی حکمرانوں کو ریاستیں واپس کر دی گئیں۔ لیکن ان حکمرانوں کو ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ وفاداری کی قسم کھانی پڑی۔ اور ان سب کو ملکہ کی سرپرستی قبول کرنی پڑی۔ تعلقداروں کو زمینداریاں واپس کر دی گئیں۔ ۱۸۷۶ء میں رائل ٹائیٹل ایکٹ پاس کیا گیا اور ۱۸۷۷ء کو دلّی میں دربار ہوا۔ ریاستی حکمرانوں کو اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے اس دربار میں حاضری دینا لازمی قرار دیا۔ برار، برما اور منی پور کے حکمراں دربار میں آکر اپنی وفاداری ثابت نہ کر سکے۔ اسی لیے ان کی سلطنت کو برطانوی حکومت میں ملا لیا گیا۔ میسور کے راجا کو اسی دور میں اس کی ریاست واپس کی گئی۔ یہ پہلی ریاست تھی جس نے برطانوی حکومت کے تعاون سے اپنی ریاست کو جدید انداز پر ڈھالا[۱۱]۔

اقتصادی اثرات

اقتصادی اعتبار سے ایک نئے دور کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اس دور کو مورخوں نے خالص سرمایہ داری کا (FINANCE CAPITALISM) نام دیا ہے۔ نئے معاشی نظریے کے تحت آدم اسمتھ اور بینتھم کے انفرادی آزادی کے نظریے کو رد کیا جا چکا تھا۔ اور ہندستان میں سرمایہ لگا کر ہندستان کے وسائل کو مزید استعمال کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس نئے اصول کے تحت کچّے مال کی زیادہ سے زیادہ فراہمی کے لیے اور

پیداوار بڑھانے کے لیے نہریں کھدوائی گئیں۔ ریلوے لائن اور ریلوے قائم کی گئی۔ سڑکیں بنوائیں۔ لگان کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ لیکن بنگال کے کسانوں کی حفاظت کے لیے کچھ قوانین بنا دیے گئے۔ اس پالیسی سے ہندستان کی صنعت وحرفت تباہ ہوگئی۔ اب

"INDIA WAS SUPPLIER OF EACH AND EVERYTHING BUT MAKER OF NOTHING"

سماجی اثرات

انگریزوں نے تعلیم اور سماجی اصلاح کے معاملے میں پہلے ہی بہت لاپروائی کی تھی۔ ولیم بینٹنک کے زمانے سے کچھ کام شروع ہوا تھا۔ مگر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد برطانوی حکومت نے پھر سماجی معاملات میں غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی۔ تعلیم کو فروغ تو دیا مگر یہ تعلیم امیر لوگوں یا حکمراں طبقے تک محدود رکھی گئی۔ خصوصاً چارلس وُڈ انگریزی تعلیم کو عام کرنے کے خلاف تھے۔ اسی وجہ سے تین پریسی ڈینسیز میں یونی ورسٹیاں کھولی گئیں تاکہ امیر طبقے کے لوگ تعلیم حاصل کرسکیں۔ کچھ کالج شہزادوں کی تعلیم اور تربیت کے لیے کھولے گئے۔ اجمیر میں لارڈ میئو نے میئو کالج وہاں کے حکمراں خاندان کے لوگوں کے لیے قائم کیا تھا۔ کافی عرصے کے بعد لارڈ رِپن اور لینس ڈاؤن نے سماجی فلاح وبہبود کے سلسلے میں کچھ اقدام کیے۔ لارڈ رِپن بہت لبرل تھے انھوں نے پریس کی آزادی دینے کے علاوہ لوکل سیلف حکومتیں قائم کیں۔ ہندستانی ججوں کو برابر کا درجہ دینے کے لیے اِلبرٹ بل پیش کیا۔ اسی طرح لینس ڈاؤن کے زمانے میں مزدوروں کے روزگار کی ضمانت اور حقوق کے سلسلے میں اور چھوٹی لڑکیوں کی شادی بند کرنے کے سلسلے میں کچھ قانون پاس کیے گئے۔ اسی زمانے میں دوسرا انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء بھی پاس کیا گیا۔ جس میں ہندستانیوں کو نمائندگی دی گئی۔

۱؎ جی۔ بی۔ میلیسن، دی انڈین میوٹنی آف ۱۸۵۷ء، ص۔ ۱۹
بنگال ہرکارو، ۳۔ جون ۱۸۵۸ء
بپن چندر، جدید ہندستان، ص۔ ۱۴۶
آر۔ سی۔ مجومدار، ہسٹری آف دی فریڈم موومینٹ آف انڈیا، ص ص۔ ۲۱۲-۲۱۰
سرسید احمد خاں، اسبابِ بغاوت ہند، ص۔۱۱۲
مجیب اشرف، مسلم ایٹی ٹیوڈس، ص ص۔ ۱۵۶ تا ۱۸۳
۲؎ وی۔ ڈی۔ ساورکر، دی انڈین وار آف انڈیپنڈینس
۳؎ آر۔ سی۔ مجومدار، دی سپاہی میوٹنی اینڈ دی رِوولٹ آف ۱۸۵۷ء، ص۔ ۴۷۱
۴؎ سریندرناتھ سین، ایٹین فِفٹی سیون، ص۔ ۴۱۱
۵؎ ایس۔ بی۔ چودھری، سِول ربیلین اِن دی انڈین میوٹنیز، ص۔ ۲۹۸
" " تھیوریز آف انڈین میوٹنی
۶؎ جان ہیرس، دی انڈین میوٹنی، ص ص۔ ۷-۹
۷؎ سین، مذکورہ بالا
۸؎ اشرف، ایضاً
۹؎ سین، مذکورہ بالا
۱۰؎ سرسید، مذکورہ بالا
۱۱؎ مجومدار، مذکورہ بالا، ص۔ ۲۶۹
۱۲؎ خوشحالی لال سری واستو، دی رِوولٹ آف ۱۸۵۷ء اِن سینٹرل انڈیا اینڈ مالوہ،
ص ص، ۵۶، ۷۴
ایف۔ ڈبلو۔ بکلر، دی پولیٹیکل تھیوری آف انڈین میوٹنی
۱۳؎ اشرف، ایضاً
۱۴؎ ہیرالال سنگھ پرابلمس اینڈ پالیسیز آف دی برٹش اِن انڈیا
چارلس میٹکاف، آفٹر متھس آف ایٹین فِفٹی سیون

باب ۔ ۱۱

۱۹ویں صدی کے نصف دوم میں اصلاحی تحریکیں، مذہبی و سماجی

سرسیّد احمد خان اور علی گڑھ تحریک

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی ہندستانیوں کے لیے عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یوں تو بغاوت میں ہر قوم، مذہب اور طبقے کے لوگ شامل تھے۔ مگر رہنمائی زیادہ تر مسلم لیڈروں نے کی تھی۔ اس کے بعد انگریزوں کو یقین ہوگیا کہ مسلمان برطانوی حکومت کی توسیع و ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ مسلمانوں کے باشعور رہنما غور و فکر کرنے لگے۔ مسلم علما جنھوں نے ۱۸۵۷ء تک انگریزوں کو ملک سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور جنگ میں بہ نفسِ نفیس شامل ہوئے تھے، انھوں نے مذہب اسلام اور تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے دیوبند میں ایک ادارہ قائم کر لیا تھا۔

مسلمانوں میں کچھ باہوش ہستیاں ایسی بھی تھیں جو مغرب کی جانب سے آئی ہوئی نئی روشنی سے مسلمانوں کی زندگی کے اندھیروں کو دور کرنے کی حامی تھیں۔ ایسے لوگوں میں مرزا ابوطالب لندنی، مولوی عبدالرحیم دہری گورکھپوری، سرسالار جنگ و شمس الامرا حیدرآبادی، مرزا اسداللہ خاں غالب، لطف اللہ،

بنگال کے نواب عبداللطیف وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان روشن خیال رہنماؤں کی آواز مسلمانوں کے رجعت پسندانہ رویہ کی وجہ سے ابھر نہ سکی تھی۔[۱۸]

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔ ۱۸۹۸ء) کو مسلمانوں کی زبوں حالی کا بڑا احساس ہوا۔ اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود سرسید نے انگریزی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ دورانِ بغاوت وہ بجنور میں منصف کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے انگریز عورتوں، بچوں اور افسروں کو انقلابیوں سے بچایا تھا۔ اس موضوع پر ایک کتاب سرکشیٔ بجنور بھی لکھی۔ ۱۸۶۹ء میں سرسید کو انگلستان کا دورہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ نہ صرف وہاں کے طریقۂ تعلیم اور انجینئرنگ کے کارناموں سے متاثر ہوئے بلکہ وہاں کے لوگوں کے تہذیب و تمدن، رہن سہن کے سلیقے اور برتاو، وقت کی پابندی اور کام کی لگن سے بھی متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنے دوست نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھا۔

ALL THE NATIVES OF INDIA, HIGH AND LOW, RICH AND POOR LITERATE AND ILLITERATE BORE THE SAME RELATIONSHIP TO THE CIVILIZED, EDUCATED, INTELLIGENT ENGLISHMAN AS THE UGLIEST AND MOST CONTEMPTIBLE BEAST TO A VERY HANDSOME AND ABLE MAN" [۵۲]

سرسید نے انگلستان کی کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسیٹوں کے نظامِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کا مشاہدہ کیا۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مغربی علوم اور یہی طریقۂ تعلیم مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔ ہندستان کی دیگر قومیں خصوصاً بنگالی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ترقی کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کو انگریزی یا مغربی علوم کی طرف راغب کرنا آسان کام نہیں تھا۔ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنا کفر سمجھتے تھے۔ علی گڑھ تحریک شروع ہونے تک پورے ہندستان میں صرف ۲۰ مسلمان گریجویٹ تھے۔ سرسید نے سب سے پہلے

مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کی طرف سے لاپروائی کے رویئے کی وجوہات معلوم کیں۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر انگریزی کالجوں میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کا انتظام ہو تو وہ مغربی علم حاصل کر سکتے ہیں۔ ہنٹر بھی اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔

سرسید بخوبی سمجھتے تھے کہ انھیں اپنی تعلیمی اسکیم کی کامیابی کے لیے برطانوی حکومت کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے بارے میں انگریزوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے پہلے تو انھوں نے اپنی کتاب ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' میں کمپنی کی بدعنوانی کو ظاہر کیا اور مسلمانوں کی طرف سے صفائی پیش کی ایک دوسری کتاب ''لوائل محمڈنس آف انڈیا'' لکھ کر یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد برطانوی حکومت کی وفادار ہے۔ بائبل پر کمینٹری لکھ کر عیسائی اور مسلمان دونوں کو اہلِ کتاب ثابت کر کے ایک دوسرے کے ساتھ قربت اور دوستی کا ماحول پیدا کیا۔

۱۸۶۷ء سے پہلے ہی سائنٹی فک سوسائٹی اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا جا چکا تھا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق میں مضامین کے ذریعے سرسید مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کرتے رہے۔ مغربی علوم کی تحصیل کے لیے سرسید نے مسلمانوں کے مذہبی رویّہ میں تبدیلی لانا بھی ضروری سمجھا۔ انھوں نے مذہب اسلام کی عقلی انداز پر جدید تشریح کا کام شروع کیا۔ انھوں نے مسلمانوں کے فرسودہ عقائد پر نکتہ چینی کی، عورتوں کی تعلیم پر زور دیا، سود کو انٹریسٹ کی شکل میں لینا جائز قرار دیا۔ علما نے سرسید کی تحریک کی بہت مخالفت کی اور انھیں ''نیچری'' کا خطاب دیا۔ آخر کار سرسید احمد مغربی علوم کی جانب علما کے رویئے میں تبدیلی لانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے انگریزی تعلیم کی اسکیم میں مسلمانوں کے لیے دینی تعلیم کا بھی انتظام کر دیا۔

انگریزی کالج قائم کرنے کے لیے انھوں نے علی گڑھ کا انتخاب کیا۔ مولوی سمیع اللہ اور دیگر دوستوں کی مدد سے کالج کھولنے کے لیے فنڈ جمع کرنا شروع

کر دیا۔ یہ چندہ نہ صرف مسلمانوں سے لیا گیا تھا بلکہ امیر ہندوؤں نے بھی چندہ دیا تھا۔ مولوی سمیع اللہ کے مشورے پر تھوڑے ہی فنڈ سے ۲۹ رمئی ۱۸۷۵ء کو ایک پرائمری اسکول کھول دیا گیا۔ ۱۸ فروری ۱۸۷۷ء کو وائسرائے لارڈ لٹن نے اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ کی بنیاد رکھی۔

سرسید نے اپنے کالج کے اسٹاف میں اونچے عہدوں پر زیادہ تر انگریزوں کا تقرر کیا۔ جن میں پرنسپل بیک اور پرنسپل ماریسن کے نام قابل ذکر ہیں۔ ادارے میں نہ صرف طلبہ کے لیے مغربی علوم کی تحصیل کا انتظام کیا بلکہ ان کی تربیت کے لیے ہوسٹل کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔

علی گڑھ تحریک کا بنیادی مقصد حالاں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنا تھا۔ مگر سرسید یہ سمجھتے تھے کہ تعلیم ہی کے ذریعے مسلمان اقتصادی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے ترقی کر سکتے ہیں۔ اور درحقیقت اس تحریک سے یہی نتائج برآمد ہوئے۔ [۳۵]

تحریک شروع کیے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام وجود میں آیا۔ سرسید احمد خاں حالاں کہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے لیکن ان کی تعلیمی تحریک مسلمانوں کی اصلاح سے وابستہ تھی۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ جو کام سرسید مسلمانوں کے لیے کر رہے تھے وہی کام راجا رام موہن رائے ان سے پیشتر ہندوؤں کے لیے کر چکے تھے۔ ایسے موقع پر جبکہ انھیں برطانوی حکومت کا تعاون درکار تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کا کانگریس میں شامل ہونا مناسب نہیں سمجھا۔ جس کی وجہ سے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا گیا۔ فرقہ پرست مورخین نے انھیں دو قومی نظریے کا بانی قرار دے دیا۔ سرسید دراصل ہندو مسلم کو دو برابر قومیں مانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندستان ایک خوبصورت دلھن کی مانند ہے جس کی ہندو اور مسلمان دو خوبصورت آنکھیں ہیں۔ اگر ان میں ایک آنکھ زخمی ہو جائے تو دلھن بدصورت لگے گی۔ وہ ہندو لفظ کا مطلب ہندستان میں رہنے والے تمام لوگوں

سے لیتے تھے۔ اپنے دورِ جوانی میں وہ ہندوؤں کے تیوہار ہولی، دیوالی اور بسنت پنچمی کے میلوں میں شرکت کرتے تھے۔ ڈاکٹر تاراچند انھیں فرقہ پرست نہیں مانتے مولانا ابوالکلام آزاد ان کے سیاسی مسلک سے تو متفق نہیں تھے مگر ان کے تعلیمی کاموں کو بے حد سراہتے ہیں اور انھیں فرقہ پرست نہیں مانتے۔[۴۰]

دیوبند تحریک

۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کی جنگ میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی شہادت کے بعد بہار اور قرب و جوار کے علاقوں میں مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی نے تحریک کو جاری رکھا۔ دہلی میں شاہ عبدالعزیز کا اسکول چلانے کی ذمہ داری ان کے پوتے مولانا اسحاق نے سنبھالی۔ مولانا اسحاق کا خیال تھا کہ مذہبی اور سیاسی آزادی دو طریقوں سے حاصل ہو سکتی ہے: اوّل حنفی مذہب کی پابندی سے، دوم ترکی کے سلطان کی خلافت برقرار رکھنے سے۔

۱۸۴۱ء میں مولانا اسحاق مکّہ تشریف لے گئے۔ ۱۸۴۶ء میں مکہ ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ جانے سے پیشتر مولانا اسحاق نے اسکول اور مشن جاری رکھنے کے لیے ایک بورڈ قائم کر دیا تھا جو چار عالموں پر مشتمل تھا۔ مولانا مملوک علیؒ اس بورڈ کے چیرمین مقرر ہوئے تھے۔ مولانا قطب الدین دہلویؒ، مولانا مظفر حسینؒ اور مولانا عبد الغنی دہلوی اس بورڈ کے رُکن تھے۔ مولانا قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ مولانا قاسم نانوتویؒ (۱۸۳۲ء۔ ۱۸۸۰ء) ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں بہ نفسِ نفیس شامل ہوئے تھے۔ انھوں نے شاملی اور تھانہ بھون (ڈسٹرکٹ مظفر نگر، یوپی) میں اپنی حکومت بھی قائم کرلی تھی۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے بعد حافظ سید عابد حسین، مولانا مہتاب علی اور شیخ نہال احمد نے دیوبند کی جامع مسجد میں ایک مکتب قائم کیا تھا۔

۱۸۶۷ء میں مولانا قاسم نانوتویؒ کی کوششوں سے اسی مکتب کو دارالعلوم دیو بند کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

مولانا قاسم نانوتویؒ کا شاملی کا جہاد اور دیو بند میں دارالعلوم کا قیام ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ مولانا نے ملک کے دیگر علاقوں میں بھی اسی طرح کے اسکول کھولنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ سہارنپور، نگینہ، مرادآباد میں ایسے مدرسے قائم کیے گئے۔ ان میں مظاہر العلوم سہارنپور اور قاسم العلوم مرادآباد دیوبند کے انداز پر ہی قائم کیے گئے۔

دارُالعلوم دیوبند کے سلسلے میں مولانا قاسم نانوتوی نے حسب ذیل ہدایت دیں۔

۱۔ دیوبند کو چندہ دینا مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا۔
۲۔ طلبہ کے رہنے اور کھانے کا مفت انتظام کیا۔
۳۔ سرکار اور امیروں کی شرکت کو ممنوع قرار دیا۔
۴۔ صرف اُن ہی لوگوں کا چندہ قبول کیا جائے جو شہرت نہیں چاہتے۔
۵۔ دارُالعلوم چلانے کے لیے ایک مجلس شوریٰ قائم کی۔
۶۔ خیالات کی سختی کو ممنوع قرار دیا۔

دارُالعلوم نے ۶ سالہ نصاب کے لیے درسِ نظامیہ کو اپنایا۔ ایسے علوم کی تعلیم جائز قرار دی جس سے مسلمان اپنی روزی روٹی کما سکیں۔ دارُالعلوم کے نصاب میں حسب ذیل مضامین شامل تھے۔

قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور قواعد عروض، عربی ادب، تاریخ، سیرت، مناظرہ، منطق، فلسفہ، طب، دینیات، ارتھمیٹک وغیرہ۔ رشید احمد گنگوہی فلسفہ شامل کرنے کے خلاف تھے۔ لیکن بعد کو اس کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ ضیاءالحسن فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج تک امام غزالیؒ (۱۰۵۸ء۔ ۱۱۱۱ء) کے فلسفے کو دارالعلوم کے نصاب میں جگہ نہ مل سکی۔

اس سے بھی بڑھ کر حیرت کی بات یہ ہے کہ جس اسکول کا تعلق شاہ ولی اللہ کی تحریک اور مشن سے ہو اس کے نصاب میں "حجۃ اللہ البالغہ" شامل نہیں کی گئی۔ مولانا نانوتوی حالاں کہ جدید علوم کے خلاف نہیں تھے مگر انھوں نے کوئی ایسا عملی قدم نہیں اٹھایا جس سے دارالعلوم میں جدید علوم کو فروغ ہوتا۔ یہاں تک کہ انگریزی پڑھانے کا بھی انتظام نہیں کیا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں جامعہ کالج کے سابق پرنسپل مولانا اعزاز الدین نے دیوبند میں انگریزی تعلیم کی کلاسیں کھولیں لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی لیکن مولانا شبلی نے ندوۃ العلوم لکھنؤ میں ۱۹۰۸ء میں انگریزی تعلیم پڑھانا ضروری کر دیا تھا۔

۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء میں مولانا قاسم نانوتویؒ کا انتقال ہو گیا ان کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۸ء۔ ۱۹۰۵ء) دارالعلوم کے چیف پیٹرن منتخب ہوئے۔ وہ حدیث اور فقہ کے مانے ہوئے عالم تھے اجتہاد کے حق میں نہیں تھے صرف منقول علوم کی تعلیم کے حق میں تھے۔ لیکن سیاست میں ان کا رویہ ترقی پسندانہ تھا۔ ۱۸۸۵ء میں جب کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو انھوں نے فتویٰ جاری کیا۔ اس کے مطابق مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ تعاون جائز قرار دیا بشرطیکہ ان کے مذہبی بنیادی حقوق پر کوئی اثر نہ پڑے۔

۱۹۰۵ء میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے انتقال کے بعد دارالعلوم کے سربراہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی (۱۸۵۱ء۔ ۱۹۲۰ء) ہوئے۔ وہ اس ادارے کے پہلے شاگرد تھے۔ انھوں نے ۱۸۶۷ء میں اپنی تعلیم اسی ادارے میں شروع کی تھی۔ مولانا محمود الحسن اور ان کے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی انگریزوں کو نہ صرف ہندستان سے بلکہ تمام اسلامی ممالک سے نکالنے کی مہم چلا رہے تھے۔ بنگال کی تقسیم اور اردو ہندی کے مسائل کی وجہ سے جو انگریزوں ہی نے پیدا کیے تھے دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کی پالیسی ایک ہو گئی تھی۔ مولانا شبلی کی رہنمائی میں علما کی اکثریت کانگریس کے ساتھ رہی۔

جنگ عظیم اوّل کے اختتام پر ۱۹۱۸ء میں جب ترکی کے ساتھ زیادتیاں ہوئیں تو ہندستان کے تمام مسلمان بے چین ہو اٹھے۔ اور ہندستان کے کونے کونے میں خلافت تحریک کی شاخیں قائم کیں۔

اس موقع پر لبرل رہنما جیسے حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی شوکت علی وغیرہ بھی علما کے ساتھ ہو گئے۔ علما کی جماعت جمعیۃ العلمانے کانگریس کے ساتھ تعاون کیا۔

مہاتما گاندھی نے جو پہلے ہی رولٹ بل اور جلیان والا باغ کے حادثے کی بنا پر اپنی ستیہ گرہ تحریک شروع کر چکے تھے، مسلمانوں کی تحریک خلافت میں شرکت کرکے ترک موالات اور تحریک خلافت کا کام تیزی سے کیا۔ گاندھی جی کے عدم تشدد اور عدم تعاون کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے ۹۲۵ علما نے اس تحریک کے حق میں فتویٰ جاری کیا۔

۱۹۲۰ء میں برطانوی حکومت نے مولانا محمود الحسن کو بمبئی بھیج دیا تاکہ وہ خلافت تحریک کے پروپیگنڈے سے باز آئیں۔ وہاں مہاتما گاندھی نے ان کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ خلافت کمیٹی نے انھیں شیخ الہند کا خطاب دیا، اور مولانا وہاں بھی اپنی تحریک چلاتے رہے۔ عدم تعاون کی تحریک کے تحت جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا قیام ہوا جس کی بنیاد مولانا محمود الحسن نے ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو رکھی۔ اس ادارے نے قومی تحریک کی تمام امیدوں کو پورا کیا۔

دیوبند کے علمانے براہِ راست کانگریس میں شمولیت سے گریز رکھا۔ ۱۹۱۹ء میں اپنی ایک جماعت جمعیۃ العلما ہند قائم کرکے کانگریس سے تعاون کرتے رہے۔ اس جماعت کا مقصد ہندستان کے تمام علما کو یکجا کرکے ہندستان کے مسلمانوں کو مذہبی اور سیاسی رہنمائی دینا تھا۔ یہ جماعت ملک کی آزادی کی خواہاں تھی۔[۶]

یہ بات قابلِ حیرت ہے کہ علی گڑھ تحریک جو سماجی اور مذہبی معاملات میں

ترقی پسند تھی سیاست میں رجعت پسند ثابت ہوئی اور دیوبند تحریک جو مذہبی اور سماجی معاملات میں کچھ رجعت پسند تھی سیاست میں ترقی پسند ثابت ہوئی۔

پرارتھنا سماج

۱۹ ویں صدی کے نصف اوّل میں راجا رام موہن رائے نے برہمو سماج کی تحریک شروع کرکے ہندو سماج میں اصلاح کی بہترین روایت قائم کی تھی۔ ۱۹ ویں صدی کے نصف دوم میں اس تحریک سے متاثر ہوکر اور اس کے ردِ عمل میں بھی کئی اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اس تحریک کی بنیاد مغربی تہذیب سے ربط ضبط اور برطانوی حکومت سے رواداری پر رکھی گئی تھی۔ پرارتھنا سماج جو مہاراشٹر میں شروع ہوئی، اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ برہمو سماج ہی کی ایک شاخ تھی۔ نام اس لیے بدل دیا گیا تھا کہ کہیں برہمو سماج کی طرح یہ بھی ایک مذہب کی شکل اختیار نہ کرجائے۔ پرارتھنا سماج مہاراشٹر میں برہمو سماج کے رہنما کیشب چندر سین ہی نے قائم کیا تھا۔ لیکن اس کو عملی جامہ جسٹس مہادیو گووند راناڈے (۱۸۴۲ء۔ ۱۹۰۱ء) نے پہنایا۔

پرارتھنا سماج کا خاص مقصد ہندو سماج کی برائیوں کو دور کرنا تھا۔ پرارتھنا سماج کے مشاغل کے تحت راناڈے نے یتیم خانے، بیواؤں کے گھر اور رات کے اسکول کھولے۔ ۱۸۶۱ء میں بیواؤں کی شادی کے لیے ایک انجمن بھی قائم کی۔ راناڈے سماجی اصلاح اور مذہب کو الگ الگ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ تبدیلی پسند تھے اور ان کا یقین تھا کہ ہر چیز میں، سماج میں اور مذہب میں بھی تبدیلی آنی چاہیے۔ وہ مغربی قدروں کو ہندستانی سماج میں داخل کرنے کے حامی تھے۔ راناڈے سیاست میں کانگریس کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ سرہیوم اور گوکھلے انھیں اپنا استاد مانتے تھے۔ وہ اعتدال پسند تھے۔

دیانند سرسوتی اور آریہ سماج تحریک

دیانند سرسوتی (۱۸۲۴ئ۔ ۱۸۸۳ئ) گجرات کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۲۱ سال کی عمر تک انھوں نے ورجانند سرسوتی سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ انھوں نے عہد کیا کہ وہ ہندو سماج کی برائیوں کو دور کریں گے۔ انھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد ویدک مذہب کی تجدید پر رکھی تھی۔ وہ ویدک مذہب کو اصل مذہب مانتے تھے۔ جس میں ایک خدا کا تصوّر ہے، بُت پرستی نہیں ہے اور ذات پات کی سماجی تقسیم نہیں ہے۔ وہ ہندو مذہب کو تمام بیرونی اثرات سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو مذہب اور کلچر ہر مذہب اور کلچر سے برتر ہے اور یہ کہ مغربی تہذیب سے یا کسی اور تہذیب سے ہندو مذہب کو سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے ہندوؤں کے عبادت کے طریقوں کی تنقید کی۔ اُپنشد اور پُرانوں کو غلط بتایا۔ صرف ویدوں کو الہامی کتاب بتایا ہے۔

سماجی اور مذہبی معاملے میں دیانند سرسوتی کی آریہ سماج تحریک بہت ترقی پسند تھی۔ اس لیے انھیں روایتی ہندوؤں سے اور پنڈتوں سے کافی بحث مباحثے کرنے پڑے۔ آخر کار انھوں نے ۱۸۷۵ء میں ایک آریہ سماج مندر بھی قائم کر دیا جس میں ہر ذات کے لوگ جاکر عبادت کر سکتے تھے۔ اس مندر میں کسی دیوی یا دیوتا کی مورتی نہیں ہوتی تھی۔ دیانند سرسوتی نے اپنے نظریے کی تبلیغ کے سلسلے میں ملک کے دورے کیے اور ایک کتاب لکھی جس کا نام "ستیہ ارتھ پرکاش" ہے

دیانند سرسوتی نے خصوصاً عورتوں کی تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔ انھیں مردوں کے برابر درجہ دیا۔ بیواؤں کی شادی کو جائز قرار دیا۔ چھوٹی عمر میں شادی کے خلاف تھے۔ سمندر کے سفر کو

گناہ نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے ہندو مذہب میں شدھی کی تحریک شروع کی اور یہ کام اس لیے بھی ممکن ہو گیا کیوں کہ آریہ مذہب میں ذات پات ختم کر دی گئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ سائنس کی ترقی کے لیے بھی ہمیں مغرب سے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویدوں میں اس سلسلے میں پوری پوری رہنمائی ملتی ہے۔ ان کے ان نظریات کی وجہ سے دیانند سرسوتی کو ہندستان کا مارٹن لوتھر سمجھا جاتا ہے۔[۵]

دیانند سرسوتی نے ہندستان کے مختلف صوبوں کا دورہ کر کے اپنی تحریک کی تبلیغ کی مگر گجرات میں اس تحریک کا زیادہ فروغ نہ ہو سکا۔ پنجاب اور یو۔پی۔میں آریہ سماج تحریک سے بہت لوگ متاثر ہوئے۔ اس تحریک کی خوبی یہ تھی کہ اپنے قدیم مذہب اور کلچر کو قائم رکھتے ہوئے جدید قدروں کی حامی تھی اس طرح آریہ سماج تحریک مغربی تہذیب اور اسلامی اثر کو ہندو مذہب سے دور کرنے کی ایک بھرپور کوشش تھی

اس تحریک نے ہندو سماج کو ایک متحد قوم میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ملک کی قومی تحریک کو بھی متاثر کیا۔ لالہ ہنس راج، لالہ لاجپت رائے، سوامی شردھانند، پنڈت گرودت اور دیگر قومی رہنما، جنھوں نے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا، اس تحریک سے متاثر تھے۔ لاہور میں ۱۹۰۲ء میں دیانند اینگلو ویدک کالج قائم کیا گیا۔ جس میں ویدوں کی تعلیم کے علاوہ انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ ۱۹۰۲ء ہی میں ہردوار میں گروکل ویدک کالج کھولا گیا۔ کوشش کے باوجود سماج سدھار میں نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کے برخلاف مسلمان اور ہندوؤں میں خلیج پیدا ہو گئی۔

راما کرشنا پرم ہنسا

راما کرشنا پرم ہنسا (۱۸۳۴ء۔۱۸۸۶ء) کلکتہ کے ایک غریب برہمن خاندان

میں پیدا ہوئے تھے۔ شروع ہی سے ان کا مذہب کی طرف رجحان تھا۔ جب وہ ۲۰ سال کے ہوئے تو ۱۸۵۶ء میں ایک امیر عورت رام رسمنی نے انھیں کالی ماتا مندر (دکشینیشور) میں پنڈت مقرر کر دیا۔ تبھی سے وہ کالی ماتا کی بھگتی کرنے لگے۔ وہ بھگتی کے طریقوں سے ناواقف تھے اور دن رات اس طرح پوجا کرتے تھے کہ پاگل پن کی نوبت آچکی تھی۔ مندر میں جو لوگ پوجا کرنے آتے تھے انھیں دیوانہ اور پاگل سمجھتے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں آخر کار ایک گمنام گرو طوطا پوری نے انھیں بھگتی کی تعلیم دی۔ طوطا پوری نے انھیں بتایا کہ وہ اپنے ذہن و دل کو دنیاوی چیزوں سے بالکل ہٹا لیں۔ راما کرشنا نے جب اپنی لاچاری ظاہر کی تو طوطا پوری نے ایک شیشے کا ٹکڑا اٹھایا اور اس پر نشان لگا کر کہا کہ اس نشان پر دھیان دو۔ اس طرح راما کرشنا نے دھیان کی تربیت حاصل کر لی۔

طوطا پوری ویدانت کے نظریے کے حامی تھے۔ اس کے مطابق اُن کی نظر میں پوری دنیا مایا جال تھی۔ روحانی تجربات کے بعد راما کرشنا اس نتیجے پر پہنچے کہ مایا اور شکتی دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ راما کرشنا کا کہنا تھا کہ کسی بھی دیوی دیوتا کی بھگتی کرو مقصد ایک ہی ہے۔ مختلف مذاہب کے بارے میں ان کا یہی خیال تھا کہ یہ سب بھگوان تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں۔ آخر میں گرو طوطا پوری اپنے شاگرد کے نظریے کو صحیح سمجھنے لگے تھے۔

۱۸۶۶ء میں راما کرشنا نے اپنا روحانی مشن پہچانا۔ انھیں اپنے اوتار ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ راما کرشنا کی روحانی طاقت کا چرچا ملک کے کونے کونے میں ہو گیا۔ ہر قوم و مذہب کے لوگ ان سے ملنے آتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم خدا کی تلاش کرنے آئے ہو تو وہ انسانوں میں ملے گا۔

"ARE YOU SEEKING GOD? THEN SEEK HIM IN MAN"

انھوں نے بتایا کہ محض ذاتی مُکتی کافی نہیں ہے۔ انسانوں کے دکھ درد کو

دور کرنا، انسان کی خدمت کرنا اصل مقصدِ زندگی ہے۔ وہ تمام مذاہب کے اتحاد میں یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے وہی راستہ اپنایا تھا جو برہمو سماج کا تھا۔ برہمو سماجی سین اور ٹیگور اور آریہ سماجی دیانند سرسوتی ان کی روحانی طاقت سے بے حد متاثر تھے۔[۹]

جب انھوں نے اپنا مشن پہنچانا تو ان کے پاس بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ شاگردوں کی تعداد کثیر تھی۔ وہ ایک ایسے لائق شاگرد کی تلاش میں تھے جو ان کے مشن کو چلا سکے۔ خوش قسمتی سے ایک دن اچانک ایک پُرجوش نوجوان نریندر دت وویکانند سے ان کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے فوراً اپنے لائق شاگرد کو پہچان لیا۔

وویکانند اور راماکرشنا مشن

نریندر دت وویکانند (۱۸۶۳ء۔ ۱۹۰۲ء) بنگال کے ایک چھتری خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کلکتہ یونی ورسٹی سے بی۔ اے۔ پاس کیا۔ انھیں مغربی تہذیب کی ہوا لگ چکی تھی۔ ایک دن ان کے ساتھی انھیں درویش راماکرشنا سے ملانے لے گئے دکشنیشور جہاں راماکرشنا کالی ماتا کی بھگتی کرتے تھے ایک تیرتھ استھان بن چکا تھا۔ جیسے ہی وویکانند راماکرشنا کے سامنے پہنچے، راماکرشنا نے انھیں اس طرح سے جذبات بھرے انداز سے اور اپنائیت سے اپنے پاس بُلا کر بٹھایا جیسے کہ وہ اسے پہلے سے جانتے ہوں۔ کہنے لگے تم کہاں تھے میں تمھیں مدت سے تلاش کر رہا تھا۔ راماکرشنا نے اپنے اصل شاگرد کو پہچان لیا تھا جو ان کے مشن کو چلا سکے۔ تھوڑی ہی دیر میں راماکرشنا نے وویکانند کی پیٹھ پر اپنا سیدھا پیر بڑی زور سے مارا۔ جس سے ان کی آنکھوں کے سامنے صرف ایک دیوار کے علاوہ کچھ

نظر نہیں آرہا تھا۔ وویکانند چیخے اور کہا آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ اس کے بعد راماکرشنا ہنسے اور کہا چھوڑو، صحیح وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وویکانند کا راماکرشنا سے پہلی ملاقات کا تاثر اچھا نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص دیوانہ اور پاگل ہے اور اس کو ایک کمرے میں بند رکھنا چاہیے۔ راماکرشنا کی روحانی کشش وویکانند کو دوبارہ ان کے پاس لے آئی۔ دوسری ملاقات کے بعد وویکانند راماکرشنا کے شاگرد بن گئے۔ وویکانند بے حد ذہین تھے اور اپنے گرُو سے اکثر سوالات کرتے رہتے تھے۔ خدا کے وجود کے بارے میں راماکرشنا کے خیالات ایک بیمار ذہن کی پیداوار کہا۔ لیکن راماکرشنا نے انھیں خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کا کئی طرح سے احساس دلایا۔ آخر میں وویکانند کو یقین ہو گیا کہ راماکرشنا باہر سے بھگت اور اندر سے گیانی ہیں۔

۱۸۸۶ء میں جب راماکرشنا کا انتقال ہو گیا تو وویکانند نے غازی پور کے پاواہاری بابا سے روایتی مذہب کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن وویکانند کرم یوگی تھے یعنی عملی زندگی میں یقین رکھتے تھے۔ ان پر راماکرشنا کی تعلیم کا اثر باقی رہا۔ انھوں نے دین دکھیوں کی خدمت کرنے کا سبق سکھایا تھا۔ تمام مذاہب کا ایک مقصد بتایا تھا۔ وویکانند نے تمام مذہبوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ جدیدیت پسند تھے مگر اپنے قدیم مذہب اور کلچر کو برتر مانتے تھے۔

۱۸۹۳ء میں امریکہ میں تمام مذاہب کی ایک کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں وویکانند نے بھی شرکت کی۔ وویکانند نے اپنی تقریروں سے تمام امریکہ کے باشندوں کو بے حد متاثر کیا۔ نیویارک ہیرالڈ لکھتا ہے۔

"HOW FOOLISH IS TO SEND MISSIONARIES
TO THIS LEARNED NATION."

وویکانند نے مغرب کے سماجی استحکام کی تعریف کی مگر عیسائیت کے قول و عمل کے تضادات کی زبردست نکتہ چینی کی۔ وویکانند نے ثابت کیا کہ

انسانیت کا بلند مرتبہ جو ہندو مذہب میں ہے وہ کسی دوسرے مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے برٹش مشنری کے انسانی فلاح کے کاموں کی تعریف بھی کی۔

وویکانند نے ہندستانیوں کو ہدایت کی کہ اگر سماجی انحطاط کو ختم کرنا چاہتے ہو تو پورے عالم سے رشتہ جوڑو۔ ذات پات کی تفریق ہندوؤں کے مذہبی رسوم و تقریبات اور ان کے توہمات کی وویکانند نے بہت تنقید کی۔ آزادیٔ رائے، آزادیٔ وطن اور مساوات کی ہندستانیوں میں تبلیغ کی۔ انھوں نے کہا کہ فکر و عمل کی آزادی ہی زندگی کی اور ترقی و فلاح کی واحد شرط ہے۔

۱۸۹۸ء میں وویکانند نے لکھا کہ ہمارے اپنے وطن کے لیے ہندوئیت اور اسلام کے سنگم ہی میں امید کی شعاع نظر آتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندستان کی تاریخ صحیح انداز پر لکھی جائے مگر اس سے زیادہ انھوں نے اپنے پیرو مرشد کے مشن کو ترجیح دی۔ ۱۸۹۶ء میں وویکانند نے راماکرشنا مشن قائم کیا۔ جس کا مقصد انسانی بنیادوں پر سماجی اصلاح اور راحت رسانی تھی۔ ملک کے مختلف علاقوں میں اس کی شاخیں کھولی گئیں۔ اسکول، اسپتال، دواخانے یتیم خانے اور لائبریریاں وغیرہ قائم کی گئیں۔ ایک بار انھوں نے کہا خدائے واحد تمام روحوں کا مجموعہ ہے، میرا خدا تمام نسلوں کے غریبوں کا خدا ہے۔ مصیبت زدوں کا خدا ہے۔ انھوں نے تعلیم یافتہ ہندستانیوں کو للکارا اور کہا کہ میں ان تمام لوگوں کو غدار سمجھوں گا جنھوں نے اگرچہ غریبوں ہی کے پیسوں سے تعلیم حاصل کی ہے لیکن ان کی طرف وہ کوئی توجہ نہیں دیتے ہیں۔[۱]

---

[۱] مجیب اشرف، مسلم ایٹی چیوڈس ۔ ۔ ۔ ۔ ص ص۔ ۱۸۷۔ ۲۴۷

[۲] یوسف حسین خاں، سلیکٹڈ ڈاکومینٹس فرام دی علی گڑھ آرکائوس، ص ۱۵

(بقیہ حوالہ صفحہ ۲۵۳ اور ۲۵۴ پر ملاحظہ کیجیے)

باب ۔ ۱۲

قومی شعور کی نشوونما اور انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

نوعیت اور اسباب ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد جب ۱۸۵۸ء میں تاج برطانیہ نے ہندستان کی حکومت کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں لیا تو بظاہر ایک فیض رساں حکومت قائم کرنے کے وعدے کیے، لیکن درپردہ برطانوی سامراج کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے اقدام کیے۔ دھیرے دھیرے علمی طبقے میں احساس جاگا کہ برطانوی حکومت سے ہندستان کی فلاح کی امید رکھنا خلاف از توقع ہے۔

دراصل اب متوسط طبقے میں نیا شعور پیدا ہوا۔ انگریزی زبان اور مغربی علوم کا ہندستان میں فروغ، اخبار نویسی اور پریس ریلوے اور ٹیلی گراف کی سہولتیں قدیم ہند کی بہترین روایتوں کی کھوج مذہبی اور سماجی اصلاحیں، ان تمام اسباب نے ہندستان میں سیاسی اور ذہنی بیداری کو جنم دیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت ناکام ضرور ہوئی مگر وطن پرستی کا جذبہ ابھرا اور یہ نتیجہ نکلا۔ "A DEAD CEAZER PROVED TO BE MORE DANGEROUS THAN THE ALIVE"

درحقیقت یہ بغاوت ہندستان کی آزادی کی پہلی جنگ ثابت ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے ہیرو جیسے بہادر شاہ ظفر، جھانسی کی رانی، احمد اللہ شاہ، نانا صاحب

بیگم حضرت محل، تانتیا ٹوپے، شہزادہ فیروز شاہ اور متعدد دیگر رہنماؤں کی قربانیوں نے تحریک آزادی کے رہنماؤں کو بے حد تقویت پہنچائی اور آزادی کے جذبے کو ابھارا۔

۱۸۸۵ء میں کانگریس کے قیام سے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کی رہنمائی میں قومی تحریک کی ابتدا باقاعدہ طور پر ہوئی۔ زمیندار اور امرا طبقے کا برطانوی حکومت سے دوستانہ ربط ضبط تھا۔ اسی طبقے میں سب سے پہلے انگریزی تعلیم کا رواج ہوا۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے حکومت کی ملازمت اور دیگر علمی پیشے اختیار کیے۔ اسی طبقے کو ہندستان کا متوسط طبقہ سمجھا گیا۔

مورخین کا ایک گروپ برطانوی حکومت کی سیاسی اور اقتصادی پالیسیوں میں اور ملک کے استحصال میں قومی شعور کی اصل بنا پاتے ہیں۔ کچھ مورخین انگریزی تعلیم کے فروغ میں قومی شعور کی اصل بنا تلاش کرتے ہیں۔ انل سیل نے اپنی کتاب میں ثابت کیا کہ برطانوی دور میں بھی خوشحال برتر ذاتوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرکے قومی تحریک کے ذریعے اپنے مفاد کو برقرار رکھا۔ چنانچہ بنگال کے بھدر لوک، پونا اور بمبئی کے چتپاون برہمن، بمبئی کے پارسی اور گجرات کے ویش ذات کے لوگوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور قومی تحریک میں ان ہی لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔[۱۵] ۱۹۷۰ء میں انل سیل نے ہندستانی مورخین کی تنقید کی روشنی میں اپنے خیالات میں تبدیلی کی۔ سُمِت سرکار کا خیال ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی تعلیم نے قومی شعور پیدا کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کہ برتر ذات کے لوگوں ہی نے اپنے مفاد کی حفاظت میں انگریزی تعلیم سے فائدہ اٹھایا۔ برہمن ذات کے لوگوں کی کثیر تعداد غریبی کی زندگی گزارتی ہے۔ وہ یا تو کھانا پکانے کا کام کرتے ہیں یا مندروں اور آشرموں میں فقیرانہ زندگی گزارتے ہیں۔ سُمِت سرکار کہتے ہیں کہ انگریزی زبان کا فروغ اُن لوگوں میں ہوا جن کے پاس زمینیں تھیں

یا کسی نہ کسی طرح زمین سے منسلک تھے۔ وہ برطانوی حکومت کے قریب بھی تھے اور اقتصادی اعتبار سے خوشحال بھی[۲]

بہر حال یہ انگریزی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کسی بھی عہدِ وسطیٰ کے طبقے یا ذات سے تعلق رکھتا ہو، قومی تحریک کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اس متوسط طبقے میں خصوصاً ٹیچر، وکیل، جرنلسٹ، ملازم پیشہ لوگ، سوشل ورکر شمار کیے جاتے ہیں ابتدا میں کانگریس کی ممبرشِپ بھی انگریزی تعلیم یافتہ ہندستانیوں تک محدود تھی۔

بپن چندر کا خیال ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ ایسا نہیں تھا کہ محض اپنے ہی مفاد کے بارے میں سوچتا ہو، بلکہ ملک اور قوم کے مفاد کے بارے میں بھی سوچتا تھا۔ اس طبقے میں کافی لوگ ایسے تھے جو اپنی آمدنی سے بمشکل تمام گزر بسر کر پاتے تھے۔ البتہ یہ لوگ سرمایہ داری نظام کے حامی تھے[۳]

مغربی تعلیم کے اثرات

۱۸۱۳ء میں حکومت کے بجٹ میں ایک لاکھ روپیا مشرقی تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے پہلی بار دیا۔ ولیم بنٹنک کے دور میں سماجی اصلاحوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی دور میں لارڈ میکالے نے بڑی نیک نیتی سے ہندستانیوں میں انگریزی تعلیم کے فروغ پر زور دیا۔ انگریزی تعلیم سے ہندستانیوں کو بہت فائدہ ہوا جدید مغربی خیالات کی آمد اسی زبان کے توسط سے ہوئی۔ روسو اور والٹیئر کے آزادیِ رائے اور انسانی مساوات کے خیالات اور فرانس کے انقلاب کے نعروں سے ہندستانی واقف ہوئے۔ انگریزی زبان یقیناً قومی شعور کے فروغ کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ رابندر ناتھ کے اس خیال میں کافی صداقت تھی کہ اگر ہمیں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کرنی پڑی تو مغرب کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہوں گی اور انگلستان بھی ہمارے ساتھ ہوگا[۴]

دھیرے دھیرے مغربی خیالات اور نظریات کا اظہار ہندستان کی

علاقائی اور دیگر اہم زبانوں میں بھی شروع ہو گیا۔ انگریزی تعلیم یافتہ بنگالیوں نے بنگالی زبان میں ناول، ڈرامے اور نظمیں لکھیں اور برطانوی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ بنکم چندر چٹرجی نے اپنے ناول "آنند مٹھ" میں مادرِ وطن کی محبت کے جذبات کو ابھارا اور انگریزوں کے ظلم کی نکتہ چینی کی۔ اسی ناول میں ان کا لکھا ہوا قومی گیت "بندے ماترم" بھی شامل ہے۔ انگریزوں ہی کے خلاف سرت چندر نے ایک ناول "پاتھر دابی" لکھا، بنگالال نے ایک نظم 'اوڈ ٹو لبرٹی' لکھی جو البرٹ بل کے مسئلے پر تھی دین بندھو مترا نے اپنے ایک ڈرامے "نیل درپن" میں انگریزوں کے ظلم کی مذمت کی اور حب الوطنی کے جذبے کو ابھارا

اسی طرح دیگر زبانوں میں بھی متعدد ناول اور نظمیں لکھی گئیں جو برطانوی حکومت کے خلاف تھیں۔ اردو زبان میں متعدد ناول اور نظمیں قومی جذبات کی عکاسی کرتی ہیں خصوصاً سر محمد اقبال کا ترانہ 'سارے جہاں سے اچھا ہندستان ہمارا' آج بھی ہندستانیوں کے دل کو چھو جاتا ہے۔ اردو ہی میں انقلابی رہنما رام پرساد بسمل کی نظم 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'، ہر ہندستانی کے لب پر تھی۔

اخبار نویسی

قومی شعور کے فروغ میں اخبار نویسی نے بھی نمایاں رول ادا کیا۔ ۱۷۸۰ء میں یورپ ہی کے ایک شخص ہکی (HICKY) نے بنگال گزٹ چھاپنا شروع کیا۔ ۱۷۸۵ء میں مدراس سے مدراس کوریئر اور ۱۷۸۹ء میں بمبئی سے بمبئی کوریئر جاری کیے گئے۔ ان اخباروں میں کبھی کبھی برطانوی حکومت کی پالیسیوں کی نکتہ چینی بھی کی جاتی تھی۔

۱۹ ویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندستانی بھی اخبار نویسی سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۸۱۸ء میں جے۔ سی۔ مارشمین نے "دِگ درشن" جاری کیا۔ اسی سال "سماچار درپن" بھی شروع کیا گیا! اِن میں ہندستانیوں کی مدد لی گئی۔ بنگال

گزٹ کو ہر چندر رے نے ایڈٹ کرنا شروع کیا ۱۸۲۱ء میں بنگالی میں "سمباد کرمدی" جاری کیا۔ ۱۸۲۲ء میں راجا رام موہن رائے نے فارسی میں "مراۃ الاخبار" جاری کیا۔

۱۸۵۷ء کے بعد مقبول اخباروں میں بنگال کا ہندو پیٹریاٹ، مدراس میل، الٰہ آباد کا پائینئر، اور انگلش مین آف کلکتہ قابلِ ذکر ہیں۔ بنگال کا امرت بازار پتر کا، بہت مشہور تھا۔ اس اخبار کو سسیر کمار گھوش ایڈٹ کرتے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں سریندر ناتھ بنرجی نے بنگال، نام کا اخبار نکالنا شروع کیا۔ بنگا باسی، ۱۸۸۱ء میں اور سنجی بانی، ۱۸۸۳ء میں جاری کیے گئے۔ پونا سے دو اخبار جاری کیے گئے۔ ایک "مراٹھا، اخبار انگلش زبان میں اور دوسرا کیسری، مراٹھی زبان میں۔ ان اخباروں کو چاپیکر، اگرکر اور نام جوشی مل کر نکالتے تھے۔ بعد کو بال گنگا دھر تلک اِن دونوں اخباروں کے اڈیٹر ہوئے۔[۵]

لِٹن کی جبر و استبداد کی پالیسی

ورنا کلر پریس سے برطانوی حکومت کو بڑی فکر پیدا ہو گئی تھی۔ بورڈ آف کنٹرول کے صدر ہنری ڈنڈاز نے ۱۸۱۱ء میں اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ یہاں تک کہ منرو اور ایلفنسٹن جیسے روشن دماغ انگریز بھی فکرمند نظر آنے لگے تھے۔ انگریزوں کا ایک گروپ حکومت کی بہتری کے لیے آزاد پریس کے حق میں تھا۔ لارڈ ولزلی نے نیپولین بونا پارٹ کے حملے کے خطرے کی وجہ سے اخبار نویسی پر پابندیاں لگائی تھیں مگر لارڈ ہیسٹنگز نے ان پابندیوں کو ختم کر دیا تھا۔

اس کے بعد ۱۸۲۳ء میں قائم مقام گورنر جنرل ایڈم نے پریس پر دوبارہ پابندیاں لگا دیں۔ ان ہی پابندیوں کے خلاف پہلی بار راجا رام موہن رائے نے زبردست احتجاج کیا ۱۸۳۵ء میں لارڈ بینٹنک اور میٹکاف نے ان پابندیوں کو ہٹا دیا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں پریس پر پھر پابندیاں لگا دی گئیں۔

۱۸۵۸ء کے بعد برطانوی حکومت کی تنظیمِ نو کی گئی۔ اس دور میں لارڈ رپن

لارڈ ڈفرن اور لارڈ لینس ڈاؤن کو چھوڑ کر تمام حکمرانوں نے برطانوی حکومت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی خاطر نئے نئے اقدامات کیے اور رجعت پسندانہ رویہ اپنایا خصوصاً وائسرائے لٹن کے دور میں برطانوی سامراج اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں لٹن نے ہندستانیوں میں قومی شعور کو کچلنے کے لیے ورنا کلر پریس ایکٹ پاس کیا اور ہندستانی زبانوں کے اخباروں پر پابندی لگادی گئی۔ اسی سال آرمس ایکٹ پاس کیا۔ ہندستانیوں کو ہتھیار رکھنے کی ممانعت تھی۔ یکم جنوری ۱۸۷۷ء میں دلی دربار کیا۔ جس میں ریاستی حکمراں اور معزز افراد کو مدعو کیا گیا۔ ملکۂ وکٹوریہ کو پورے ہندستان کی ملکہ کے خطاب کا اعلان کیا گیا۔ اس دربار میں سب نے ملکہ وکٹوریہ سے وفاداری کا اعلان کیا۔ لارڈ کرزن اور لارڈ منٹو نے قومی شعور کی لہر کو دبانے کی ناکام کوشش کی۔[۵۶]

ریلوے اور ٹیلی گراف

۱۸۵۳ء میں لارڈ ڈلہوزی نے پہلی بار ہندستان میں ریل گاڑی کی سہولت بہم پہنچائی۔ اس نے سڑکیں اور نہریں بھی تعمیر کرائیں۔ اسی زمانے میں ٹیلی گراف کا بھی استعمال شروع ہوا۔ چوں کہ ہر ذات اور ہر قوم کے لوگوں کو صرف تیسرے درجے میں سفر کرنے کی اجازت تھی۔ اس لیے ریل کے سفر میں نہ صرف جغرافیائی فاصلے کم ہوئے بلکہ سماجی فاصلے بھی کم ہونا شروع ہو گئے۔ لمبے سفر میں وقت گزارنے کے لیے ملک کے حالات اور قومی موضوعات پر بھی آپس میں گفتگو ہوتی تھی۔ اس طرح بقول امباپرشاد ریلوے کے ذریعے قومی شعور کو کافی فروغ حاصل ہوا۔[۵۷] ٹیلی گراف اور سڑکوں کے ذریعے بھی آپسی فاصلے کم ہوئے تھے۔

اصلاحی تحریکیں ۱۹ویں صدی میں ہندستانی سماج میں متعدد مذہبی و سماجی اصلاحی تحریکیں رونما ہوئیں۔ کچھ ایسی تحریکیں تھیں جو مغربی تہذیب

اور جدید قدریں عام کرنا چاہتی تھیں۔ راجا رام موہن رائے کی برہمو سماج تحریک سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک اور رانا ڈے کی پرارتھنا سماج قابل ذکر ہیں۔ ان تحریکوں نے ہندستانیوں کے ذہن اور خیالات میں لچک پیدا کی۔ جس کی وجہ سے وہ جدید نظریات سے واقفیت حاصل کر سکے۔ ان کے علاوہ دیانند سرسوتی کی آریہ سماج تحریک اور ویکا نند کی تحریک راما کرشنا مشن نے اپنے مذہب اور کلچر کی برتری کو قائم رکھا۔ اس طرح ہندستانیوں میں احساس کمتری کو دور کر کے انھیں متحد ہونے کی ترغیب دی۔ ان میں قومی شعور اور حب الوطنی کے جذبات ابھارے۔

لبرل انگریز عموماً انگریز ہندستان میں اپنی حکومت برقرار رکھنے ہی میں بہتری سمجھتے تھے۔ لیکن ان میں انگریزوں کا ایک گروپ ایسا تھا جو برطانوی حکومت کی پالیسی کے خلاف تھا۔ وہ ہندستانیوں کا ہمدرد تھا اور ان کے لیے فلاحی کام کرنا اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتا تھا۔ ان میں برک، ولبرفورس، ہیمڈن، ولسن برائٹ بینٹنک، میٹکاف، میکالے، گلیڈ اسٹون، رپن، ڈفرن، اے۔ او۔ ہیوم، جان مارلے، ارون، ایٹلی، ماونٹ بیٹن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ لارڈ رپن نے ہندستانیوں کی فلاح کے لیے اتنے کام کیے کہ وہ ہندستانیوں میں محبوب حکمراں بن گئے تھے۔ ورناکلر پریس ایکٹ اور آرمس ایکٹ کو رد کیا مقامی حکومتیں قائم کیں ہندستانی ججوں کو یورپین ججوں کو برابری دینے کے لیے البرٹ بل داخل کیا۔

سیاسی جماعتوں کا عروج ابتدا میں مذہبی اور سماجی اصلاح کے لیے جماعتیں قائم کی گئیں۔ راجا رام موہن رائے نے ۱۸۱۵ء میں آتمیا سبھا اور ۱۸۲۸ء میں برہمو سماج قائم کی۔ ۱۸۲۸ء ہی میں ہندو کالج کلکتہ کے طلبہ نے ایک بحث و مباحثے کی جماعت قائم کی جس میں مختلف موضوعات پر بحث ہوتی تھی۔ جیسے آزادیِ رائے، قسمت، عقیدہ وطن پرستی وغیرہ وغیرہ۔ ۱۰ر نومبر ۱۸۲۷ء میں ڈکنس کی ہدایت پر زمینداروں نے لینڈ ہولڈرس سوسائٹی قائم کی اس کا مقصد زمینداروں کے حقوق کی حفاظت کرنا تھا۔ کسانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے بنگال برٹش انڈیا سوسائٹی

قائم کی گئی۔ بنگال ہی میں نواب عبدالطیف نے محمڈن لٹریری سوسائٹی ۱۸۵۳ء میں قائم کی۔ چارٹر پاس ہونے کے وقت طرز حکومت میں تبدیلی لانے کی خاطر ۲۸ اکتوبر ۱۸۵۱ء میں بنگال برٹش ایسوسی ایشن قائم کی گئی جس کی شاخیں بمبئی اور مدراس میں بھی قائم کی گئیں۔

بنگال برٹش ایسوسی ایشن کی سست گامی اور محدود مقاصد کی وجہ سے بنگال ہی میں ۱۸۶۰ء میں نئی سیاسی جماعتیں وجود میں آنا شروع ہو گئیں جو قومی سطح پر قائم کی گئیں۔ سسیر گھوش نے انڈین لیگ قائم کی اور آنند موہن گھوش اور سریندر ناتھ بنرجی نے انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ سریندر ناتھ بنرجی کی انتھک کوششوں سے انڈین ایسوسی ایشن کو انڈین لیگ پر فوقیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ انڈین ایسوسی ایشن پہلی قومی جماعت تھی جو قومی تحریک کی ابتدا کر چکی تھی۔ ۱۸۷۶ء میں اس کی دوبارہ تنظیم کی گئی۔ ۱۸۸۳ء اور ۱۸۸۵ء میں اس جماعت کے اجلاس کیے گئے۔ اس جماعت کی خاص مانگیں یہ تھیں کہ ہندستانیوں کو ملک کے انتظام میں حصہ دیا جائے اور ملازمتیں دی جائیں۔ آئی۔ سی۔ ایس۔ کا امتحان ہندستان میں بھی منعقد کیا جائے۔ ۱۸۸۵ء ہی میں اے۔ او۔ ہیوم کی تحریک پر انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ہوا جس کا اجلاس بمبئی میں ۲۸؍ دسمبر تا ۳۰؍ دسمبر ہوا۔[۱]

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

انڈین نیشنل کانگریس کا اصل بانی ایک ریٹائرڈ انگریز افسر ایلن اوکٹیوین ہیوم (۱۸۲۹ء۔ ۱۹۱۲ء) تھے انھیں ہندستانیوں سے ہمدردی تھی۔ ہندستانی بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ اپنے دورِ ملازمت میں زراعتی اصلاح کی اسکیم تجویز کی۔ ۱۸۵۹ء میں ایک اخبار "دی پیوپلس فرینڈ" جاری کیا۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۹ء تک وہ حکومت کے سکریٹری رہے۔ ۱۸۸۲ء میں وہ ریٹائر ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے

بعد انھوں نے ہندستانیوں کی خدمت میں اپنا تمام وقت صرف کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہندستانیوں نے وائسرے لٹن کی رجعت پسندانہ، جبر واستبداد کی پالیسی سے تنگ آکر اپنے ہمدرد انگریز ہیوم کو کثیر تعداد میں خطوط لکھے تھے۔

ہیوم نے ہندستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے اور خصوصاً کلکتہ یونی ورسٹی کے اسٹاف کو ایک پُر زور اپیل جاری کی۔ اس اپیل میں ہیوم نے ہندستانیوں کو ایک انجمن بنانے کا مشورہ دیا۔ اپیل میں یہ بھی واضح کر دیا کہ اس انجمن کے قیام میں بیرونی لوگوں پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ اور ہندستانیوں کو اس میں آگے بڑھنا چاہیے۔ اس ہمدردانہ اپیل کا تعلیم یافتہ طبقے نے خیر مقدم کیا۔ ہیوم نے اپیل جاری کرنے سے پیشتر وائسرائے لارڈ ڈفرن سے صلاح مشورہ کر لیا تھا انھوں نے بڑے رازدارانہ انداز میں ایسی انجمن کی ضرورت کی تائید کی تھی اور ان کا خیال تھا کہ ہندستانیوں کی انجمن نہ صرف سماجی اور اقتصادی مقاصد کے حصول کے لیے کام کرے گی جس کے لیے ہیوم اسے قائم کر رہے تھے بلکہ یہ حکومت کے کاموں پر کڑی نظر رکھ کر حکومت کے نظام کو بہتر بنا سکتی ہے جس طرح انگلستان میں مخالف جماعت کام کرتی ہے۔

ان مقاصد کے پیشِ نظر بمبئی میں ۲۸ دسمبر تا ۳۰ دسمبر ۱۸۸۵ء میں ہندستانی رہنماؤں کا پہلا جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسے میں ۷۲ لوگوں نے شرکت کی۔ اس جماعت کا نام شروع میں انڈین نیشنل یونین تجویز کیا گیا مگر بعد کو طے پایا کہ اس کا نام انڈین نیشنل کانگریس رکھا جائے۔ کانگریس کے اس پہلے اجلاس میں دادا بھائی نوروجی فیروز شاہ مہتا، بدرالدین طیب جی، کے۔ ٹی تلنگ، آر ایم سیانی، اے۔ ایم۔ دھرمسے کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس جلسے کی صدارت کے فرائض ڈبلو سی بنرجی نے انجام دیے۔ ہیوم کو کانگریس کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ وہ اس عہدے پر ۱۹۰۷ء تک رہے۔

۱۸۸۵ء ہی میں سریندر ناتھ بنرجی نے انڈین ایسوسی ایشن کا دوسرا اجلاس

کیا تھا۔ کانگریس کے منتظم خاص کے۔ٹی تلنگ نے سریندر ناتھ بنرجی سے ان کے اجلاس کے منٹس بھی حاصل کیے مگر حیرت ہے کہ سریندر ناتھ بنرجی کو پہلے کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے مدعو نہیں کیا گیا۔[۹۵]

بقول این۔ ایل۔ چٹرجی ہیوم نے کانگریس قائم کر کے کوئی نئی بات پیدا نہیں کی تھی۔ ایک جماعت انڈین ایسوسی ایشن ۱۸۷۶ء سے ہی موجود تھی۔ نئی بات اس میں یہ تھی کہ کانگریس جماعت ایک سیفٹی والو کی طرح استعمال کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی تاکہ برطانوی حکومت کے خلاف بغاوتوں کو روکا جا سکے۔ ساتھ ہی سریندر ناتھ بنرجی کی انقلابی جماعت کو ناکام کر دیا جائے۔ بقول گوکھلے کانگریس کو صرف ایک انگریز ہی قائم کر سکتا تھا۔ کیوں کہ برطانوی حکومت ہندستانیوں کو اس طرح کی جماعت قائم کرنے کی کبھی اجازت نہیں دیتی۔ کئی سال تک برطانوی حکومت کا کانگریس کے ساتھ تعاون رہا۔ ہیوم نے کانگریس کے پہلے جلسے میں ایسے ہی لوگوں کو مدعو کیا تھا جن کی برطانوی حکومت سے وفاداری مشتبہ نہیں تھی اور جو اعتدال پسند تھے۔ کانگریس کے حسب ذیل مقاصد سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہیوم نے یہ جماعت ہندستانیوں کے اقتصادی اور سماجی حالات کو بہتر بنانے کے لیے قائم کی تھی نہ کہ سیاسی مقاصد یا ملک کو آزاد کرانے کے لیے۔ کانگریس کے مقاصد اور مطالبے حسب ذیل تھے

(۱) ملک کی فلاح و بہبود کے لیے اتحاد اور دوستی قائم رکھنا۔

(۲) سماجی تفریق دور کرنا، براہ راست گفت و شنید سے ملک کے تمام محنت کش لوگوں میں نسلی، مذہبی اور صوبائی فرق ختم کرنا اور اتحاد سے قومی جذبہ مضبوط کرنا۔

(۳) ملک کے اہم مسائل پر ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کی رائے کا ریکارڈ رکھنا۔

(۴) عوام کی فلاح کا کام کرنے والے سیاستدانوں کے لیے طریقۂ کار کا تعین کرنا۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے کانگریس کے پہلے اجلاس میں حسب ذیل تجاویز پاس کی گئیں۔

(۱) برطانوی حکومت کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے۔

(۲) سکریٹری آف اسٹیٹ کی مدد کے لیے انڈین کونسل کو ختم کرکے ایک (اسٹیرنگ) کمیٹی مقرر کی جائے۔

(۳) شمال مغربی صوبے، اودھ اور پنجاب میں قانون ساز مجلسیں قائم کی جائیں۔

(۴) مرکزی اور صوبائی کونسلوں میں منتخب شدہ ہندستانیوں کو متناسب نمایندگی دی جائے اور بجٹ پر بحث کرنے کا حق دیا جائے۔

(۵) فوج پر بجٹ کم کیا جائے

(۶) انگلستان اور ہندستان دونوں جگہ آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امتحان کا انعقاد کیا جائے۔[۱]

سریندرناتھ بنرجی (۱۸۴۸ء۔ ۱۹۲۵ء) کی جماعت کے بھی تقریباً یہی مقاصد اور یہی مانگیں تھیں۔ غالباً ان کی اشتعال انگیز تقریروں اور انقلابی خیالات سے انگریزوں کو خطرہ لاحق تھا۔ بعد کو سریندرناتھ بنرجی بھی کانگریس میں شامل ہوگئے تھے۔ اور اعتدال پسندی کے حامی تھے۔

جسٹس گووند مہادیو رانا ڈے (۱۸۴۲ء۔ ۱۹۰۱ء) کافی عرصے سے پرارتھنا سماج کے تحت ہندستانی سماج کی اصلاح اور فلاحی کاموں میں مصروف تھے۔ ۱۸۷۴ء میں انھوں نے برطانوی حکومت سے ہندستانیوں کی نمایندگی کی مانگ کی تھی۔ وہ کانگریس کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ اعتدال پسند تھے۔ ہیوم اور گوکھلے انھیں اپنا سیاسی گرو مانتے تھے۔

دادا بھائی نوروجی (۱۸۲۵ء۔ ۱۹۱۷ء) اعتدال پسند تھے انگریزوں کے انصاف پر انھیں بھروسا تھا۔ لیکن ہندستان کی برطانوی حکومت کی اقتصادی

پالیسی کی بے حد نکتہ چینی کرتے تھے۔ ایک کتاب "UN-BRITISH INDIA"
انھوں نے اسی موضوع پر لکھی۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے پہلے جلسے میں
شریک ہوئے۔ لندن میں بھی کانگریس کا کام کرتے رہے۔ ایک لندن
انڈین سوسائٹی اور دوسری ایسٹ انڈین سوسائٹی قائم کی۔ ۱۸۹۳ء میں لاہور
کے اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا کہ حکومت تو ہتھیاروں
سے قائم کی جا سکتی ہے مگر ملک صرف اخلاقی اصولوں پر ترقی کر سکتا ہے۔ ۱۹۰۶ء
میں دادا بھائی نوروجی کی زیرِ صدارت کانگریس کے جلسے میں کانگریس نے
سوراج یا خود اختیاری حکومت — (SELF — GOVERNMENT)
— قائم کرنے کا مقصد معین کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر انگریز انصاف کریں
تو انھیں ہندستان کو آزاد کرنا ہی ہوگا۔ وہ بمبئی سے ایک اخبار "راست
گفتار" نکالتے تھے۔ پیار سے لوگ انھیں "گرانڈ اولڈ مین" کہتے تھے۔[۱]

فیروز شاہ مہتا (۱۸۴۵ء۔ ۱۹۱۵ء) بھی کانگریس کے بانیوں میں سے تھے۔ تلنگ
اور طیب جی کے ساتھ انھوں نے ۱۸۸۵ء میں بمبئی پریسی ڈنسی ایسوسی ایشن قائم
کی تھی۔ ۱۸۸۶ء میں بمبئی ودھان سبھا کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۸۹۲ء سے
۱۵ سال تک بمبئی پریشد کے اور ۱۳ سال تک مرکزی قانون ساز مجلس کے رکن
رہے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں سے اچھے تعلقات رکھنے ہی میں فائدہ ہے۔
۱۹۰۷ء میں سورت کانگریس کے اجلاس میں انھوں نے اعتدال پسند گروپ کا ساتھ دیا۔

اعتدال پسند گروپ میں سب سے زیادہ مقبولیت گوپال کرشن
گوکھلے (۱۸۶۶ء۔ ۱۹۱۵ء) کو حاصل ہوئی۔ ۱۸۸۹ء میں کانگریس میں شامل
ہوئے اور ۱۹۱۵ء میں انتقال کے وقت تک کانگریس جماعت کی روحِ
رواں اور قومی تحریک کے اوّل رہنما رہے۔ وہ بمبئی کے مشہور فرگسن کالج
کے ایک ممتاز استاد تھے۔ اخلاقی قدروں کے حامی تھے۔ راناڈے کی تحریک
پر بمبئی سارو جنک سبھا کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۲۲ سال کی عمر میں گوکھلے بمبئی کی قانون ساز مجلس

کے ممبر بن گئے تھے۔ پہلے بمبئی کانگریس کے سکریٹری مقرر ہوئے، ۱۸۹۵ء میں کانگریس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں مرکزی قانون ساز مجلس کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں صرف ۳۹ سال کی عمر میں بنارس میں کانگریس کے اجلاس کے صدر منتخب کیے گئے۔ ۱۹۰۵ء ہی میں انھوں نے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی قائم کی۔ ۱۹۰۷ء میں سورت کے کانگریس اجلاس میں انتہا پسند گروپ نے اعتدال پسندوں کی پالیسی کے خلاف کانگریس سے علاحدگی اختیار کی مگر گوکھلے نے کانگریس کو روایتی انداز پر جاری رکھا۔ ۱۸۹۲ء کے کونسل ایکٹ کی بے حد نکتہ چینی کی تھی۔ ۱۹۰۹ء کے کونسل ایکٹ کو پہلے تو سراہا مگر بعد میں نکتہ چینی کی۔ ۱۹۱۲ء میں افریقہ گئے اور گاندھی جی کی ستیہ گرہ تحریک میں شامل ہوئے۔ گوکھلے اصل میں گاندھی جی کے اخلاقی کردار اور تصور سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں ہندستان مدعو کیا۔

گوکھلے کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کانگریس تحریک میں اعتدال پسندی کو ایک نظریہ کی شکل دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز ہندستانیوں کے ساتھ انصاف کریں گے اس لیے ہندستانیوں کو انگریزوں سے تعلقات اچھے رکھنے چاہییں۔ وہ برطانوی حکومت کو خدا داد حکومت کا درجہ دیتے تھے۔ اپنے حقوق منوانے کے لیے انقلابی سرگرمیوں کے مقابلے میں دستوری طریقوں کو ترجیح دیتے تھے۔ دستوری طریقوں میں وہ تمام کارروائیاں شامل تھیں جو پُرامن طور پر گفت و شنید کے ذریعے مسائل کا حل چاہتی تھیں۔ جیسے درخواست کرنا اپیل کرنا میمورنڈم بھیجنا وغیرہ وغیرہ۔ انتہا پسند گروپ کے لوگ انھیں کمزور دل (FAINT HEARTED) رہنما کہتے تھے۔ انھی اعتدال پسند رہنماؤں نے خصوصاً گوکھلے نے کانگریس تحریک کو بتدریج نئی منزلوں تک پہنچایا۔ کونسلوں میں نمایندگی کا حق مانگنے کی منزل سے نکل کر یہی اعتدال پسند کانگریس تحریک کو خود اختیاری حکومت کے مطالبے کی منزل تک لے کر آئے مگر اپنا طریقۂ کار نہیں بدلا۔[۱۲]

کانگریس نے اپنے جائز مطالبات کے حصول کے لیے تقریباً ۳۰ سال تک دستوری طریقے سے جدّوجہد کی مگر برطانوی حکومت نے ان مطالبوں کو بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا۔ ۱۸۸۵ئ سے ۱۹۱۵ئ تک کانگریس کی جدّوجہد کا صرف یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ برطانوی حکومت نے دو کونسل ایکٹ پاس کیے۔ پہلا ۱۸۹۲ئ میں جس کے مطابق کونسلوں میں الیکشن کے ذریعے ہندستانی رکن بڑھائے گئے الیکشن کا طریقہ وائس رائے کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا اور نمایندوں کو بجٹ پر بحث کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۰۹ئ کے کونسل ایکٹ کے تحت کونسلوں میں ہندستانی ممبروں کی تعداد بڑھادی گئی۔ مگر وائس رائے نے اپنے نامزدگی کے اختیار سے سرکاری ممبروں کی اکثریت برقرار رکھی۔ اس ایکٹ نے جداگانہ فرقہ واری انتخاب کا حق دے کر ہندو مسلم میں خلیج پیدا کر دی۔ اس طرح برطانوی حکومت نے کانگریس کے اصل مطالبات کو نظر انداز کیا۔ آخرکار کانگریس نے مایوس ہوکر اپنے مقاصد میں تبدیلی کی اور خود اختیاری حکومت حاصل کرنا اپنا نصب العین بنایا

۱۔ بپن چندر، گروتھ آف اکنامک نیشنلزم ان انڈیا
انل سیل، ایمرجینس آف انڈین نیشنلزم
سُمت سرکار، موڈرن انڈیا، ص ص، ۲۴ - ۳۸

۲۔ ایضاً، ص ۶۶

۳۔ بپن چندر، مذکورہ بالا

۴۔ سرکار، مذکورہ بالا

۵۔ انل سیل، مذکورہ بالا

(بقیہ حوالہ صفحہ ۲۵۶ میں)

باب - ۱۳

کانگریس میں انتہا پسند گروہ کا عروج

کانگریس کی ۲۰ سالہ جدوجہد کی ناکامی، رہنماؤں کی حد سے زیادہ اعتدال پسندی اور محدود مقاصد، برطانوی حکومت کا جارحانہ رویّہ یہ تمام اسباب کانگریس جماعت میں انتہا پسند گروہ کے عروج میں محرّک تھے۔

بنگال کی تقسیم

۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم نے ہندستانیوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام کیا۔ وائس رائے لارڈ کرزن بھی ولزلی، ڈلہوزی اور لٹن کی طرح برطانوی شہنشاہیت کو ہندستان میں مضبوط سے مضبوط تر کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے انتظامی، تعلیمی اور اقتصادی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ کچھ اہم کام جو اُس نے کیے وہ قابل تعریف تھے۔ مثلاً زراعت کے فروغ کے لیے پوسا انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ ایک آرکیالوجی کا محکمہ قائم کر کے قدیم عمارتوں کو محفوظ رکھنے کا کام کیا۔ پولیس کے محکمے اور تعلیم کے میدان میں بھی کچھ سدھار کیے۔ اس کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ بنگال صوبہ جو رقبے اور آبادی کے لحاظ سے انگلینڈ سے بھی بڑا تھا، اس میں انتظامی سہولت کے پیشِ نظر دو صوبوں میں تقسیم کر دے۔ جیوں ہی لارڈ کرزن نے اس اسکیم کا اعلان کیا پورے بنگال میں شور برپا ہو گیا۔ کرزن نے بنگال کا دورہ کیا اور اپنے منصوبے کو اب دوسرے انداز سے بنایا۔ اس نے دیکھا کہ بنگال میں قومی جذبہ ابھر رہا ہے۔

اور اس کا استحصال بے حد ضروری ہے۔ اس لیے اس نے اپنے نئے منصوبے میں بنگال کی تقسیم اس طرح کی کہ ہندو اور مسلمانوں میں اور ہندو ہندوؤں میں تفریق پیدا ہو جائے۔

۷ جولائی ۱۹۰۵ء کو بنگال کی تقسیم کا آخری اعلان کر دیا گیا۔ اس کے مطابق شمال مشرقی بنگال اور آسام کو ایک مسلم صوبے کی شکل دی۔ اور مغربی بنگال میں ہندی بولنے والوں کی تعداد ۲۰ ملین اور بنگالی بولنے والوں کی تعداد ۱۷ ملین رکھی۔ مسلمانوں کو تسلی اور لالچ دیا کہ وہ علاحدہ رہ کر زیادہ خوش حال رہیں گے۔ زبان کی بنیاد پر ہندوؤں میں تفریق پیدا کر دی۔

سودیشی اور بائیکاٹ تحریک بنگال کی تقسیم پر کانگریس کے رہنماؤں نے بنگال میں سودیشی تحریک شروع کر دی۔ ابتدا میں کانگریس کے تمام رہنما شامل تھے کیوں کہ سب بنگال کی تقسیم کے خلاف تھے۔ احتجاج میں سریندر ناتھ بنرجی بہت پیش پیش تھے انھوں نے بنگال کی تقسیم کو ایک بڑی قومی بربادی (GRAND NATIONAL DISASTER) سے منسوب کیا۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک تقریباً ۲ ہزار احتجاجی جلسے منعقد کیے گئے۔ ستّر ہزار دستخطوں پر مشتمل ایک میمورنڈم سکریٹری آف اسٹیٹ کو بھیجا گیا۔ اخبارات میں کالے حاشیے کے ساتھ کرزن کی مذمت کی گئی۔ بنرجی اور مترا نے انگریزی کپڑے اور تمام انگریزی چیزوں کے بائیکاٹ کا نعرہ لگایا۔ طلبہ نے انگریزی کلاسوں کا بائیکاٹ کیا، بیماروں نے انگریزی دوائیں استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ موچیوں نے انگریزوں کے جوتوں کی مرمّت کرنا بند کر دی۔ سودیشی تحریک ۱۸۷۴ء ہی میں شروع ہو چکی تھی جب برطانوی حکومت نے بمبئی، احمد آباد اور کلکتہ کے کارخانوں میں تیار شدہ کپڑے پر بھاری ٹیکس لگا کر مانچسٹر کے کپڑے کو مقبول کرنے کی مہم چلائی تھی۔ تقسیم بنگال کے بعد سودیشی تحریک میں اور شدّت پیدا ہو گئی کرزن کا پُتلا جلایا گیا۔ اسی زمانے میں پرنس آف ویلس نے ہندستان میں دورہ کیا۔

ان کے خیر مقدم کا بائکاٹ کیا۔ ہر طرف بندے ماترم کے نعرے فضا میں گونجنے لگے۔ رہنماؤں کی گرفتاریوں سے سودیشی تحریک میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ ؎۱
یہ تحریک صرف بنگال تک محدود نہیں رہی بلکہ ایک قومی تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں کانگریس کے جلسے میں سودیشی تحریک اور بائکاٹ کے حق میں تجاویز پاس کی گئیں۔ اسی میں کانگریس نے اپنا مقصد خود اختیاری حکومت حاصل کرنا متعین کیا۔

بنگال میں خصوصاً آروبندو گھوش (۱۸۷۲ء۔ ۱۹۵۰ء) نے سودیشی تحریک اور بائکاٹ کو ایک قومی نظریے کی شکل میں پیش کیا۔ ؎۲ اس تحریک میں ایک طوفانی انداز سے شامل ہوئے اور پوری تحریک پر چھا گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا ملک محض ایک ماں نہیں ہے بلکہ ہماری ماتا دیوی ہے جس کے لیے قربانیاں دینا ہمارا فرض ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ آروبندو نے وطن پرستی اور مذہب کو ایک ہی سکے کے دو رُخ ثابت کر دیا۔ "HE ELEVATED PATRIOTISM INTO A RELIGION AND TRANSFORMED RELIGION INTO PATRIOTISM" ؎۳

آروبندو گھوش نے کانگریس کے دستوری طریقۂ احتجاج کی سخت نکتہ چینی کی اور کانگریس کو UN-NATIONAL CONGRESS کہا۔ انھوں نے قومی مقاصد حاصل کرنے کے لیے خاموش احتجاج یا مقاومت بے مزاحمت (PASSIVE RESISTANCE) کے طریقے کو اپنانے کی ترغیب دی۔ اس کے مطابق انگریزی چیزوں کا بائکاٹ لازمی قرار دیا۔ یعنی انگریزی کپڑا، چینی، نمک، دوا اور دیگر تمام انگریزی مصنوعات کا بائکاٹ۔ انھوں نے انگریزی طریقۂ تعلیم کا بھی بائکاٹ کیا۔ ایک نیشنل کونسل آف ایجوکیشن قائم کی۔ اس کے تحت ملک کے کونے کونے میں قومی اسکول کھولے گئے۔ اس نظریے کے تحت آخری حربے کے طور پر تشدد یا ہنسا کا استعمال بھی کیا جا سکتا تھا۔ آروبندو نے اپنے نظریات کی تبلیغ کرنے کے لیے 'یوگانتر' میں مضامین لکھے۔ 'بندے ماترم' نام کا اپنا ایک اخبار بھی نکالا۔ آروبندو کی

یہ تحریک اتنی پُرجوش تھی کہ جو لوگ بائکاٹ کے حق میں نہیں تھے وہ بھی اس میں شامل ہوگئے۔ انھیں ۱۹۰۸ء میں گرفتار کرلیا گیا۔ رہائی کے بعد انھوں نے پانڈی چری میں اپنا آشرم قائم کیا۔ اس کے بعد سیاست میں حصّہ نہیں لیا۔[۳۵]

بنگال ہی میں ایک دوسرے پُرجوش انتہا پسند رہنما بپن چندر پال (۱۸۵۸ء۔ ۱۹۳۲ء) تھے۔ بہترین مقرّر تھے۔ بنگال کی تقسیم ہی کے زمانے میں سیاست میں داخل ہوئے۔ انھوں نے بھی سودیشی تحریک، بائکاٹ اور قومی تعلیم کے خیالات کی تبلیغ کی۔ وہ انگریزوں سے سوراج خیرات کے طور پر لینا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ حق کے طور پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اخبار ''نیو انڈیا'' اور بندے ماترم میں مضامین لکھتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں کلکتہ کانگریس میں شرکت کی اور بائکاٹ کی وسیع معنوں میں تشریح کی۔ مدراس میں ایک اشتعال انگیز تقریر کرنے کے جرم میں ۱۹۰۷ء میں انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ رہا ہونے کے بعد سیاست چھوڑ دی۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس میں شریک ہوئے۔

سودیشی تحریک ہندستان کے دوسرے صوبوں میں بھی پھیل گئی۔ پنجاب کے لالہ لاجپت رائے (۱۸۶۵ء۔ ۱۹۲۸ء) بھی اس میں شامل ہوگئے۔ ۱۸۸۸ء میں وہ کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔ ابتدا میں آریہ سماج سے متاثر ہو کر اصلاحی کاموں میں مصروف رہے۔ لاہور کے ڈی۔ اے۔ وی کالج کو قائم کرنے میں انھوں نے حصّہ لیا۔ انھوں نے میزنی، گیری بالڈی، شیواجی، لارڈ کرشنا اور سوامی دیانند کی زندگی کے حالات لکھے۔ بعد کو اصلاحی کاموں کے مقابلے میں ہندستان کی آزادی کو زیادہ ضروری سمجھا۔ ۱۹۰۵ء میں گوکھلے کے ساتھ انگلستان کا دورہ کیا اور وہاں ملک کے حالات بتائے۔ ۱۹۰۷ء میں پنجاب میں پانی کے ٹیکس کی در بڑھانے پر برطانوی حکومت کے خلاف لالہ لاجپت رائے نے احتجاج کیا۔ حکومت نے انھیں گرفتار کر کے منڈالے کی جیل میں قید کر دیا۔ ۱۹۱۴ء میں وہ انگلستان اور بعد کو امریکہ گئے۔ وہاں ۶ سال تک رہے۔ وہاں تین کتابیں لکھیں، 'دی آریہ سماج'

'ینگ انڈیا، اور 'انگلینڈس ڈیبٹ اِن انڈیا'۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ واپس ہندستان آئے تو کلکتہ میں کانگریس کے ایک مخصوص اجلاس کے صدر منتخب کیے گئے۔

لالہ لاجپت رائے دراصل مہاتما گاندھی کی ستیہ گرہ تحریک کے حامی نہیں تھے۔ وہ انتہا پسند گروپ بال اور پال کے ساتھ تھے۔ اسی وقت سے انتہا پسند گروپ کو بال پال اور لال کے نام سے جانا گیا۔ حالاں کہ آروبندو گھوش بھی اس گروپ کے سرگرم رکن تھے۔ سوراج پارٹی کے قیام میں سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو کے ساتھ تھے۔ الیکشن میں مرکزی اسمبلی میں منتخب کیے گئے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے تو زبردست حامی تھے مگر ہندوؤں کے مفاد کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے پنڈت مالویہ کے ساتھ انھوں نے ہندو سنگٹھن تحریک شروع کی۔

۲۰ ؍اکتوبر ۱۹۲۸ء کو لاہور میں جب وہ سائمن کمیشن کے بائکاٹ کے سلسلے میں ایک احتجاجی جلوس کی سرکردگی کر رہے تھے پولیس نے ان پر لاٹھیاں برسائیں۔ بے حد زخمی ہو گئے تھے۔ ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ لاٹھیاں پڑتے وقت لالہ لاجپت رائے نے کہا تھا۔
"THE LATHI BLOWS INFLICTED UPON HIM WOULD PROVE ONE DAY, NAILS IN THE COFFIN OF THE BRITISH EMPIRE" ۴

انتہا پسند گروپ میں جن کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی وہ بال گنگا دھر تلک (۱۸۵۶ء۔ ۱۹۲۰ء) تھے۔ ۲۳ ؍جولائی ۱۸۵۶ء کو مہاراشٹر کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کر کے پونا میں نیو اسکول کھولا۔ اور کیسری اور مرہٹہ اخبار نکالے۔ تلک نے ایک اینٹی کاؤ کلنک سوسائٹی قائم کی۔ اکھاڑے اور لاٹھی کلب قائم کیے۔ گنپتی میلے کی تنظیم کی، اور ۱۸۹۵ء میں شیوا جی تحریک شروع کی۔ ان کی تحریک کے چار خصوصی پہلو تھے جن کے لیے زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ اوّل 'سوراج' وہ کہتے تھے کہ سوراج میرا پیدائشی حق ہے جس کو میں لے کر رہوں گا۔ سوراج کے نعرے کو سب سے زیادہ تلک نے مشہور کیا۔ دوسرا سودیشی یعنی ہندستان میں ہر چیز کی پیداوار کرنی چاہیے اور دیسی چیزوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ تیسرے بائکاٹ یعنی برطانیہ کی تمام چیزوں کے استعمال سے ہندستانیوں کو گریز کرنا چاہیے۔

اسی معاملہ میں تلک اور گوکھلے میں اختلاف ہوئے۔ چوتھا قومی تعلیم یعنی قومی اسکول اور کالج کھولے جائیں جن میں اپنے مذہب اور کلچر کی تعلیم دی جائے۔ تلک ۱۸۹۷ء میں پہلی بار اشتعال انگیز تقریروں کی وجہ سے گرفتار کیے گئے۔ اور ۱۸ مہینے کی قید بامشقت کی سزا ملی۔

سورت میں کانگریس کا اجلاس

بنگال کی تقسیم سے تمام کانگریسی رہنما ناراض تھے ۱۹۰۶ء کے کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں سودیشی تحریک اور بائکاٹ کے حق میں تجویزیں پاس کی گئی تھیں۔ ۱۹۰۷ء میں کانگریس کا سورت اجلاس ہوا۔ گوکھلے بائکاٹ کے حق میں نہیں تھے۔ ۱۹۰۶ء کی بائکاٹ کے حق میں پاس کی گئی تجویز کا رپورٹ میں کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بال گنگا دھر تلک کو صدر بننے دیا اور نہ ہی انھیں تقریر کرنے دی۔ اعتدال پسند لیڈر راش بہاری گھوش کو جلسے کا صدر بنایا۔ اس کارروائی سے انتہا پسند گروپ ناراض ہو گیا۔ اور نیشنل پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔ مولانا حسرت موہانی بھی تلک کے ساتھ تھے۔

۱۹۰۸ء میں یورپین افراد کے قتل کے الزام میں تلک اور آروبندو گھوش کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ قتل دراصل چاپیکر برادرس نے کیے تھے۔ انتہا پسند عموماً تشدد کے طریقوں سے گریز کرتے تھے اور انھوں نے مقاومت بے مزاحمت یعنی (PASSIVE RESISTANCE) کا طریقہ اپنایا تھا۔ تاہم اس طریقے میں بحالت مجبوری یا ضرورت پر تشدد کا استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تلک اور آروبندو گھوش پر قتل کا شک تھا اور کم از کم مشتعل کرنے کا الزام تو یقینی تھا۔[۵]

اس لیے ان گرفتاریوں سے انتہا پسند گروپ کی تحریک دب گئی اور اعتدال پسند گوکھلے کانگریس جماعت کے سربراہ ۱۹۱۵ء تک بنے رہے۔ لیکن اس زمانے میں کانگریس کی شہرت کو زبردست دھکا پہنچا۔ انتہا پسند گروپ کی تحریک حالاں کہ صرف چند سال جاری رہ سکی لیکن اس چھوٹی سی مدت میں پورے ملک میں زبردست بیداری پیدا ہو گئی۔ عوام آزادی کے نعرے سے واقف

ہوئے اس تحریک نے ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس تحریک کی نکتہ چینی کرتے ہوئے ڈاکٹر امبا پرشاد کہتے ہیں کہ انتہا پسند گروپ نے اپنی تحریک کو مذہبی رنگ دے کر قومی تحریک کو نقصان پہنچایا۔[6]

---

[1] سُمت سرکار۔ موڈرن انڈیا۔ ص ص۔ ۹۶-۹۵
مزید دیکھیے: پرتاپ سنگھ، بھارت کا آدھونک اِتہاس اور آر۔ آر۔ سیٹھی۔ اے کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا

[2] سرکار۔ مذکورہ بالا۔ ایضاً
مزید دیکھیے، امبا پرشاد، "سودیشی اور بائکاٹ" (چنڈی گڑھ ہسٹری کانگریس)

[3] ایضاً

[4] سرکار، مذکورہ بالا، ایضاً
امبا پرشاد، مذکورہ بالا

[5] ایضاً

[6] ایضاً

باب - ۱۴

تھیاسوفیکل سوسائٹی اور ہوم رُول تحریک

مسز اینی بسنٹ اور ہوم رُول تحریک ۱۹۱۴ء میں بال گنگا دھر تلک رہا کیے گئے۔ اس وقت اوّل جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ تلک کے رویے میں کافی نرمی آچکی تھی۔ انھوں نے ہندستانیوں کو جنگ میں حصّہ لینے کی ترغیب دی۔ تلک کانگریس میں بھی شریک ہونا چاہتے تھے۔ تھیاسوفیکل سوسائٹی کی صدر مسز اینی بسنٹ (۱۸۴۷ء-۱۹۳۳ء) نے کوشش کی کہ تلک کو کانگریس میں شامل کر لیا جائے۔ مگر گوکھلے اور فیروز شاہ مہتا کی مخالفت کی وجہ سے کامیابی نہ ہو سکی۔

مادام ایچ۔ پی بلاوتسکی اور کرنل ایچ۔ ایس الکاٹ نے تھیاسوفیکل سوسائٹی امریکہ میں قائم کی تھی۔ ۱۸۸۶ء میں وہ لوگ ہندستان آئے۔ یہ لوگ عالمی انسانی برادری کے مبلغ تھے۔ ہندو مت، بدھ مت اور زرتشت جیسے قدیم مذاہب کی تجدید کرنے کے علم بردار تھے۔[1]

مسز اینی بسنٹ ۱۸۹۳ء میں ہندستان آئی تھیں۔ تھیاسوفیکل سوسائٹی کی ممبر کی حیثیت سے ہندستان میں ۲۰ سال تک سماجی، مذہبی اور تعلیمی اصلاحوں میں مصروف رہیں۔ بھگوت گیتا کا ترجمہ کیا۔ بچپن کی شادی کو روکنے کی کوشش کی اور بیواؤں کے لیے کام کیے۔ عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ دلانے کے کام

کیے۔ بنارس میں سنٹرل ہندو اسکول اور کالج قائم کیے۔ جو بعد میں بنارس ہندو یونی ورسٹی بن گیا۔

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک وہ تھیاسوفیکل سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے انگلستان کا دورہ کرتی رہیں۔ وہاں انھوں نے آئرلینڈ کے رہنما ریڈمنڈ (REDMUND) کی ہوم رُول تحریک کے فروغ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ جب تک ہندوستانیوں کو آزادی نہیں ملے گی اس وقت تک اصلاحی کاموں میں زیادہ کامیابی نہیں ہوگی۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ آئرلینڈ کے انداز پر ہندستان میں بھی ہوم رُول تحریک چلانی چاہیے۔ انھوں نے ہوم رُول لیگ قائم کرنے کا اعلان ۱۹۱۵ء میں کیا مگر اس کی مخالفت کانگریس کے رہنماؤں نے کی اور کہا کہ جو کام کانگریس کر رہی ہے اسی کام کو کرنے کے لیے دوسری جماعت قائم کرنا کیا ضروری ہے؟۔

تلک اور ہوم رُول تحریک بال گنگا دھر تلک جو پہلے ہی سوراج تحریک چلا چکے تھے انھیں یہ نظریہ بہت پسند آیا۔ وہ ابھی کانگریس میں شامل بھی نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ تلک نے مسز اینی بسنٹ سے پہلے اپریل ۱۹۱۶ء میں ہوم رُول لیگ مہاراشٹر میں قائم کر دی۔ ۱۹۱۵ء میں گوکھلے اور فیروز شاہ مہتا کے انتقال کے بعد تلک ۱۹۱۶ء میں کانگریس میں شامل کر لیے گئے اور مسز اینی بسنٹ نے بھی ستمبر ۱۹۱۶ء میں ہوم رُول لیگ قائم کر دی۔ اس طرح تلک اور مسز اینی بسنٹ نے مل کر پورے ملک میں ہوم رُول تحریک چلائی۔ ہوم رُول تحریک کے پروگرام کے تحت اینی بسنٹ یہ چاہتی تھیں کہ مرکزی اور صوبائی کونسلوں کی تشکیل ہندستانیوں کے منتخب شدہ نمایندوں کی بنیاد پر کی جائے۔ وہ کہتی تھیں کہ ہندستان میں بھی حکومت اسی جمہوری انداز سے قائم ہو جس طرح انگلستان میں ہوتی ہے [۱]۔ انھوں نے کہا کہ اوّل جنگ عظیم میں ہندستانیوں کی وفاداری کا صلہ آزادی کی شکل میں ملنا چاہیے۔ ۱۹۱۷ء میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ مگر ۳ ماہ بعد رہا کر دیا۔ ۱۹۱۷ء میں انھیں انڈین نیشنل کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔

مسز اینی بسنٹ سودیشی کے حق میں تو تھیں مگر بائکاٹ تحریک کے حق میں نہیں تھیں۔ وہ مہاتما گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک سے بھی متفق نہیں تھیں اس لیے کانگریس چھوڑنی پڑی۔[۳] لیکن ہندستانیوں کی فلاح کے کاموں میں آخر وقت تک مصروف رہیں۔

تلک نے امن کمیٹی کے صدر کلیمنسو کو خط لکھا تھا کہ وہ ہندستان کا بھی مسئلہ حل کریں۔ اینی بسنٹ اور تلک کے علاوہ دیگر رہنما بھی ہوم رول تحریک میں سرگرم رہے۔ مدراس کے سبرامنیم آئر (۱۸۵۱-۱۹۱۶ء) نے امریکہ کے صدر وڈرو ولسن کو ایک خط لکھا کہ وہ آزادی اور خود مختار حکومتوں کے حامی ہیں اور غلام ملکوں کے چیمپین سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ ہندستان میں خود اختیاری حکومت قائم کرانے کی کوشش کریں۔ چیمسفورڈ اور مونٹیگو اس کارروائی پر ناراض ہوئے۔ سبرامنیم کو تنبیہ کی کہ وہ آئندہ ایسا نہ کریں۔ اس پر سبرامنیم نے اپنے تمام خطابات حکومت کو واپس کر دیے۔[۴]

ہوم رول تحریک کے پروپیگنڈے سے انگلستان کی لیبر پارٹی اور انصاف پسند انگریز بھی ہندستان کو آزادی دینے کے حق میں ہوگئے تھے۔ ایک پارلیمنٹ کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کا کام ہندستان میں خود اختیاری حکومت قائم کرنے کے امکانات پر غور کرنا تھا۔ اس تحریک کا ہی اثر ۱۹۱۹ء کے ایکٹ پر پڑا۔ اس وقت ہندستان کی تمام جماعتیں خصوصاً کانگریس اور مسلم لیگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئی تھیں۔ ۱۹۱۶ء کا لکھنؤ پیکٹ ہوچکا تھا۔ کانگریس کے دو گروپ اب متحد ہوچکے تھے۔ ان کا مقصد ایک تھا یعنی خود اختیاری حکومت حاصل کرنا۔ یہ سب کچھ اینی بسنٹ اور تلک کی کوششوں سے ہوا تھا۔[۵]

برائے حواشی۔ ۱۔ ۵ تک حسب ذیل کتابیں ملاحظہ کیجیے۔ سُمیت سرکار، موڈرن انڈیا، ص ص ۱۴۹۔۱۵۳

آر۔ سی۔ مجومدار، ہسٹری آف دی فریڈم موومینٹ ان انڈیا جلد ۲، ص ص ۳۴۹۔۳۷۹

بپن چندر، موڈرن انڈیا، ص ص ۲۵۷۔۲۵۸۔

باب - ۱۵

آل اِنڈیا مُسلم لیگ کا قیام

شملہ وفد ایک طرف تقسیم بنگال کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو دوسری طرف برطانوی حکومت کی طرف سے ہندستانیوں کو کونسلوں میں مزید نمایندگی دینے کے بارے میں سوچا جا رہا تھا۔ ۳۰ جولائی ۱۹۰۶ء کو نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس علی گڑھ نے محسن الملک، سکریٹری علی گڑھ کالج کو خط لکھا کہ مسلمان بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔ علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچبولڈ نے وائس رائے کے سکریٹری کرنل ڈنلاپ اسمتھ کو مسلمانوں کے ایک وفد کی گزارشات سننے کو آمادہ کر لیا۔ اس وفد کی رہنمائی کے لیے سر آغا خاں کو منتخب کیا گیا، آغا خاں کے انگریزوں سے بہت رسوخ تھے۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو اس وفد نے وائس رائے لارڈ منٹو کو شملے میں ایک ایڈریس پیش کیا۔ اس ایڈریس میں حسب ذیل مخصوص حقوق مانگے گئے تھے۔

۱۔ ہندو اور مسلمانوں کے حلقے جدا جدا کر دیئے جائیں اور خالص جداگانہ انتخاب ہوں۔

۲۔ حکومت کی ملازمتوں میں مسلمانوں کو حصّہ دیا جائے۔

مسلم لیگ کا قیام ۹ر نومبر ۱۹۰۶ء کو نواب سلیم اللہ خاں صاحب بہادر ڈھاکہ نے ایک تحریر جاری کی جس میں یہ تجویز کیا گیا کہ ایک مسلم جماعت بنام "مسلم آل انڈیا کانفیڈریشن" قائم کی جائے ساتھ ہی دسمبر کے

آخر میں تمام مسلمان رہنماؤں اور جماعتوں کو ڈھاکہ میں جمع ہونے کی دعوت بھی دی۔ اسی وقت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ بھی ڈھاکہ میں منعقد کیا گیا۔ اس طرح ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو نواب وقار الملک کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ہوا۔ اس جماعت کے حسب ذیل مقاصد تھے۔

۱۔ مسلمانانِ ہند کے دل میں برطانوی حکومت کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا۔ اور گورنمنٹ کی کسی کاروائی کے متعلق جو غلط فہمی پیدا ہو اُسے دور کرنا۔

۲۔ مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کی نگہداشت اور ان کی ضروریات اور خواہشوں کو مؤدبانہ طریقے سے گورنمنٹ میں پیش کرنا۔

۳۔ لیگ کے دیگر مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانانِ ہند میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ ہوں

۴۔ اسی جلسے میں وقار الملک سکریٹری اور محسن الملک جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔

۱۹۱۱ء تک یعنی کُل ۵ سال تک مسلم لیگ تنگ نظری کا شکار رہی بنگال کی تقسیم کی منسوخی کے بعد اب مسلم لیگ کی سیاست نے بھی کروٹ لی۔ مسلم لیگ برطانوی حکومت کے خلاف ہو گئی۔ خود اختیاری حکومت حاصل کرنا اپنا مقصد بنایا۔

مُسلم لیگ اور کانگریس کا اِشتراک

۲۲/۲۳ مارچ ۱۹۱۲ء کو سر محمد شفیع صاحب کی صدارت میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کے مقاصد میں حسب ذیل تبدیلیاں لائی گئیں۔

(۱) مسلمانوں میں سلطنت برطانیہ کی وفاداری کے خیالات پھیلانے کی جگہ ملک کے لوگوں میں تاج برطانیہ کی وفاداری کے خیالات پھیلانا قائم کیا گیا۔

(۲) ہندستان کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جگہ ہندستان کے مسلمانوں کے سیاسی اور دیگر حقوق کی حفاظت و ترقی درج کیا گیا۔

(۳) تاج برطانیہ کے تحت سوئٹ ایبل حسب حال سیلف گورنمنٹ حاصل کرنا مقصد رکھا گیا۔

(۴) مسٹر مظہر الحق کی تحریک پر ایک تجویز پاس ہوئی کہ ہندستان کے دونوں فرقے یعنی ہندو اور مسلمان مل کر ترقی کریں۔

مسلم لیگ کے اس جلسے میں سروجنی نائیڈو اور دیگر کانگریسی لیڈر بھی شامل ہوئے تھے۔ اسی جلسے سے مسلم لیگ اور کانگریس کے اشتراک کی ابتدا ہوئی۔ مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں، راجا محمود آباد صدر منتخب ہوئے اور سر سید وزیر حسین دوبارہ سکریٹری مقرر ہوئے۔[۵۲]

میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء

مسلم لیگ نے جو قدم ۱۹۱۵ء میں بمبئی کے اجلاس میں اٹھایا تھا وہ اپنی انتہائی منزل پر لکھنؤ کے اجلاس میں پہنچا، جب مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ۱۹۱۶ء میں منعقد ہوا تھا۔ اسی سال کانگریس کا اجلاس بھی لکھنؤ ہی میں ہوا تھا۔ کانگریس کے لیڈر مسلم لیگ کے اجلاس میں بکثرت موجود تھے۔ ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتہ کرنے کے سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ لکھنؤ کے اجلاس میں پیش کی گئی اور منظور کر دی گئی۔ یہ اسکیم میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء کے نام سے مشہور ہوئی۔ میثاق کی تفصیل حسب ذیل ہے۔[۵۳]

۱۔ مرکزی اسمبلی میں ۴/۵ منتخب شدہ ممبر ہوں گے جن میں ۱/۳ مسلمان ہوں گے۔

۲۔ صوبجاتی کونسلوں میں ۴/۵ منتخب شدہ ممبر ہوں گے اور ۱/۵ نامزد شدہ ممبر ہوں گے۔

۳۔ مسلم اقلیت کے لیے جداگانہ انتخاب باقی رہے گا اور مسلمانوں کی نیابت مختلف صوبوں میں حسب ذیل ہوگی:

(۱) پنجاب میں ۵۵ فیصدی (۲) بنگال میں ۵۲ فیصدی (۳) بمبئی میں ۲۰ فیصدی (۴) صوبہ متحدہ میں ۱۴ فیصدی (۵) مدراس میں ۷ فیصدی (۶) صوبہ متوسط میں ۴ فیصدی۔

۱؎ سید طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ص۔ ۳۵۲۔ ۳۹۶
دیکھیے، کے۔ کے۔ عزیز، دی میکنگ آف پاکستان
۲؎ منگلوری، مذکورہ بالا، ایضاً
۳؎ مشیر الحسن، نیشنلزم اینڈ کمیونل پالیٹکس ان انڈیا، ص ص۔ ۵۔ ۲۲۶۔ ۲۳ - ۵۶۰

باب۔ ۱۶

گاندھی جی کا عروج

گاندھی جی کی تحریک کا افریقہ میں آغاز

موہن داس کرم چند گاندھی (۱۸۶۹ء۔ ۱۹۴۸ء) ۲؍ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پوربندر، کاٹھیاواڑ، گجرات کے ایک خوشحال خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں انگلستان گئے۔ وہاں سے قانون کی ڈگری حاصل کرکے ۱۸۹۱ء میں ہندستان واپس آئے۔ پہلے راجکوٹ اور بعد کو بمبئی میں وکالت کی۔ ۱۸۹۲ء میں بمبئی کے ایک مشہور مسلم تاجر سیٹھ عبدالکریم نے گاندھی جی کو اپنا وکیل مقرر کرکے دکنی افریقہ کے شہر نیٹل بھیجا۔

دکنی افریقہ میں ہندستانی مزدوروں کی کثیر تعداد روزی روٹی کی تلاش میں آکر بس گئی تھی۔ وہاں کی یوروپین حکومت کا رویہ ہندستانیوں کے ساتھ بے حد خراب تھا۔ ہندستانیوں کو قُلی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ہندستانی مزدور بغیر پرمٹ کے کارخانوں میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ کورٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہیٹ اتارنے کی رسم تھی۔ مگر گاندھی جی مجسٹریٹ کے سامنے گئے تو انھوں نے ہیٹ اتارنے سے انکار کر دیا اور کورٹ سے واپس چلے گئے۔

ڈچ حکومت کی ٹرانسوال کالونی میں ہندستانیوں کی حالت نیٹل شہر سے زیادہ خراب تھی۔ وہ رات کو ۹ بجے کے بعد بغیر پرمٹ کے نہیں نکل سکتے تھے۔

ٹرانسوال میں داخل ہونے کے لیے تین پونڈ چنگی ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ فٹ پاتھ پر ہندستانیوں کا چلنا ممنوع تھا۔ ایک بار گاندھی جی فٹ پاتھ پر جا رہے تھے کہ انھیں ایک پولیس مین نے مارا۔ ریل میں سیکنڈ یا فرسٹ کلاس میں ہندستانی سفر نہیں کر سکتے تھے۔ ایک بار ایک یورپین نے گاندھی جی کو فرسٹ کلاس کے ڈبّے سے باہر نکال دیا تھا۔ ہندستانی لوگ وہاں زمین نہیں خرید سکتے تھے۔ جوہنسبرگ میں گاندھی جی کو ایک ہوٹل میں داخل نہیں ہونے دیا۔

گاندھی جی نے ان تمام نسلی امتیازات اور زیادتیوں کے خلاف افریقہ میں تحریک شروع کر دی۔ پہلے اس تحریک کا نام مقاومت بے مزاحمت یعنی (PASSIVE RESISTANCE) رکھا۔ لیکن بعد کو کافی غور و خوض کے بعد انھوں نے اپنی تحریک کو ستیہ گرہ کے نام سے پکارنا پسند کیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ اوّل پہلا نام انگریزی زبان میں تھا۔ دوم اس میں تشدّد کے استعمال کا امکان تھا۔ جبکہ گاندھی جی کی تحریک کی بنیاد عدم تشدّد اور سچائی پر تھی۔

پہلے گاندھی جی نے تمام ہندستانیوں کو سچ بولنے کی نصیحت کی اور سمجھایا کہ تجارت کے پیشے میں بھی سچ بولا جا سکتا ہے۔ صحت و صفائی سے رہنے کی تلقین کی۔ ہندستانیوں کے سماجی اور مذہبی اختلافات دور کر کے متحد کیا۔ ایک جماعت بھی قائم کر دی۔ اسی جماعت کے پلیٹ فارم سے انھوں نے ریل میں ہندستانیوں کو اوّل درجے میں سفر کرنے کا حق حاصل کرنے کی تحریک شروع کی جس میں گاندھی جی کو کامیابی ہوئی۔

گاندھی جی نے دوسری تحریک انڈین فرنچائز بل کے خلاف شروع کی۔ اس کے مطابق ہندستانیوں کو ووٹ کے حق سے محروم کیا جا رہا تھا۔ گاندھی جی نے اسپیکر سے بہ ذریعہ ٹیلی گراف درخواست کی کہ اس بل کو اس وقت تک پاس نہ کیا جائے جب تک ہندستانیوں سے گفتگو نہ کر لی جائے۔ دو دن بحث کے بعد بل پاس کر دیا گیا۔

نیٹل کے ۱۰ ہزار ہندستانیوں کے دستخط سے لندن میں سکریٹری آف اسٹیٹ رپن کو ایک عرضداشت بھیجی۔ اسی کو چھپوا کر افریقہ، ہندستان اور انگلستان کے اخباروں میں خبریں بھیجیں۔ اس طرح ایک ماہ تک یہ تحریک چلتی رہی۔ نیٹل انڈین کانگریس قائم کی۔ گاندھی جی نے دو پمفلٹ نکالے۔ اس طرح ہندستانیوں میں کافی بیداری پیدا ہو گئی۔ اور گاندھی جی ہندستانیوں کے مسیحا سمجھے جانے لگے۔

گاندھی جی نے ٹرانسوال جاکر اپنی تحریک شروع کی۔ وہاں بوئر جنگ میں ڈچوں کی شکست کے بعد انگریزوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ انھوں نے پہلے نیٹل سے ٹرانسوال جانے کے لیے پرمٹ کے طریقے کے خلاف تحریک شروع کی۔ اس میں گاندھی جی کو کامیابی ملی، مزدوروں کو رہنے کی جگہ دلانے کو گاندھی جی نے تقریباً ۷۰ مقدمے لڑے۔ ایک کے علاوہ سب میں کامیابی ہوئی۔

فونیکس میں زمین لے کر ایک پریس قائم کیا۔ زراعت شروع کی۔ جوہنسبرگ میں ایک کوآپریٹیو فارم بنایا جس کا نام تالستائی فارم رکھا۔

ٹرانسوال کی حکومت نے ایک ایشیاٹک بل داخل کیا جس کے مطابق ۸ سال سے اوپر کے ہندستانیوں کو رجسٹریشن کرانا، فنگر پرنٹ دینا اور ہر وقت ایک سارٹیفکٹ اپنے ساتھ رکھنا لازمی قرار دیا۔ قانون کی خلاف ورزی پر انھیں قید کی سزا دی جا سکتی تھی۔ ۳۱ جولائی ۱۹۰۷ء کو یہ قانون لاگو کر دیا گیا۔ گاندھی جی نے جوہنسبرگ میں تمام ہندستانیوں کو جمع کر کے تقریر کی اور تحریک شروع کر دی۔ ۱۶ اگست ۱۹۰۸ء کو دو ہزار ہندستانیوں نے جوہنسبرگ میں اپنے سرٹیفکٹ جلا دیے۔ گاندھی جی نے بھی قانون کی خلاف ورزی کی اور انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۸ء کو رہا ہوئے تو فوراً ستیہ گرہ تحریک شروع کر دی۔ اور تیسری بار انھیں جیل بھیج دیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں لندن گئے اور وہاں تحریری کارروائی کرتے رہے۔ دکنی افریقہ کی حکومت کو آخر کار یہ بل رد کرنا پڑا۔

گاندھی جی کی جد و جہد سے ۳۰ جون ۱۹۱۴ء میں عہد نامہ ہوا اور انڈین ریلیف

بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ جولائی میں یہ قانون بن گیا جس کے مطابق ہندستانیوں کی شادیاں قانونی قرار دے دی گئیں۔ ۳ پونڈ کا ٹیکس بھی ختم کیا گیا۔ اب ہندستانی ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جا سکتے تھے مگر اجازت لے کر۔ دکھنی افریقہ میں پیدا ہونے والوں کو اجازت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ۱۹۲۰ء تک ہندستان سے مزدوروں کو لانے کا طریقہ ختم کیا جانا طے پایا۔ اس طرح گاندھی جی کا افریقہ کا مشن ختم ہوا۔ ۱۸ر جولائی ۱۹۱۴ء کو وہ انگلستان چلے گئے۔[۱]

ہندستان میں گاندھی جی کی ستیہ گرہ تحریک کا آزمائشی دور

۱۹۱۲ء میں گوکھلے افریقہ گئے تھے اور گاندھی جی کے ساتھ ستیہ گرہ تحریک میں حصہ لیا تھا۔ وہ گاندھی جی کی زندگی کے اخلاقی پہلو سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کو ہندستان آنے کی دعوت دی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں افریقہ کے مشن سے فارغ ہو کر انگلستان چلے گئے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں وہ ہندستان واپس آئے۔ گاندھی جی ہندستان کی سیاست میں داخل ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مگر گوکھلے اُن کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کو سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شامل کرنا چاہا، مگر کچھ لوگوں نے مخالفت کی کیوں کہ انھیں گاندھی جی کے طریقے اور خیالات عجیب لگتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں گاندھی جی نے سابرمتی (گجرات) میں اپنا ایک آشرم قائم کیا۔ اس کا مقصد لوگوں کو ستیہ گرہ کے طریقوں کی جان کاری دینا اور تربیت کرنا تھا۔

گاندھی جی نے افریقہ میں تالستائی کی زندگی اور نظریات کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ "A KINGDOM OF GOD IS WITHIN YOU" افریقہ میں ۱۹۰۸ء میں جب انھیں گرفتار کیا تو جیل میں انھوں نے تھورو (THOREAU) کا ایک مضمون پڑھا تھا جس کا عنوان تھا "CIVIL DISOBEDIENCE"

جس میں اس نے ۱۸۴۹ء میں امریکہ کی حکومت کی غلامی اور میکسیکن جنگ کے مسائل پر تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے رسکن، ہکسن اور پلیٹو کا بھی مطالعہ کیا بائبل، گیتا اور قرآن کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ تمام نظریات گاندھی جی کے خیالات سے کافی مشابہت رکھتے تھے۔ گاندھی جی نے ان نظریات کی آزمائش پہلے تو افریقہ میں کی تھی۔ اور اب وقت آگیا تھا کہ وہ اپنے ان نظریات کی آزمائش ہندستان میں کریں گے۔

۱۹۱۷ء میں مدن موہن مالویہ انڈینچر سسٹم کو ختم کرنے کے لیے کونسل میں ایک بل پیش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وائسرائے نے انکار کر دیا۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہ کے طریقے کی آزمائش کے لیے ۳۱ر جولائی کو تحریک شروع کر دی۔ لیکن فوراً ہی حکومت نے مزدوروں کو کرایے پر نوکریاں دنیا بند کر دی تھیں۔ اس طرح ستیہ گرہ کی آزمائش نہ ہوسکی۔

چمپارن میں زمیندار اور یورپین نیل کی کاشت کرنے والے کسانوں پر بے حد ظلم وتشدد کرتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں گاندھی جی نے ستیہ گرہ تحریک شروع کی۔ کسانوں کو متحد کر کے کسانوں کے حقوق کا حکومت سے مطالبہ کیا۔ حکومت کو گاندھی جی کا مطالبہ اور کسانوں کے حقوق ماننے پڑے۔ یہ گاندھی جی کی ستیہ گرہ تحریک کی ہندستان میں پہلی کامیاب آزمائش تھی۔

اس کے بعد احمد آباد میں کپڑے کے کارخانے کے مزدوروں کے لیے گاندھی جی نے ستیہ گرہ تحریک چلائی۔ مزدور کافی عرصے سے اپنی مزدوری بڑھانے کی مانگ کر رہے تھے۔ مہاتما گاندھی نے انھیں ہڑتال کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن شرط یہ لگائی کہ تشدد سے گریز کریں۔ گاندھی جی نے انھیں تاکید کی کہ وہ اس وقت تک کام پر نہ جائیں جب تک مانگیں پوری نہ ہو جائیں۔ دو ہفتے تک تو اسٹرائک کامیابی سے چلی مگر بعد میں پھوٹ پڑنی شروع ہو گئی۔ گاندھی جی نے تمام مزدوروں کا ایک جلسہ کیا اور اس میں انھوں نے عہد کیا کہ وہ اس وقت تک کھانا نہ کھائیں گے

جب تک مزدوروں کی مانگیں پوری نہ ہو جائیں۔ اس اعلان سے تمام مزدور متحد ہو گئے۔ آخر کار ۲۱ دن کی اسٹرائک کے بعد حکومت کو مزدوری بڑھانی پڑی۔

اس مہم کے فوراً بعد گاندھی جی نے کھیدا (کھیڑا) ضلع کے کسانوں کے لیے ستیہ گرہ تحریک شروع کر دی۔ قانون کے مطابق ۲۵ فیصد سے کم فصل پر لگان نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ لیکن حکومت پھر بھی لگان وصول کر رہی تھی۔ حکومت نے گاندھی جی کی اور کسانوں کی درخواست پر کوئی غور نہیں کیا تو گاندھی جی نے کسانوں سے کہا کہ حکومت ان پر کتنا ہی ظلم کرے یہاں تک کہ ان سے زمینیں چھین لے مگر وہ لگان ادا نہ کریں۔ اس تحریک میں گاندھی جی کا ساتھ وہاں کے مقامی رہنما ولبھ بھائی پٹیل نے دیا تھا۔ آخر کار حکومت کو لگان معاف کرنا پڑا[۵]

رولٹ بل

گاندھی جی کی اپیل کے باوجود برطانوی حکومت نے ۱۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو رولٹ بل پاس کر دیا۔ گاندھی جی پہلے ہی ستیہ گرہ تحریک چلانے کے سلسلے میں ایک کانفرنس کر چکے تھے۔ جس میں ولبھ بھائی پٹیل اور سروجنی نائیڈو شامل تھے۔ ستیہ گرہ کے عہد نامے پر سب نے ۲۴ فروری ۱۹۱۹ء کو دستخط کیے تھے۔ گاندھی جی نے بمبئی میں ایک ستیہ گرہ سبھا منعقد کی۔ گاندھی جی نے بحیثیت صدر اس سبھا میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ ۳۰ مارچ اس ہڑتال کی تاریخ طے پائی تھی بعد کو بدل کر ۶ اپریل کر دی گئی۔ اس اپیل کا پورے ہندستان میں بڑا پُر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ لاہور، امرتسر، دلی اور ہندستان کے دیگر بڑے شہروں میں ہڑتال شروع ہو گئی۔ گاندھی جی نے مختلف مقاموں کا دورہ شروع کیا۔ دلی میں ہڑتالیوں کے جلوس پر پولیس نے گولیاں چلائیں۔ کئی لوگ شہید ہو گئے۔ لیکن جوش کم نہیں ہوا۔

جلیان والا باغ کا حادثہ

۷ اپریل کو گاندھی جی دلی اور پنجاب کے دورے پر نکلے۔ انھیں پلول کے اسٹیشن پر روک لیا اور ۱۰ اپریل کو واپس بمبئی بھیج دیا۔ دلی کے لوگ اس پر مشتعل ہوئے۔ وہ

پولیس کے خلاف تشدد پر آمادہ ہو گئے۔ اس وجہ سے گاندھی جی کو ستیہ گرہ کی تحریک کو ملتوی کرنا پڑا۔ اس پر کچھ لوگ ناراض ہوئے، مگر گاندھی جی کا کہنا تھا کہ لوگ ستیہ گرہ کی تحریک کا مطلب نہیں سمجھے ہیں۔ انھیں ابھی تربیت کی ضرورت ہے۔

ادھر پنجاب میں لیفٹنی نینٹ گورنر مائکل۔ او۔ ڈائر نے بربریت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اخبارات پر پابندی لگائی جا رہی تھی۔ فوج میں زبردستی ہندستانیوں کو شامل کیا جا رہا تھا۔ فوج تیار کرنے کے لیے زبردستی فنڈ حاصل کیے جا رہے تھے۔ ۳۰ مارچ اور ۶ اپریل کی ہڑتالیں خاموشی سے گزر گئیں۔ لیکن ۹ اپریل کو پنجاب کی حکومت نے وہاں کے مقبول رہنما ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر کچلو کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیے۔ ۱۰ اپریل کو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعہ سے وہاں کے عوام میں غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ اور جب انھوں نے یہ سنا کہ گاندھی جی کو پنجاب کا دورہ کرنے سے روک دیا گیا ہے تو اور بھی زیادہ مشتعل ہوئے۔ ہڑتالیں ہوئیں جلوس نکالے گئے، ہڑتالیوں نے تشدد کا استعمال کیا اور کئی یوروپین کو قتل کر دیا۔ کئی عمارتیں برباد کر دیں۔ ۱۱ اپریل کو بریگیڈیر جنرل ڈائر فوج کا کمانڈر مقرر ہو کر آیا تھا۔ اس نے بغیر اعلان کیے مارشل لا لاگو کر دیا۔ مارشل لا حالاں کہ ۱۵ اپریل سے لاگو ہونا تھا، مگر ڈائر نے ۱۲ اپریل ہی سے گرفتاریاں شروع کر دیں۔ جلوس پر پابندی لگا دی۔ اسی دن ہڑتالیوں نے ۱۳ اپریل کو بوقت ۴½ بجے جلیاں والا باغ میں ایک عام جلسہ کا اعلان کیا۔ ڈائر کو اس جلسے کا علم تھا مگر اس نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ جوں ہی جلسہ شروع ہوا، ڈائر فوج لے کر آ گیا۔ تمام راستے بند کر دیے گئے اور گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اس جلسے میں چھے ہزار سے دس ہزار تک مرد، عورتیں اور بچے شریک تھے۔ لوگ جان بچانے کے لیے راستے تلاش کرتے تھے مگر تمام راستے بند تھے۔ کچھ مرد اور عورتیں گولیوں کے ڈر سے کنویں میں کود گئے۔ ایک خیال کے مطابق اس فائرنگ میں ۳۷۹ جانیں گئیں اور ۱۲۰۰ زخمی ہوئے۔

سی۔ ایف اینڈریوز نے اس حادثے کی مزمت کی اور جلیان والا باغ کے اس حادثے کو ڈائر کا ایک سوچا سمجھا جابرانہ قتل عام ("A COLD CALCULATED MASSACRE") قرار دیا جس کو نہ تو حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی معاف کیا جا سکتا ہے۔ نرم گروپ کے تمام رہنما جیسے موتی لال نہرو، اینی بسنٹ وغیرہ گاندھی جی کی رہنمائی میں حکومت کے خلاف سخت سے سخت تحریک چلانے کے حق میں ہو گئے۔ رابندرناتھ ٹیگور نے نائٹ ہڈ سے استعفا دے دیا۔ ہنٹر کمیٹی اور کانگریس کمیٹی دونوں ہی نے اس حادثے کی الگ الگ چھان بین کی۔ ہنٹر کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ حادثہ ستیہ گرہ تحریک کی وجہ سے ہوا۔ دونوں کمیٹیوں نے جنرل ڈائر کو مورد الزام ٹھہرایا۔ اس نے دو زبردست غلطیاں کیں، اوّل تو فائرنگ کرنے سے پہلے اس نے عوام کو خبردار نہیں کیا۔ دوم بہت دیر تک فائرنگ جاری رکھی۔

ان حالات کے پیش نظر گاندھی جی نے ۱۸ اپریل ۱۹۱۹ء کو ستیہ گرہ تحریک ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے ستیہ گرہیوں سے اپیل کی کہ وہ فی الحال تعمیری کاموں میں مصروف ہو جائیں اور ہندو مسلم اتحاد قائم کریں۔[۱]

۱۔ ڈی شیٹن، مہاتما گاندھی۔ اے گریٹ لائف، ص ص۔ ۱۰۱-۴۵
ملاحظہ کیجیے، گاندھی، این آٹو بائیوگرافی
ملاحظہ کیجیے، لوئی فشر، دی لائف آف مہاتما گاندھی
۲۔ شیٹن، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۹۷-۱۴
آر۔ سی۔ مجومدار، دی ہسٹری آف دی فریڈم مومنٹ آف انڈیا
این۔ کے۔ بوس، گاندھی ان انڈین پولیٹکس، ص ص۔ ۴۴-۱۶۰
۳۔ ایضاً۔ اور ہی۔ ڈی۔ کوشک، دی کانگریس آئیڈیالوجی اینڈ پروگرام
۴۔ ایضاً۔ اور مون۔ گاندھی اینڈ موڈرن انڈیا

باب ۔ ۱۷

ترک موالات کا دور

تحریک خلافت اور ترک موالات

۱۹۱۹ء کا رولٹ بل، ۱۹۱۹ء میں جلیان والا باغ کا حادثہ ہنٹر کمیٹی کی مایوس کُن رپورٹ اور ۱۹۱۹ء کے ایکٹ سے بے اطمینانی اور پھر پہلی جنگ عظیم کے بعد سیورس کے معاہدے (۱۹۲۰) میں ترکی کے ساتھ زیادتیاں اور ہندستانی مسلمانوں سے وعدہ خلافی، جس کے تحت لائڈ جارج نے وعدہ کیا تھا کہ میسوپوٹامیہ، سیریا، فلسطین، جزیرۃ العرب اور تھریس خلیفہ کے ماتحت رہیں گے۔ لیکن جب معاہدہ ہوا تو ایسا نہیں ہوا۔ ترکی کے ایشیائی حصے فرانس اور انگلستان نے آپس میں تقسیم کر لیے اور تھریس یونان کو دے دیا۔[1]

جب خلیفہ کے ساتھ ناانصافی کی گئی تو تمام مسلمان مشتعل ہو گئے اور انھیں بے حد صدمہ ہوا۔ مہاتما گاندھی نے مسلمان بھائیوں کا ساتھ دینا اپنا اخلاقی فرض سمجھا۔ حالاں کہ خلافت تحریک کا ہندستان کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر ہندستان کی قومی تحریک اور خلافت تحریک میں ایک بات یکساں تھی اور وہ یہ کہ دونوں ہی تحریکیں برطانوی شہنشاہیت کے خلاف تھیں۔

خلافت تحریک کے مسلم رہنماؤں میں مولانا محمد علی، شوکت علی، مولانا عبدالباری، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان پیش پیش تھے۔ خصوصاً

مولانا محمد علی (۱۸۷۸-۱۹۳۱ء) نے خلافت تحریک میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ حصّہ لیا۔ انھوں نے ایک سچے مسلمان اور ایک سچے ہندستانی کی طرح نہ صرف ہندستان کی آزادی کی جدو جہد میں حصّہ لیا بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی اتحاد پر بھی بے حد زور دیا۔ خلافت تحریک کے ان ہی مسلم رہنماؤں کی بدولت مسلم لیگ اور کانگریس میں تعاون کا ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میثاق کے تحت دستوری مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔[۲]

۱۵ر مارچ ۱۹۲۰ء کو دہلی میں خلافت کمیٹی کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ مہاتما گاندھی کو اس میٹنگ کا صدر منتخب کیا۔ لالہ لاجپت رائے، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد اس کمیٹی کے رُکن بنائے گئے۔ اس کمیٹی کا کام گاندھی جی کی عدم تشدد اور عدم تعاون کی تجویز کو اپنانے کے امکانات پر غور کرنا تھا۔ ۷ر اپریل ۱۹۲۰ء کو مدراس میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ مولانا آزاد کی تجویز پیش کی گئی۔ اور عدم تعاون کے طریقے پر عمل کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ دارالعلوم دیوبند سے شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے اس کے حق میں فتوا بھی جاری کر دیا۔ اس طرح مہاتما گاندھی نے عدم تشدد عدم تعاون اور خلافت تحریک شروع کی۔ طے پایا کہ (۱) تمام اعزازی عہدے، خطابات حکومت کو واپس کر دیے جائیں (۲) کونسلوں کا بائکاٹ (۳) حکومت کی ملازمتوں سے استعفا دے دیا جائے (۴) پولیس اور فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کیا جائے (۵) ٹیکس کی ادائگی سے بھی انکار کیا جائے۔

گاندھی جی نے مسلمانوں سے مل کر برطانوی حکومت سے سیورس کے معاہدے کو بدلنے کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۲۰ء میں ایک ہندو مسلم کانفرنس کی گئی۔ تِلک نے شرکت سے تو لاچاری ظاہر کی مگر پروگرام کی تائید کی۔ ۹۰ مسلم رہنماؤں کے دستخطوں سے وائس رائے کو ایک خط بھیجا گیا کہ اگر برطانوی حکومت نے ہماری مانگوں پر غور نہیں کیا تو ہم حکومت کے خلاف ترک موالات

کی تحریک یکم اگست ۱۹۲۰ء سے شروع کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ایک خط میں گاندھی جی نے وائسرائے کو خلافت تحریک سے اپنی پوری ہمدردی اور تعاون کے بارے میں بھی لکھا۔ ان دونوں خطوں کو عوام میں بھی مشتہر کر دیا گیا۔

برطانوی حکومت نے جب خلافت کمیٹی کی مانگوں پر کوئی غور نہیں کیا تو یکم اگست سے مہاتما گاندھی نے ترک موالات کی تحریک شروع کر دی۔ کارخانے کے مزدوروں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے مل مالکوں کی بغیر اجازت کے ہڑتال میں شریک نہ ہوں۔ ضروری کاموں کے محکموں یعنی اسپتال، ڈاک، صحت و صفائی میں ہڑتال ممنوع قرار دی۔ علاوہ ازیں جہاں حکومت میٹنگ ممنوع کرے اس جگہ میٹنگ نہیں کی جائے۔ آپسی اتحاد کی اپیل کی۔ خطابات اور اعزازی عہدے واپس کر دیئے گئے۔ بہت سے لوگوں نے حکومت کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔ انگریزی تعلیم کا بائکاٹ کیا گیا۔ قومی ادارے قائم کیے گئے۔ جس کے نتیجے میں شانتی نکیتن اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے قومی ادارے وجود میں آئے ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی کو اشتعال انگیز تقریر کرنے کے الزام میں والیٹر کے مقام پر گرفتار کر لیا۔ کچھ ہی دن بعد مولانا شوکت علی کو بمبئی میں گرفتار کر لیا گیا۔ کانگریس تحریک میں ان گرفتاریوں سے اور شدت پیدا ہو گئی۔ ۱۹۲۲ء تک ترک موالات اور خلافت تحریک بڑی کامیابی اور جوش و خروش کے ساتھ جاری رہی۔ گاندھی جی نے باردولی میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کی دھمکی دے دی۔ وہاں ہڑتالیوں کو گرفتار کر کے ظلم کیا جا رہا تھا اور کسانوں پر بھی بہت ظلم کیا جا رہا تھا۔ گاندھی جی نے یکم فروری ۱۹۲۲ء کو وائسرائے کو ایک خط لکھا اور سات دن کا وقت دیا اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کا مطالبہ کیا۔ مگر وائسرائے نے انکار کر دیا اور اپنے قدم کو صحیح بتایا۔ تین ہزار کسانوں پر مشتمل ایک جلوس پر پولیس نے گولی چلا دی۔ الٹی میٹم کی مدت ختم ہونے سے پہلے مشتعل ہڑتالیوں نے ۲۲ پولیس کے آدمیوں کو چوری چورا (گورکھپور) کے تھانے میں بند کر کے آگ لگا دی۔ اس تشدد کی واردات سے مہاتما گاندھی نے سول نافرمانی

کی تحریک کو واپس لینے کا فیصلہ کیا اور ۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو کانگریس کمیٹی نے اس تحریک کو بند کرنے کا فیصلہ لے لیا۔ مہاتما گاندھی کو ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو گرفتار کرلیا گیا۔ ادھر ترکی میں مصطفٰے کمال پاشا نے ۱۹۲۴ء میں خلافت کو ختم کر کے ایک سیکولر اور جمہوری حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ اس طرح ترک موالات اور خلافت تحریک اپنا مقصد حاصل نہ کرسکی ہے۔

سوراج پارٹی

ترک موالات اور سول نافرمانی کی تحریک کو بند کرنے سے کانگریس کے کئی رہنما گاندھی جی سے متفق نہیں تھے خصوصاً موتی لال نہرو، مہاراشٹر کے ڈاکٹر مونجے اور بنگال کے ہردیال ناگ نے گاندھی جی سے سخت اختلاف کیا۔ لیکن باردولی (گجرات) کی کانگریس کمیٹی کی میٹنگ میں گاندھی جی کی جیت ہوئی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۲۲ء کو ینگ انڈیا میں اشتعال انگیز مضمون لکھنے کے جرم میں گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت سے کانگریس جماعت کے اندر اختلافات شروع ہو گئے۔ کانگریس کمیٹی کی جون ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ میں ایک میٹنگ ہوئی اور نومبر میں کلکتہ میں دوسری میٹنگ ہوئی۔ کانگریس جماعت دو گروپ میں ایک بار پھر تقسیم ہو گئی ایک گروپ 'نو چینجر' گاندھی جی کے انداز پر تحریک چلانے کا حامی تھا اور دوسرا گروپ جس کے رہنما بنگال کے سی آر داس اور موتی لال نہرو تھے ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کو تسلیم کر کے الیکشن کے ذریعے کونسلوں میں داخل ہو کر کونسل کی سطح پر حکومت سے عدم تعاون کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح حکومت کو ناکام بنانا زیادہ آسان ہو گا۔

دسمبر ۱۹۲۲ء میں کانگریس کا سالانہ جلسہ گیا (بہار) میں منعقد ہوا۔ پرو کونسلر گروپ کافی مضبوط ہو گیا تھا مگر جیت نو چینجر کی ہوئی۔ لیکن سی۔ آر داس جنھوں نے اسکیم بنائی تھی وہ ماننے والے نہیں تھے۔ انھوں نے موتی لال نہرو سے مل کر اس کا نام سوراج پارٹی رکھا اور اس کا

مقصد کامل آزادی حاصل کرنا رکھا۔ سی۔آر۔داس اس جماعت کے صدر منتخب ہوئے۔ اور موتی لال نہرو سکریٹری۔ مارچ ۱۹۲۳ء تک اس کا دستور بنا لیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد قائم مقام صدر کانگریس نے دونوں گروپ میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی مگر کونسلوں کے داخلے کے معاملے پر اختلافات برقرار رہے۔ مولانا محمد علی نے رہائی کے بعد دونوں گروپ میں اتفاق برقرار رکھنے کے لیے مطلع کیا کہ انھوں نے مہاتما گاندھی سے کونسلوں میں داخلے کے لیے اجازت لے لی ہے۔ مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۴ء میں اپنی رہائی کے بعد کونسل کے داخلے کے معاملے پر اپنے اختلافات کا زیادہ شدت سے اظہار نہیں کیا۔ صرف یہ شرط رکھی کہ کانگریس سے الگ پارٹی نہیں بنائی جائے۔ اس طرح سوراج پارٹی کانگریس ہی کی ایک شاخ کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔

سوراج پارٹی کو عام انتخابات میں نومبر ۱۹۲۳ء کے الیکشن میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ مرکزی اسمبلی میں ۱۰۱ نشستوں میں ۴۲ نشستیں حاصل ہوئیں۔

سوراج پارٹی نے محمد علی جناح کی سرکردگی میں آزاد امیدواروں کے ساتھ مل کر کولیشن گورنمنٹ قائم کی۔ وٹھل بھائی پٹیل کو مرکزی اسمبلی کا اسپیکر منتخب کیا گیا۔

سوراج پارٹی نے اپنے دورِ کارکردگی میں ایکٹ میں ترمیم کا مطالبہ کیا۔ اور ایک مطالبہ سول سروس کے بارے میں رکھا۔ ایکٹ میں ترمیم کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن ایکٹ کی کارکردگی کی جانچ کرنے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔

بدقسمتی سے ۱۹۲۵ء میں سی۔آر۔داس کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۲۵ء میں آزاد امیدواروں نے کولیشن گورنمنٹ سے علاحدگی اختیار کرلی۔ اور اس طرح سوراج پارٹی اپنے فوری مقصد میں ناکام رہی۔ مارچ ۱۹۲۶ء میں سوراج پارٹی نے مرکزی اسمبلی کا بائکاٹ کر دیا۔[۱۲]

(حوالے صفحہ ۲۵۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

باب - ۱۸

پنڈت جواہر لال نہرو کا عروج اور تحریک سول نافرمانی

ترک موالات اور خلافت تحریک کا دور ہندو مسلم اتحاد کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔ ہندو اور مسلمانوں نے سیکولرزم کا بہترین نمونہ پیش کیا تھا۔ مذہبی رواداری، یگانگت اور قومی یکجہتی نے آزادی کی تحریک میں چار چاند لگا دیے تھے۔ مسلم لیگ اور کانگریس ایک جماعت کی دو شاخیں نظر آنے لگی تھیں۔ مسلم علما اور ہندو پنڈت ایک جان دو قالب تھے۔ ایک طرف دیوبند کے شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے گاندھی جی کے عدم تشدد اور عدم تعاون کے حق میں فتوا جاری کیا تو دوسری طرف سوامی شردھانند نے جامع مسجد کے ممبر سے خلافت تحریک کے حق میں تقریر کی۔

چوری چورا کے واقعے کے بعد ترک موالات اور خلافت تحریک کے بند ہونے سے اختلاف رائے شروع ہوا۔ گاندھی جی اور مولانا محمد علی گرفتار کر لیے گئے۔ کانگریس دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئی۔ سوراج پارٹی نے اس دور میں تحریک چلائی۔ اسی بیچ ملک کی فرقہ وارانہ فضا مکدر ہونا شروع ہوئی۔ کانگریس مسلم لیگ اور دوسری ہندو مسلم جماعتوں میں غلط فہمی اور ذاتی اقتدار پرستی کا رجحان پیدا ہوا۔

کمیونسٹ پارٹی کا قیام اسی زمانے میں کچھ نئے ذہن اقتصادی اور سیاسی آزادی کے لیے فکر مند تھے۔ ۱۹۱۹ء میں میکسیکو میں بالشیوک نیتا میکائیل بورڈین سے ایم۔ این۔ رائے کی ملاقات ہوئی جن کے نظریات سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ روس گئے دوسری کمیونسٹ انٹرنیشنل میں شرکت کی ۱۹۲۰ء میں ایم۔ این۔ رائے اور ابھانی مکرجی نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ تاشقند میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا قائم کی۔ دو کتابیں "INDIA IN TRANSITION" اور "VANGUARD OF INDEPENDENCE OF INDIA" شائع کیں۔ مارکس کے اصولوں کی روشنی میں ہندستان کی اقتصادیات کا جائزہ لیا۔ دھیرے دھیرے کمیونسٹ پارٹی کی شہرت بڑھتی گئی۔ ۱۹۲۲ء سے نلنی گپتا، شوکت عثمانی، اور ایم۔ این۔ رائے کمیونسٹ پارٹی سے رازدارانہ طریقے سے تعلق بنائے ہوئے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں بمبئی کے کمیونسٹ لیڈر ایس۔ اے۔ ڈانگے نے سوشلسٹ نام کا ایک جرنل جاری کیا۔ کلکتہ میں مظفر حسین، مدراس میں سنگاراوالا اور لاہور میں غلام حسین کمیونسٹ پارٹی کا کام کر رہے تھے۔ مئی ۱۹۲۳ء میں لیبر کسان پارٹی قائم کی گئی۔ ۱۹۲۸ء تک کمیونسٹ پارٹی کانگریس کی ایک شاخ کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ اختلافات کے باوجود کمیونسٹ گاندھی جی کو رہنما تسلیم کرتے تھے۔

کانگریس کے نوجوان اُبھرتے لیڈر سبھاش چندر بوس اور پنڈت جواہر لال نہرو سوشلزم کی تحریک سے متاثر تھے۔ یہی دور کانگریس میں جواہر لال نہرو کے عروج کا ہے۔[۱]

پنڈت جواہر لال نہرو (۱۸۸۹ء۔ ۱۹۶۴ء) ۱۴ر نومبر ۱۸۸۹ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ سوراج پارٹی کے مشہور رہنما اور مانے ہوئے وکیل پنڈت موتی لال نہرو کے اکلوتے بیٹے تھے۔ انھوں نے اپنی اعلا تعلیم انگلستان کے مشہور ادارے ہیرو اور کیمبرج میں مکمل کی۔ ہندستان واپس آکر وکالت

شروع کی۔ پھر چھوڑ دی۔ وہ شروع ہی سے سیاست کی طرف مائل تھے۔ تِلک اور اینی بسنٹ کی ہوم رُول تحریک سے متاثر تھے۔ پنڈت نہرو رولٹ بل کے خلاف احتجاج میں شامل ہونے کے خواہاں تھے۔ مگر گاندھی جی نے انھیں روک دیا۔ انھوں نے یو۔پی۔ کے دیہات کا دورہ کر کے وہاں کے کسانوں اور دیگر عوام کی اقتصادی بدحالی کا جائزہ لیا۔ انھوں نے ترک موالات اور خلافت تحریک میں حصّہ لیا۔ گرفتار کیے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں نابھا کے راجا کے خلاف سکھوں کے احتجاج میں شریک ہوئے جہاں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں انھیں کانگریس کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا۔[۲]

۱۹۲۱ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے احمد آباد اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے کامل آزادی کی تجویز رکھی تھی۔ لیکن اس وقت گاندھی جی نے اس تجویز کو رد کر دیا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں کانگریس کے مدراس اجلاس میں کامل آزادی کی تشریح کی گئی۔ اس میں پنڈت نہرو پیش پیش تھے۔[۳]

سائمن کمیشن ۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو برطانوی حکومت نے سائمن کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ ہندستان جا کر ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی کارکردگی پر رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیشن میں چوں کہ ہندستانی نمایندوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے کانگریس نے اور دیگر جماعتوں نے اس کا بائکاٹ کیا۔ ہر شہر میں احتجاجی جلوس نکالے۔ لاہور میں اسی طرح کے جلوس پر پولیس نے لاٹھیاں برسائیں۔ مشہور رہنما لالہ راجپت رائے ہلاک ہوئے تھے۔[۴]

نہرو رپورٹ ان حالات کی روشنی میں کانگریس نے اپنا دستور تجویز کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ موتی لال نہرو صدر بنائے گئے۔ محمد علی جناح نے مارچ ۱۹۲۷ء میں مسلمانوں کو حق جداگانہ انتخاب چھوڑنے پر راضی کر لیا۔ لیکن یہ شرط رکھی کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمایندگی $\frac{1}{3}$ ہونی چاہیے۔ باقی صوبوں میں آبادی کے تناسب سے نمایندگی ہو۔ ۱۹۲۸ء میں مدراس کے جلسے میں یہ تجویز پاس کر دی گئی۔ فروری ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس میں موتی لال

نہرو اور تیج بہادر سپرو نے رپورٹ پیش کی۔

نہرو رپورٹ میں جداگانہ انتخاب کو تو ختم کر دیا مگر مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ⅓ نمایندگی نہیں دی گئی بلکہ مرکز اور صوبوں میں آبادی کے تناسب سے نمایندگی دی گئی اس پر محمد علی جناح جواب تک کانگریس کے ساتھ تھے، محمد شفیع کی مسلم لیگ کی شاخ سے جا ملے۔ این۔ سی۔ کیلکر نے مہا سبھا کے پلیٹ فارم سے مسلم اکثریت کے صوبے بنگال اور پنجاب کے قیام پر اعتراض کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس نے نہرو رپورٹ کے ڈومینین اسٹیٹس کے مقصد پر سخت اعتراض کیا۔[۵]

کامل آزادی کانگریس کا مقصد

نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۸ء کے کلکتہ کے اجلاس میں خود پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں پنڈت نہرو سبھاش چندر بوس اور دیگر رہنماؤں کے اصرار پر کامل آزادی کانگریس کا مقصد تسلیم کیا۔ حکومت کو ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک کا وقت دیا گیا۔ اگر حکومت نے اس مقررہ وقت تک نہرو رپورٹ کے مطابق ڈومینین اسٹیٹس نہیں دیا تو کانگریس کامل آزادی کا مقصد حاصل کرنے کے لیے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے گی یہ بات پنڈت نہرو نے گاندھی جی کے کہنے پر مانی تھی۔[۶]

تحریک سول نافرمانی

برطانوی حکومت نے کانگریس کا یہ بھی مطالبہ رد کر دیا۔ اس لیے کانگریس کمیٹی کو سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کی اجازت مل گئی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء کو لکھنؤ کانگریس کمیٹی نے پنڈت جواہر لال نہرو کو لاہور کانگریس کا صدر منتخب کیا۔

کئی سال کی جدوجہد کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو آزادی کی تحریک میں اتنی کم عمر میں عروج پر پہنچ گئے تھے۔ انھیں گاندھی جی سے اختلافات تھے مگر وہ ان کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ جواہر لال نہرو کی وجہ سے کانگریس کے مقاصد

میں تبدیلی آئی۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور کے مشہور تاریخی اجلاس میں جب الٹی میٹم کا وقت رات کے ۱۲ بجے ختم ہوا تو پنڈت نہرو نے اپنی تاریخی تجویز پیش کی یعنی وقت ختم ہوتے پر ترنگا جھنڈا لہرایا گیا۔ کامل آزادی کی تجویز پاس کی گئی۔ یہ بھی طے پایا کہ ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو آزادی کا دن منایا جائے گا۔ اس کے بعد گاندھی جی نے برطانوی حکومت کو ۱۱ر دن کا وقت اور دیا اور ۱۱ مطالبات پورے کرنے کی مانگ کی۔ حکومت کو یہ بھی خبردار کیا کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو وہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دیں گے۔[۸] وائسرائے نے گاندھی جی کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ گاندھی جی نے تحریک کے طریقۂ کار پر غور کرنے میں دو ماہ لگائے۔

۹ تحریک سول نافرمانی

مہاتما گاندھی نے کہا کہ "ON BENDED KNEE I ASKED FOR BREAD AND RECEIVED A STONE INSTEAD"

اس طرح مہاتما گاندھی نے مارچ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ بدیشی کپڑوں کا بائکاٹ کیا گیا، شراب کی دکانوں پر دھرنا دیا۔ کھادی کے استعمال پر زور دیا، انگریزوں کا سوشل بائکاٹ کیا۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو آزادی کا دن منایا گیا۔ اس تحریک کا سب سے مشہور پروگرام نمک پر ٹیکس ادا نہ کرنا تھا۔ ۱۲ر مارچ کو گاندھی جی نے سابرمتی آشرم سے ڈانڈی مارچ شروع کیا۔ ۶ر اپریل کو گاندھی جی سمندر کے کنارے پہنچے اور ایک مٹھی نمک اٹھایا اس کے ساتھ ہی تمام ملک میں نمک کا قانون توڑ دیا گیا۔ حکومت نے ستیہ گرہیوں پر بے حد سختی کی اور ظلم ڈھائے۔ مگر حکومت اس تحریک کو دبانے میں ناکام رہی۔ آخر کار حکومت کو سمجھوتے کا طریقہ اپنانا پڑا۔[۱۰]

گاندھی اِروِن سمجھوتہ

پہلی شرط کے مطابق ۲۶ر جنوری ۱۹۳۱ء کو تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا گیا۔ اس کے بعد گاندھی جی اور وائسرائے اِروِن میں عرصہ دراز تک بات چیت جاری رہی۔ ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی اور لارڈ اِروِن کے درمیان معاہدہ ہو گیا جو گاندھی اِروِن پیکٹ کے نام سے مشہور ہے۔

اس معاہدے کے مطابق گاندھی جی نے دوسری راونڈ ٹیبل کانفرنس میں انگلستان جاکر شرکت کرنا منظور کیا جہاں ہندستان کے آئین پر گفتگو اور بحث ہورہی تھی۔ پہلی راونڈ ٹیبل کانفرنس ۱۹۳۰ء ۱۹۳۱ء کا کانگریس نے بائکاٹ کیا تھا۔ البتہ دیگر لیڈروں مثلاً مولانا محمد علی نے شرکت کی تھی۔[۱۱]

دوسری راونڈ ٹیبل کانفرنس بھی ناکام رہی۔ کیوں کہ برطانوی حکمراں گاندھی جی کے مطالبات ماننے کو تیار نہ تھے۔ ۲ جنوری ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی نے دوبارہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ ۴ جنوری کو گاندھی جی اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کو گرفتار کر لیا گیا۔

تیسری راونڈ ٹیبل کانفرنس میں گاندھی جی نے شرکت نہیں کی۔ انگلستان کے وزیر اعظم نے اس کانفرنس میں کمیونل ایوارڈ کے ساتھ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ پاس کر دیا۔ اس ایکٹ میں ہریجنوں کو بھی جداگانہ حق انتخاب دینے کا اعلان کیا۔ گاندھی جی اس کے سخت خلاف تھے۔ انھوں نے جیل کے اندر ہی ۲۱ دن کا برت رکھا۔ جب گاندھی جی کی حالت بہت خراب ہونے لگی تو انھیں رہا کر دیا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں پونا پیکٹ ہوا جس کے مطابق ہریجنوں کی نشستیں محفوظ کر دی گئیں اور جداگانہ انتخاب ختم کر دیا گیا۔

۱۲ جولائی ۱۹۳۳ء کو گاندھی جی نے عوامی سطح پر سول نافرمانی کی تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن انفرادی طور پر اس تحریک کو جاری رکھا جو ۸ ماہ تک اور چلی۔ اس کے بعد ۷ اپریل ۱۹۳۴ء کو یہ تحریک بھی بند کر دی گئی۔[۱۲]

۱۹۳۷ء میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے مطابق الیکشن ہوئے کانگریس نے الیکشن میں حصہ لینا تسلیم کر لیا۔ پنڈت نہرو نے جو کانگریس کے مقبول رہنما ہو چکے تھے پورے ہندستان کا دورہ کیا۔ اور کانگریس کا کامل آزادی کا پیغام ہر ایک تک پہنچایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۶ صوبوں میں کانگریس کو الیکشن میں اکثریت حاصل ہوئی۔

(اس باب کے صفحہ ۲۵۵ میں ملاحظہ کیجیے)

باب ۱۹

محمّد علی جنّاح اور لاہور قرار داد

محمّد علی جنّاح اور کانگریس

مسٹر محمّد علی جنّاح (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۴۸ء) ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد جنّاح پونجا کاروبار کے سلسلے میں راجکوٹ سے بمبئی جاکر رہایش پذیر ہوگئے تھے۔

۱۸۹۶ء میں محمّد علی جنّاح انگلستان سے قانون کی ڈگری حاصل کرکے ہندستان واپس آئے۔ انگلستان ہی میں دادا بھائی نوروجی کی قیادت میں سیاست میں قدم رکھا۔ ۱۹۱۳ء کے مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس میں محمّد علی جنّاح کو بالخصوص مدعو کیا گیا۔ اسی جلسے میں خود اختیاری حکومت حاصل کرنے کا مقصد معیّن کیا گیا۔[۱]

اسی وقت سے محمّد علی جنّاح ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کرتے رہے۔ اسی سال انھوں نے انگلستان جاکر ہندو مسلم طلبہ کے اتحاد کے لیے سنٹرل الیوسی ایشن قائم کی۔ ۱۹۱۴ء میں محمّد علی جنّاح کانگریس کے نمایندہ بن کر سکریٹری آف اسٹیٹ سے ہندستان کے مسائل پر گفتگو کرنے انگلستان گئے۔

۱۹۱۵ء میں محمّد علی جناح نے کچھ لوگوں کی مخالفت کے باوجود مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں کرایا جہاں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ان کا مقصد مسلم لیگ اور

کانگریس میں مفاہمت پیدا کرانا تھا۔ اسی اجلاس میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتے کے سلسلے میں ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ اسی کمیٹی کی رپورٹ پر محمد علی جناح کی صدارت میں مسلم لیگ اور کانگریس کے متحدہ اجلاس میں لکھنؤ میثاق ۱۹۱۶ء کو منظوری دی گئی۔ یہی اتحاد دورانِ تحریک ترک موالات اور خلافت نقطۂ عروج کو پہنچا۔ محمد علی جناح حالاں کہ نہرو رپورٹ سے متفق نہیں تھے پھر بھی انھوں نے مخلوط انتخاب کو منظور کیا۔ مگر انھوں نے کانگریس کے سامنے اپنے ۱۴ نکات رکھے۔

۸ نومبر ۱۹۲۷ء کو وائسرائے ہند نے سائمن کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا۔ ملک بھر میں سائمن کمیشن کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ رہی تھی۔ محمد علی جناح نے ہندو مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنے کے لیے ڈاکٹر انصاری اور سری نواس آئنگر کے ساتھ ملک کے دورے کیے۔ فروری میں آل پارٹیز کانفرنس بلائی گئی۔ محمد علی جناح نے تمام جماعتوں کے لیڈروں سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنے اختلافات کو دور کر کے متحد ہو جائیں اور ایک کنونیشن میں تمام جماعتوں کے تعاون سے ایک آئین مرتب کریں اور پھر اس کے قیام کے لیے کوشش کریں۔

۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی مسلمانوں کی دہلی تجاویز جو ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو محمد علی جناح کی صدارت میں پاس ہوئی تھیں، پہلے مان چکی تھی۔ ان تجاویز کے مطابق مسلمانوں نے مخلوط انتخا پر رضامندی ظاہر کی تھی بشرطیکہ مرکزی اسمبلی میں مسلمان نمایندوں کی تعداد ⅓ رکھی جائے۔ پنجاب اور بنگال میں نمایندگی آبادی کے تناسب سے ہو بلوچستان اور سرحدی صوبے میں اصلاحات جاری کی جائیں اور سندھ کو ایک جداگانہ صوبہ بنا دیا جائے۔ ۱۹ مئی کی آل پارٹیز کانفرنس کے جلسے میں ان تجاویز کی بنیاد پر نہرو کمیٹی کی تشکیل کر دی گئی تھی۔

۲۸ اگست ۱۹۲۸ء کو نہرو رپورٹ لکھنؤ میں یونٹی کانفرنس میں پیش کی گئی

جہاں اس کے بہت سے بنیادی اصولوں کو منظور کر لیا گیا۔ لیکن زیادہ اہم مسائل کو آیندہ بحث کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جب محمد علی جناح انگلستان سے واپس آئے تو تمام مسلمانوں کی نظر ان پر تھی۔ نہرو رپورٹ ان کے پیچھے مرتب ہوئی تھی۔

نہرو کمیٹی کے مسودہ قانون پر رائے عامہ حاصل کرنے کے لیے آل پارٹیز نیشنل کنونشن کا اجلاس ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۸ کو کلکتہ میں تجویز ہوا۔ محمد علی جناح نے کنونشن میں شامل ہونے سے پہلے نہرو رپورٹ میں تین ترمیمیں تجویز کیں۔

(۱) مسلمانوں کو مرکز میں ⅓ نمایندگی۔

(۲) پنجاب اور بنگال میں کم از کم دس سال تک آبادی کے تناسب سے نمایندگی۔

(۳) فاضلہ قوت مرکز کی بجائے صوبجاتی حکومتوں کے ہاتھ میں۔

آل انڈیا کنونشن کی سب کمیٹی نے ان ترمیموں کو رد کر دیا۔

کانگریس نے نہرو رپورٹ کو اختلافات کے باوجود اس شرط پر پاس کر دیا کہ اگر انگلستان کی پارلیمنٹ ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو اس دستور کو مانتی ہے اور ہندستان کو خود اختیاری حکومت دیتی ہے تو ٹھیک ورنہ اس کے بعد کامل آزادی حاصل کرنے کے لیے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے گی۔

محمد علی جناح کے ۱۴ نکات

محمد علی جناح نے مسلمانوں سے پر زور اپیل کی کہ وہ اپنے تمام اختلافات دور کر کے مسلم لیگ کو مضبوط بنائیں۔ محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ ہندستان کے آئین کی کوئی اسکیم مسلمانوں کو اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہوگی جب تک مندرجہ ذیل ۱۴ نکات کی بنیاد پر ان کے حقوق اور مفادات کا تحفظ نہ ہوگا۔

(۱) فیڈرل آئین

(۲) صوبوں کی خود مختاری

(۳) مرکزی اسمبلی میں ⅓ مسلمانوں کی نمایندگی۔

(۴) صوبوں میں اقلیتوں کی مؤثر نمایندگی۔
(۵) جداگانہ انتخاب۔
(۶) مسلم اکثریت کے صوبوں کو تقسیم نہ کرنے کی ضمانت۔
(۷) مکمل مذہبی آزادی۔
(۸) کسی قوم کے متعلق بل اس کی ۳/۴ رائے پر پاس کیا جائے۔
(۹) سندھ کو ممبئی سے الگ کیا جائے۔
(۱۰) بلوچستان اور سرحدی صوبے میں اصلاحات۔
(۱۱) صلاحیت کے مطابق مسلمانوں کو سرکاری ملازمت میں حصہ کی ضمانت۔
(۱۲) مسلمانوں کے پرسنل لا اور تہذیب و تمدن، زبان، تعلیم کے تحفظ کی ضمانت۔
(۱۳) مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی ۱/۳ نمایندگی۔
(۱۴) فیڈریشن میں ریاستوں کو مرضی کے بغیر شامل نہ کیا جائے۔[۲]

لاہور قرارداد (پاکستان ریزولیوشن) ۱۹۳۵ء کی دستوری اصلاحات نہ تو کانگریس کو مطمئن کر سکی تھیں اور نہ ہی مسلمانوں کو ان اصلاحات سے فائدہ ہوا تھا۔ لیکن پہلے کی طرح مسلمانوں کے لیے حق انتخاب جداگانہ برقرار رکھا تھا۔ جب اس ایکٹ کے تحت مرکز اور صوبوں میں حکومتیں قائم کی گئیں تو چھے صوبوں میں کانگریس کو زبردست کامیابی ملی اور کئی صوبوں میں مسلم لیگ کو بڑی کامیابی ملی۔ اس الیکشن کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس میں آپسی معاہدہ نہ ہو سکا۔

اس کے بعد مسلم لیگ محمد علی جناح کی قیادت میں مسلمانوں کی الگ حکومت کے قیام کا خواب دیکھنے لگی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی محمد علی جناح نے اب مسلمانوں کو جتایا کہ دراصل اسلام اور ہندو مذہب ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ ۲۲، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی سہ پہر کو قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے لاہور کے اجلاس میں مندرجہ ذیل قرارداد کے ذریعے یہ اعلان کیا کہ مسلمانانِ ہند کا نصب العین یہ ہے کہ وہ ان علاقوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے اپنی آزاد جداگانہ حکومت قائم کریں گے۔[۳]

(حوالے صفحہ ۲۵۶ پر)

باب ۔ ۲۰

۱۹۴۲ء کی ہندستان چھوڑو تحریک اور مولانا ابوالکلام آزاد

ہندستان چھوڑو تحریک ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے اعلان پر کانگریس وزارتوں نے استعفے دیے۔ برطانوی سرکار ایسے موقع پر جنگ میں ہندستان کا پورا پورا تعاون چاہتی تھی۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن آیا اس نے تجویز رکھی کہ دفاع کے محکمے کو چھوڑ کر تمام محکمے ہندستانیوں کو جنگ کے اختتام پر سپرد کر دیے جائیں گے۔ مسلم اقلیت کے سلسلے میں کرپس نے کہا کہ کانگریس اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں چاہتی۔ مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ جب تک انگریز پوری طرح سے ملک سے نہیں چلے جائیں گے اس وقت تک کوئی حل ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے ہم میں آپس میں اتحاد بھی ناممکن ہے۔ کیوں کہ ہم سب فیصلے کے لیے انگریزوں کی طرف دیکھتے رہیں گے۔

گاندھی جی کے ذہن میں اس تحریک کا خیال اپریل ۱۹۴۲ء میں آیا تھا۔ جب انھوں نے الیگزینڈر اور اگاتھا ہیریسن کو ایک خط لکھا تھا کہ انگریزوں کو ہندستان سے چلا جانا چاہیے یعنی اس سے "SYSTEMATIC WITHDRAWAL" مراد تھی۔ ایسا نہ ہو کہ سنگاپور، ملایا اور برما کی طرح ہندستان بھی جاپان کو دے بیٹھیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ہندستانی فوج کو جنگ کے دوران وہ استعمال کر سکتے ہیں لیکن ۱۴ر جولائی تک ہندستانیوں کو آزادی اور اقتدار حکومت ملنا چاہیے۔

۱۹۴۲ء کی تحریک شروع ہونے سے پہلے گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد

میں کئی معاملات پر اختلاف ہوا۔ دراصل مولانا آزاد اس وقت کانگریس کے صدر تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸۔۱۹۵۸ء) کی پوری زندگی آزادی کی جدوجہد، ہندومسلم اتحاد پیدا کرنے اور ایک متحد ہندستان کے خواب کی تعبیر تلاش کرنے میں گزری تھی۔ ۱۹۱۲ء سے 1915ء تک الہلال کے ذریعے اور ۱۹۱۶ء میں البلاغ کے ذریعے برطانوی سامراجیت کے خلاف اور آزادی حاصل کرنے کی تبلیغ کر رہے تھے۔ کئی بار انھیں جیل جانا پڑا تھا۔ اپنے نظریات کی پائداری کی وجہ سے اور روشن خیال ہونے کی وجہ سے وہ گاندھی جی کے بہت قریب تھے۔ صرف ۳۵ سال کی عمر میں ۱۹۲۳ء میں وہ کانگریس کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ وہ وقت بڑا نازک تھا۔ ہندومسلم اتحاد ٹوٹ رہا تھا۔ ۱۹۲۴ء کے بعد مسلمان لیڈر کانگریس چھوڑ گئے مگر مولانا ثابت قدمی سے جمے رہے۔ ڈاکٹر انصاری حکیم اجمل خاں اور دیگر نوجوان مسلمانوں کے تعاون سے نیشنلسٹ مسلمانوں کا ایک گروپ بنایا جو آخر وقت تک کانگریس کا ساتھ دیتا رہا۔

ایسا ہی نازک وقت ۱۹۴۰ء کے بعد آیا۔ ہندومسلم اتحاد کی بے حد ضرورت تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۴۱ء میں دوبارہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک رہے۔ اس دور میں مہاتما گاندھی نے ستیہ گرہ کی اپنی آخری تحریک یعنی بھارت چھوڑو تحریک شروع کی۔[۱]

۸ راگست ۱۹۴۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں بمبئی کے کانگریس اجلاس میں ہندستان چھوڑو کی تجویز پاس کی گئی۔ گاندھی جی ابھی اپنا پورا پروگرام بتا بھی نہ پائے تھے کہ انھیں ۹ راگست ۱۹۴۲ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ ساتھ ہی ان کے تمام ساتھیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے وقت گاندھی جی نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے انھیں "کریں گے یا مریں گے" کا ایک مختصر سا منتر دیا۔ ملاحظہ کیجیے۔

"HERE IS A MANTRA, A SHORT ONE,

THAT I GIVE YOU. YOU MAY

IMPRINT IT ON YOUR HEARTS ..... باقی

THE MANTRA IS "DO OR DIE". WE SHALL EITHER FREE INDIA OR DIE IN THE ATTEMPT."

گاندھی جی نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ حکومت کو ناکام بنانے کے لیے عدم تشدد کے ساتھ جو کچھ بھی کیا جا سکے کرو۔ انھوں نے کہا کہ ستیہ گرہیوں کو مرنے کے لیے نکل پڑنا چاہیے انھوں نے کہا کہ وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو موت کو خوشی خوشی گلے لگاتی ہیں۔

گاندھی جی اور دیگر تمام بڑے لیڈروں کی گرفتاری کے بعد اس تحریک کی باگ ڈور مسز ارونا آصف علی نے سنبھالی تھی۔ اس تحریک کی پہلی منزل روایتی تھی یعنی ہڑتال کرنا اور جلوس نکالنا۔ جو ایک ہفتے تک چلی۔ دوسرے دور میں ۱۵ اگست سے ۲۲ ستمبر تک ٹیلی گراف، ٹیلی فون، ریل کی پٹریاں، پل اور سرکاری عمارتوں کو توڑا پھوڑا۔ لیکن اس میں قتل کرنا یا کسی قسم کا تشدد شامل نہیں تھا۔ تیسرے دور میں ہزاری باغ آرا، گونڈا اور دیگر جیلوں سے سیاسی قیدیوں کو رہا کیا۔ اس دور میں ہنسائی وارداتیں بھی ہوئیں، چوتھے دور میں کورٹ اور سرکاری عمارتوں پر کانگریس کے جھنڈے لگائے گئے۔ یوپی، بہار، بنگال اور بمبئی میں ہندستانیوں نے سرکاری انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

پنڈت نہرو نے جب ہندستان چھوڑو کی تجویز کانگریس کے اجلاس میں رکھی تھی تو یہ واضح کر دیا تھا کہ اس تجویز کے پاس ہونے کے بعد اس پر عمل کرنا ہر ہندستانی کا فرض ہو جائے گا۔ نہ صرف ہندستانی بلکہ تمام انسانیت کا جو ظلم سے دبی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس تحریک میں سماج کا ہر طبقہ شامل ہوا تھا۔ ہندو مسلمان، سکھ عیسائی، کسان زمیندار مزدور اور ہندستانی طلبہ بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے اس تحریک میں گرفتاریوں سے گریز کرنا شامل تھا۔ اور سپاہیوں سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنے بھائیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیں۔ حالاں کہ کمیونسٹ پارٹی نے اس تحریک میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن پھر بھی مزدوروں نے تحریک میں حصہ لیا۔ کانپور، جمشید پور اور احمدآباد کے ملوں کے مزدوروں نے ہڑتال کی۔ محمد علی جناح کی سرکردگی میں مسلم لیگ نے تحریک میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ سیکولر

اورنیشنلسٹ مسلمانوں نے جن کے سربراہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے اس تحریک کا ساتھ دیا۔

۱۹۴۲ء کی تحریک کو گاندھی جی نے "ORDERLY BRITISH WITHDRAWAL" کہا تھا۔ لیکن امریکن پریس نے اس کو 'کوئٹ انڈیا' کی تحریک نام دیا۔[۳۱]

۱۹۴۲ء کی تحریک گاندھی جی کی آخری بڑی تحریک تھی۔ گاندھی جی اور دیگر بڑے رہنماؤں کی گرفتاری کی وجہ سے تحریک میں تنظیم کی کمی پیدا ہوگئی تھی۔ مئی ۱۹۴۴ء میں جب گاندھی جی کو رہا کیا گیا تو تحریک مدّھم پڑچکی تھی۔ دوسرے ہنسا کی واردات تو گاندھی جی کے اہنسا کے اصول کے خلاف تھی۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو جب گاندھی جی کو ہنسا کا پتا چلا تو انھوں نے وائسرائے کو ایک خط میں اظہار افسوس کیا۔ بات چیت کی تجویز رکھی۔ مگر وائسرائے نے انکار کر دیا۔ ۱۰ر فروری ۱۹۴۳ء سے گاندھی جی نے ۲۱ دن کی بھوک ہڑتال کی۔ ۱۱ر مئی ۱۹۴۴ء کو رہا کر دیا گیا۔

لیکن اس تحریک کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ گاندھی جی کے 'کریں گے یا مریں گے'، کے نعرے نے عوام کے دل سے موت کا خوف نکال دیا تھا۔ عوام نے بڑی قربانیاں دیں۔ حکومت نے ظلم تو کیے مگر تحریک کو کچلنے میں ناکام رہی۔ اس تحریک سے پوری دنیا کی نظر ہندستان کی طرف اٹھی اور وہ ہندستان کی آزادی کے حق میں ہو گئے۔[۳۲]

مسلمانوں کی دیگر جماعتوں کا کانگریس سے اشتراک

مجلس احرار پنجاب کے مسلمانوں نے خلافت کمیٹی سے اختلاف پر ۱۹۲۹ء میں مجلس احرار قائم کی۔ یہ جماعت مذہبی اور سیاسی مقاصد کے اعتبار سے جمعیت العلما ہند کے بہت قریب تھی۔ اس لیے اس کا بھی اشتراک

جمعیت علما ہند (۱۹۱۹ء) کی طرح کانگریس سے رہا۔ اس جماعت کے پہلے صدر عطاء اللہ شاہ بخاری منتخب ہوئے تھے۔ اس کے بانیوں میں مولانا ظفر علی خاں، خواجہ عبدالرحمٰن، غازی چودھری، افضل حسن، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر، مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی شامل تھے۔

۱۳، ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو صوبہ متحدہ میں احرار کانفرنس کا جلسہ ہوا۔ اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو آل انڈیا کانفرنس پٹیالہ کے جلسے میں مسلم لیگ سے علاحدگی کا اعلان کیا جو کانگریس کی مخالفت کر رہی تھی[۵]

خدائی خدمتگار اسی زمرہ میں خدائی خدمتگاروں کی جماعت آتی ہے۔ اس جماعت کو خان عبدالغفار خان نے ۱۹۲۹ء میں قائم کیا۔ انھوں نے علی گڑھ میں اعلا تعلیم حاصل کی تھی۔ سیاست میں داخل ہونے سے پہلے وہ انفرادی طور پر تعلیمی مشاغل میں مصروف تھے۔ رولٹ بل پر ۱۹۱۹ء میں انھوں نے ایک جلسہ کیا۔ اس وجہ سے انھیں گرفتار کیا گیا۔ انھوں نے اپنے وطن میں ایک قومی اسکول کھولا اور صوبے بھر میں شاخیں کھولیں۔ ان مشاغل کی وجہ سے انھیں تین سال کی قید ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں رہا ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں باقاعدہ خدائی خدمتگار کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی۔ اسی وقت سے وہ کانگریس کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ وہ مہاتما گاندھی کے نظریے سے بے حد متاثر تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی جنگجو قوم کو گاندھی جی کے اصول عدم تشدد پر کاربند کیا۔ انھیں سرحدی گاندھی کا خطاب ملا[۶]

شیعہ پولیٹیکل کانفرنس ۱۹۲۹ء ہی میں لکھنؤ میں شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کا قیام ہوا۔ راجا نواب علی خاں صدر منتخب ہوئے۔ اس جماعت کے پہلے اجلاس میں مخلوط انتخاب اور شیعوں کے لیے معینہ نشستوں کی مانگ کی گئی تھی۔ اس کانفرنس کا دوسرا جلسہ ۵ اپریل ۱۹۳۱ء کو منٹگمری میں راجا صاحب ہی کی صدارت میں ہوا۔ اس جلسے میں حسب ذیل

تجاویز پاس کی گئیں۔

(۱) سودیشی اور کھدر کے استعمال کی تائید کی گئی۔

(۲) بلووں پر اظہار افسوس کیا گیا۔

(۳) گاندھی اِروِن مصالحت پر اظہار اطمینان کیا گیا۔

(۴) مسٹر جناح کے ۱۴ نکات جس کی رُو سے مخلوط انتخاب ملنے کی امید تھی اظہار رضامندی کیا۔

۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اس کانفرنس کا تیسرا جلسہ منعقد ہوا۔ راجا غضنفر علی خاں نے اس جلسے کی صدارت کی۔ اس میں حسب ذیل تجاویز پاس کی گئیں۔

(۱) وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلے پر اظہار ناراضی اور آل پارٹیز کانفرنس الہ آباد کے اصولی ریزولیوشن کی تائید۔

(۲) اس جماعت کے نمایندوں کو مخلوط انتخاب پر مبنی کسی فیصلے کو ماننے کی اجازت دی گئی۔

(۳) گول میز کانفرنس کے لیے ڈیل گیٹوں کی غلط نامزدگی پر بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا۔

(۴) گورنمنٹ سے استدعا کی گئی کہ گاندھی جی کو اور الہ آباد کانفرنس کے لیڈروں کو باہمی تصفیہ کرنے میں مدد دے۔

(۵) سیالکوٹ کے واقعہ کے بارے میں گورنمنٹ سے تحقیقات کی درخواست کی گئی۔

۱۱، ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو اس کانفرنس کا آخری جلسہ ہوا۔ اس جلسے کی صدارت سر وزیر حسن نے کی۔ ان کا صدارتی خطبہ بڑا معرکہ آرا تھا۔ انھوں نے برطانوی حکومت کی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ ہندستانیوں نے انگریزوں کی تمام جنگوں میں اپنے ہی بھائیوں کے خلاف حصّہ لیا اور اب دوسری جنگِ عظیم میں انھیں اس وقت تک جنگ میں شامل نہیں ہونا چاہیے جب تک انھیں آزادی نہ مل جائے۔ مسلمانوں

کے لیے نشستیں معین کرنے اور مخلوط انتخاب کی مانگ بھی کی[۷]

نیشنلسٹ مسلم ۱۹۲۴ء کے بعد تقریباً تمام بڑے بڑے مسلم لیڈر کانگریس سے علاحدہ ہوگئے تھے۔ مگر مولانا ابوالکلام آزاد نے اختلافات کے باوجود کبھی کانگریس سے علاحدگی نہیں کی۔ انھوں نے اپنے نیشنلسٹ مسلم گروپ کو مضبوط کیا۔ ۱۹۲۹ء میں نیشنلسٹ مسلم پارٹی قائم کی گئی جس کے مولانا آزاد صدر، ٹی۔ اے۔ شیروانی سکریٹری اور ڈاکٹر انصاری ٹریژرر مقرر ہوئے۔ یہ پارٹی مسلمانوں کو متحد کرنے اور کانگریس کے ساتھ آزادی میں حصہ لینے کے لیے آخر وقت تک کام کرتی رہی۔ مسلمانوں کے سینیر لیڈروں میں مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، آصف علی، کے علاوہ نوجوان لیڈر ڈاکٹر ذاکر حسین، رفیع احمد قدوائی وغیرہ کا نیشنلسٹ مسلم میں شمار تھا۔ مولانا آزاد کا یہ قدم مستقبل میں زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوا۔

۱۔ ملاحظہ کیجیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم

۲۔ پینڈرل مون، گاندھی اینڈ موڈرن انڈیا، ص ص۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵

۳۔ وائی۔ بی۔ ماتھر، کوئٹ انڈیا موومینٹ، ص۔ ۱۲۳
ملاحظہ کیجیے، بی۔ این۔ چوپڑا، "کوئٹ انڈیا موومینٹ"،
جرنل آف ہسٹوریکل اسٹڈیز ۱۹۶۵ء

۴۔ ایضاً
ماتھر، مذکورہ بالا

۵۔ طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ص۔ ۵۰۳۔ ۵۱۷

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

باب - ۲۱

آزادی اور تقسیمِ ہند

۵ مئی ۱۹۴۴ء کو گاندھی جی کی رہائی کے بعد لارڈ ویول نے گاندھی جی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کانگریس اور مسلم لیگ ایک عارضی حکومت قائم کریں۔ ہندستان جنگ میں پورا پورا تعاون کرے۔ جنگ کے بعد ہندستان کو آزاد کر دیا جائے گا۔ کانگریس نے اس تجویز کو رد کر دیا۔

۱۹۴۰ء میں لاہور ریزولیوشن کے مطابق محمّد علی جنّاح ایک علاحدہ ملک پاکستان کے قیام پر بضد تھے۔ راج گوپال آچاریہ نے اس مسئلے کے حل کے لیے ایک فارمولا تجویز کیا جس کے مطابق۔ (۱) جنگ کے بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔ (۲) مسلم اکثریت والے صوبوں میں پیبائٹ (PLEBISCITE) کے ذریعے پاکستان کی علاحدگی یا کچھ صیغے جیسے دفاع، رسل ورسائل وغیرہ مرکز کو سپرد کر کے رائے عامّہ لی جائے (۳) یہ فارمولا حکومت کی منتقلی کے بعد عمل میں لایا جائے۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں ہندو مہاسبھا کی مخالفت کے باوجود گاندھی جی نے اس فارمولے پر محمّد علی جنّاح سے گفتگو کی۔ جنّاح نے اس فارمولے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ چھے صوبے، پنجاب، سندھ، بلوچستان، شمال مغربی صوبہ، بنگال اور آسام کچھ ترمیم کے بعد پاکستان میں شامل ہوں۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ پاکستان کا قیام آزادی کے بعد تک ملتوی نہیں رکھا جا سکتا۔ دورانِ جنگ دونوں ہی جماعتیں

کولیشن حکومت قائم کرنے کے لیے راضی ہوگئیں۔

شملہ کانفرنس

جون ۱۹۴۵ء میں یعنی ایک ماہ الیکشن سے پہلے وزیراعظم ونسٹن چرچل، نے وائسرائے لارڈ ویول کو ہندستانی لیڈروں سے گفتگو کرنے کی اجازت دے دی۔ ۱۴ر جون ۱۹۴۵ء کو تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ اور اعلان کیا گیا کہ مرکزی مجلس وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے علاوہ ہندستانیوں پر مشتمل ہوگی۔ یہ کونسل آئین تیار کرے گی۔ ۲۵ر جون سے ۱۴ر جولائی تک شملہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانگریس نے تجویز رکھی کہ مرکزی کونسل میں تمام قوموں کی متوازن نمایندگی ہونی چاہیے محمد علی جناح نے کہا کہ مسلم نمایندوں کو چُننے کا حق صرف مسلم لیگ کو ہے۔ اور دوسری شرط یہ رکھی کہ مسلمانوں کے سلسلے میں جو فیصلہ کیا جائے وہ مسلم نمایندوں ہی کی رائے سے کیا جائے۔ اس طرح شملہ کانفرنس میں کوئی فیصلہ نہ ہوسکا اور یہ کانفرنس ناکام ہوگئی۔

جولائی ۱۹۴۵ء میں الیکشن میں انگلستان میں لیبر پارٹی کی شاندار جیت ہوئی۔ لارڈ ویول کو گھبراہٹ ہوئی کہ لیبر پارٹی بہت جلد ہندستان کو حکومت منتقل کر دے گی اور ایسا ہوا بھی۔ اس وقت دنیا کا نقشا بھی بدل چکا تھا، نازی جرمنی کی شکست ہو چکی تھی۔ اگست ۱۹۴۵ء میں ایٹم بم سے ہیروشیما کی بربادی کے بعد جاپان نے اپنی شکست تسلیم کرلی تھی۔ مشرقی یورپ میں کمیونسٹ پارٹی کا زور بڑھ رہا تھا۔ ویت نام میں فرانس اور انڈونیشیا میں ڈچ نوآبادیات کی سخت مخالفت ہو رہی تھی۔ حالات کے پیشِ نظر وزیراعظم ایٹلی کی ہدایت پر لارڈ ویول نے ۱۹ر ستمبر ۱۹۴۵ء میں کامل آزادی دینے کی بجائے خود اختیاری حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا۔

۴۶-۱۹۴۵ء کے الیکشن میں تمام ہندستانی لیڈروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس دور کے سب سے معروف مقرر ثابت ہوئے۔ سردار پٹیل نے کانگریس کے نمایندوں کو چننے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ الیکشن

میں کانگریس کی زبردست جیت ہوئی۔ ۱۰۲ مرکزی اسمبلی کی نشستوں میں سے ۵۷ نشستیں کانگریس نے حاصل کیں۔ بنگال، سندھ اور پنجاب کے علاوہ تمام صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی۔ مہاسبھا کی بری طرح ہار ہوئی کمیونسٹ پارٹی کو بہت کم نشستیں مل سکیں۔ لیکن کمیونسٹ پارٹی نے کئی صوبوں میں کانگریس کا ساتھ دیا۔ مسلم صوبوں میں مسلم لیگ کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ نشستیں حاصل ہوئیں۔[1]

کیبنیٹ مشن

۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو کیبنیٹ مشن دہلی آیا۔ اس مشن میں پیتھک لارنس، کرپس اور الیگزینڈر شامل تھے۔ جون ۱۹۴۶ء تک یہ مشن ہندستانی رہنماؤں سے حکومت کی منتقلی اور دستوری مسائل پر گفت و شنید کرتا رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس وقت کانگریس کے صدر تھے۔ خصوصاً دو معاملات زیر بحث تھے۔ اوّل انٹیرم حکومت کا قیام، دوم نئے دستور کی تشکیل کے طریقۂ کار کا تعین۔ ۱۶ رمئی ۱۹۴۶ء کو کیبنیٹ مشن نے اپنا پلان پیش کر دیا، محمد علی جناح کے سامنے دو تجاویز رکھی گئیں۔ یا تو وہ کیڑے کھایا ہوا (MOTH EATEN) پاکستان قبول کریں۔ یا پھر تھری ٹائر کانفیڈرل اسٹرکچر منظور کریں۔ جس کے مطابق شمال مغربی اور شمال مشرقی دو پاکستان مسلم اکثریت کے رہیں گے۔ اور ایک الگ سے یکجا پاکستان بنانا مشکل ہوگا۔ چوں کہ بنگال اور پنجاب میں ۴۸ فیصدی ہندو رہتے ہیں اس لیے ان صوبوں کی تقسیم بھی ضروری ہوگی۔ محمد علی جناح نے کیبنیٹ مشن کی دوسری تجویز یعنی فیڈرل اسٹرکچر کی اسکیم کو نہیں مانا کیوں کہ اس میں ہندو اکثریت کو فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ انھوں نے ایک الگ پاکستان کی مانگ کی۔ محمد علی جناح نے انٹیرم حکومت میں شامل ہونا منظور کر لیا بشرطیکہ پاکستان کے لیے ایک الگ دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کی جائے۔[2] کیبنیٹ مشن نے پوری طرح محمد علی جناح کو پاکستان کے قیام سے آیندہ خطرات اور نتائج سے باخبر کر دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں کیبنیٹ مشن کا پلان حقیقت پسندانہ تھا۔ مگر افسوس

کہ نہ تو مسلم لیگ نے اور نہ ہی کانگریس نے اس پلان کو پوری طرح قبول کیا اور نہ ہی اس کو پوری طرح رد کیا۔[۳]

انٹریم گورنمنٹ آخر کار ویول نے کانگریس کو انٹریم حکومت قائم کرنے کے لیے مدعو کیا۔ پنڈت نہرو نے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو انٹریم گورنمنٹ قائم کی۔ ۶/۷ جولائی کو مسلم لیگ نے بھی کیبنٹ مشن کا پلان مان لیا اور انٹریم گورنمنٹ میں بھی شامل ہونا منظور کر لیا۔ اس کے بعد دستور بنانے کی کوشش شروع ہوئی۔ اس وقت پنڈت نہرو کانگریس کے صدر منتخب ہو چکے تھے۔ صدر کی حیثیت سے پنڈت نہرو نے ایک بیان جاری کیا کہ دستور ساز اسمبلی کو اختیار ہوگا کہ وہ جس طرح کا دستور چاہے بنائے۔ اس سے مسلم لیگ کو شک ہو گیا۔[۴]

نہرو کے بائیوگرافر لیونارڈ موسلے اور بریچر نے نہرو کے اس بیان کو خلاف مصلحت بتایا۔[۵] مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی یہی رائے تھی۔ اس بیان کے بعد جناح نے ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان سے کلکتہ میں فرقہ وارانہ فضا پیدا ہو گئی۔[۶]

انٹریم گورنمنٹ میں مسلم لیگ اور کانگریس کا ربط قائم نہ ہو سکا۔ لیاقت علی خاں کو وزیر خزانہ بنایا گیا۔ وزیر خزانہ کو ہر معاملے میں رکاوٹ پیدا کرنے کا موقع تھا اور انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اس طرح کانگریس کے کاموں میں اڑچن پیدا ہوئی۔ سردار پٹیل نے ہوم منسٹر ہونے پر اصرار کیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں کہ سردار پٹیل نے وزارت خزانہ کے لینے سے انکار کر کے بھاری غلطی کی تھی۔ وسط اکتوبر میں مشرقی بنگال کے نواکھالی اور ٹپیرا ضلعوں میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔[۷]

۲۰ نومبر کو دستور ساز اسمبلی کی میٹنگ بلائی گئی۔ جناح نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ کانگریس نے کہا کہ یا تو مسلم لیگ کیبنیٹ پلان مانے یا پھر انٹریم گورنمنٹ سے استعفا دے۔ ۲ دسمبر ۱۹۴۶ء کو جناح، نہرو، بلدیو سنگھ اور وائسرائے اٹیلی سے بات چیت کرنے لندن گئے۔ انگلستان کی حکومت نے فیصلہ کر دیا کہ ایسے مسئلے جن پر

اختلاف ہو فیڈرل کورٹ کے سپرد کیے جائیں وہی فیصلہ آخری ہو گا۔

۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو دستور ساز اسمبلی کی میٹنگ ہوئی مسلم لیگ نے بائکاٹ کیا۔ راجندر پرشاد اس میٹنگ کے صدر تھے۔ اس میں فیصلہ ہوا کہ ہندستان کو انڈین یونین ایز این انڈپینڈینٹ ساورن بنایا جائے۔ اسی میٹنگ میں اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت کی ضمانت لی گئی۔ مگر ان فیصلوں کو اس وقت تک آخری نہ سمجھا جائے۔ تاوقتیکہ ۲۰ر جنوری ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ اور ہندستانی ریاستوں کے نمایندے دستور ساز اسمبلی میں شامل نہ ہو جائیں۔

۲۰ر جنوری ۱۹۴۷ء کو دستور ساز اسمبلی کا دوسرا جلسہ ہوا۔ پنڈت نہرو نے اس اسمبلی کے مقاصد واضح کیے اور کمیٹیاں مقرر کیں۔ ۳۱ جنوری کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے دستور ساز اسمبلی کے طریقۂ کار پر اعتراض کیا اور اسے غیر قانونی قرار دیا۔

آخر کار اٹیلی نے برطانوی حکومت کی ہندستان سے دست برداری کی تاریخ جون ۱۹۴۸ء مقرر کر دی۔ لارڈ ویول کو اس پر اعتراض ہوا۔ ویول کا کہنا تھا کہ جب تک فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہ ہو جائے ہمیں ایسا نہ کرنا چاہیے۔ لارڈ ویول کو مستعفی ہونا پڑا۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں ماونٹ بیٹن کو وائسرائے مقرر کیا گیا۔ ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ اگر مسلم لیگ دستور ساز مجلس میں شامل نہیں ہوئی تو انگریز جس کو مناسب سمجھیں گے حکومت منتقل کر دیں گے۔

اٹیلی کے اس قدم کے بعد کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن شروع کر کے صوبوں پر قبضہ جمائے رکھنے کی کوشش کی۔ لاہور، امرت سر، ملتان، راولپنڈی اور دیگر صوبوں میں مار کاٹ شروع ہو گئی۔

۲۴ر مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماونٹ بیٹن ہندستان آئے گاندھی جی نے ان سے کہا کہ وہ محمد علی جناح کو حکومت قائم کرنے کے لیے مدعو کر سکتے ہیں۔ اس تجویز کو کانگریس نے رد کر دیا۔ ماونٹ بیٹن نے محسوس کیا کہ ان حالات میں کیبنیٹ مشن کے پلان پر عمل کرنا ناممکن ہے، اور ملک کی تقسیم ناگزیر ہے۔ کانگریس جو

ایک متحدہ ہندستان کا خواب دیکھ رہی تھی ملک کی تقسیم کا بے حد افسوس تھا مگر کانگریس کو بھی یہ احساس ہوگیا کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔

لارڈ ماونٹ بیٹن پلان

ماونٹ بیٹن کا ملک کی تقسیم کا پلان سب سے پہلے سردار وبھ بھائی پٹیل (۱۸۷۵ء۔ ۱۹۵۰ء) نے منظور کیا۔

سردار پٹیل ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۵ء کو گجرات میں پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں احمد آباد کے کارخانے کے مزدوروں کی ہڑتال میں گاندھی جی کا پُرجوش ساتھ دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں ترک موالات اور خلافت تحریک میں شامل ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے باردولی آندولن چلایا اور اس میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ اسی وقت سے گاندھی جی نے انھیں سردار کا خطاب دیا تھا۔ اسی وقت سے وہ مہاتما گاندھی کے چند بھروسے کے ساتھیوں میں شامل رہے۔ ۱۹۳۱ میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس عہدے پر وہ تین سال تک رہے تھے ۱۹۴۶ء کی انٹیرم گورنمنٹ میں ہوم منسٹر بنے۔ اسی دوران وہ مسلم لیگ کے عدم تعاون کی وجہ سے اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہے۔ گاندھی جی نے ایک بار اپنی گفتگو میں مولانا ابوالکلام آزاد سے یہ کہا تھ کہ پاکستان میری لاش پر بنے گا۔ پنڈت نہرو بھی پاکستان کے سخت خلاف تھ ماونٹ بیٹن سے گفتگو کرنے کے بعد گاندھی جی اور پنڈت نہرو دونوں ہی پاکستا کے قیام کے لیے تیار ہو گئے۔ بریچر کے بقول پنڈت نہرو کا خیال تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے۔ پنڈت نہرو کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کی فیڈرل گورنمنٹ کی تجویز کو ماننا ہندستان کو کمزور بنانا ہوگا۔ اور مرکز مستقل ط پر کمزور ہو جائے گا۔ ایک وقت وہ آئے گا کہ ہندستان چھوٹے چھوٹے ٹکڑو میں تقسیم ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ جلد سے جلد آزادی حاصل کرنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے۔ کیا ہم الگ ہو کر ایک مضبوط ہندستان سکیں گے

محمد علی جناح نے پورا بنگال اور پورا پنجاب مانگا تھا مگر کانگ

کامطالبہ تھا کہ ہندو اکثریت کے علاقے ہندستان میں رہیں گے۔ آخر کار جناح کو یہ بات ماننی پڑی۔ بدامنی کو جلد از جلد ختم کرنے کے لیے ماونٹ بیٹن نے اپنا تقسیم کا پلان منظوری کے لیے لندن ۲ر مئی ۱۹۴۷ء کو بھیج دیا۔ تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد ۱۰ر مئی کو منظوری آگئی۔ اس پلان پر کانگریس کو اعتراض ہوا تو ایک بار بذاتِ خود لندن گئے اور وزیر اعظم سے ضروری مشورے کر کے ۳۰ر جون کو آل انڈیا ریڈیو پر اس پلان کا اعلان کر دیا۔ حکومت کی منتقلی کی تاریخ وائسرائے نے ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء مقرر کی۔ کانگریس کو سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ خان عبدالغفار خاں کے صوبے نارتھ ویسٹ فرنٹیر پراونسز پاکستان میں چلے جائیں گے۔ ماونٹ بیٹن نے پلیبسائٹ کی تجویز رکھی جس پر بادشاہ خان تیار نہیں ہوئے کیوں کہ انھیں خطرہ تھا کہ یہ اس صوبے کے حق میں نہیں ہوگا۔ گاندھی جی نے ماونٹ بیٹن سے کہا کہ وہ کوئی ایسی صورت نکالیں کہ خدائی خدمتگار اور بادشاہ خان ہندستان کے ساتھ رہیں۔ ماونٹ بیٹن نے تجویز کیا کہ خدائی خدمتگاروں کو تین تجویزیں پیش کی جائیں۔ یا تو وہ پاکستان میں شامل ہوں یا ہندستان میں اور یا پھر اپنا الگ صوبہ پختونستان بنالیں۔ یہ تجویز جناح نے رد کر دی تھی۔ آخر میں اس کو آزاد صوبہ بنانے کا ریفرنڈم کیا گیا جس کا خان برادرس نے بائکاٹ کیا اور یہ سرحدی صوبہ پاکستان کو چلا گیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۱۲ر جون کو تقسیم کا پلان منظور کیا۔ ۱۴، ۱۵ر جون کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے منظوری دے دی۔[۱]

۱۰ر جون کو مسلم لیگ نے تقسیم کے پلان کی منظوری دے دی۔

۴ر جولائی کو انڈین انڈیپنڈنس بل انگلستان کے ہاؤس آف کامنس میں پیش کیا گیا۔ ایٹلی اور ماونٹ بیٹن کی خدمت کو سراہا گیا، ۱۵ر جولائی کو بغیر ترمیم کیے پاس کر دیا گیا۔ دوسرے دن ہاؤس آف لارڈس نے بھی پاس کر دیا۔ ۱۸ر جولائی کو بادشاہ کی منظوری مل گئی۔ اس ایکٹ کی حسب ذیل قرار داد

آزادی کا اعلان اور تقسیم ہند

(۱) ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے دو حکومتیں ہندستان اور پاکستان بنائی جائیں۔
(۲) ان دونوں حکومتوں کی حدود مقرر کر دی گئیں۔
(۳) بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے لیے کمیشن مقرر کیا گیا جس میں دو مسلم لیگ اور دو کانگریس کے نمایندے شامل ہوں گے۔ سر ریڈ کلف اس کمیشن کے چیرمین مقرر ہوئے۔ اختلاف کی صورت میں چیرمین کا فیصلہ آخری ہو گا۔
(۴) ہر حکومت کا ایک گورنر جنرل ہو گا۔ جو بادشاہ مقرر کرے گا۔ دونوں حکومتوں کا ایک گورنر جنرل ہو سکتا ہے اگر دستور ساز اسمبلی اس کے خلاف فیصلہ نہ کرے۔
(۵) دونوں حکومتوں کی دستور ساز اسمبلیاں دستور تیار کریں گی۔ اور انگلستان کی پارلیمنٹ کا کوئی قانون ۱۵ اگست کے بعد لاگو نہ ہو گا۔
(۶) ۱۵ اگست کے بعد انگلستان کا شہنشاہ دونوں حکومتوں کا بادشاہ نہیں رہے گا اور تمام صلح نامے ختم سمجھے جائیں گے۔

اس ایکٹ کے لاگو ہونے کے بعد ہندستان کا گورنر جنرل لارڈ ماونٹ بیٹن کو مقرر کیا گیا اور پاکستان کے گورنر جنرل محمّد علی جنّاح ہوئے۔

تقسیم کا کام ایک تقسیم کمیشن نے پورا کیا۔ حیدر آباد، سندھ، جوناگڈھ کاٹھیاواڑ اور بھنڈ کے حکمرانوں نے پاکستان میں شامل ہونا منظور کیا۔ سردار پٹیل کی کوششوں سے باقی ریاستی حکمرانوں نے ہندستان میں شامل ہونا منظور کیا۔

۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کی دستور ساز اسمبلی نے قائدِ اعظم محمّد علی جنّاح کو صدر منتخب کیا ۱۳ اگست کو ماونٹ بیٹن پاکستان پہنچے۔ ۱۴ اگست کو دستور ساز اسمبلی کو خطاب کیا۔ ۱۵ اگست کو پاکستان کا قیام ہو گیا۔ جنّاح گورنر جنرل مقرر ہوئے اور لیاقت علی وزیر اعظم۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندستان کی دستور ساز اسمبلی کی میٹنگ دلی

میں ہوئی۔ یہ دن ہندستان کے لیے ایک سنہری دن تھا۔ تھوڑا غم تھا کہ مشرقی بنگال کے ہندوؤں اور مغربی پنجاب کے سکھوں کو یہ آزادی نصیب نہ ہوسکی۔ اس خوشی کے موقع پر پنڈت نہرو نے بڑی عمدہ تقریر کی۔ انھوں نے کہا۔

"ٹھیک آدھی رات کو جب دنیا میٹھی نیند سو رہی ہوگی۔ ہندستان ایک نئی زندگی میں قدم رکھے گا۔ اور ایک آزاد ملک ہوگا۔ ایسے لمحے تاریخ میں آتے ہیں مگر بہت کم۔"

"AT THE STROKE OF THE MIDNIGHT HOUR WHEN THE WORLD SLEEPS, INDIA WILL AWAKE TO LIFE AND FREEDOM. A MOMENT COMES, WHICH COMES BUT RARELY IN HISTORY." [۱۱]

ہندستان کی دستور ساز اسمبلی نے لارڈ ماونٹ بیٹن کو پہلا گورنر جنرل مقرر کیا۔ میٹنگ کے بعد نہرو اور راجندر پرشاد ماونٹ بیٹن کے پاس گئے، اور ان سے یہ عہدہ قبول کرنے کی درخواست کی۔ لارڈ ماونٹ بیٹن نے مسرت اور فخر کے جذبات کے ساتھ یہ عہدہ قبول کیا اور وعدہ کیا کہ وہ دستور کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو نبھائیں گے۔ ۱۵ر اگست کو لارڈ ماونٹ بیٹن گورنر جنرل ہوئے اور نہرو وزیر اعظم۔

دستور ساز اسمبلی کی میٹنگ میں راجندر پرشاد نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے بڑی جدوجہد اور قربانیاں کی ہیں۔ لیکن دنیا کے حالات اور اس سے بھی زیادہ انگریزوں کی انصاف پسندانہ پالیسی کی وجہ سے ہمیں یہ آزادی میسر ہوئی ہے۔

تقسیم کے وقت عہد لینے کے باوجود خصوصاً پنجاب میں بڑا خون خرابہ ہوا۔ سکھ جو مغربی پنجاب چھوڑنا نہیں چاہتے تھے یا تو انھیں مجبوراً چھوڑنا پڑا یا مارے گئے۔ اسی طرح کے حالات مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے۔

مورلے کا خیال ہے کہ آزادی دینے میں اگر تھوڑے صبر سے کام لیا جاتا تو شاید یہ افراتفری نہیں ہوتی۔ [۱۲]

(حوالے صفحہ ۲۵۳ پر)

باب - ۲۲

انقلابی و دہشت پسند تحریکیں

ہندوستان کو آزاد کرانے کا افتخار کانگریس جماعت اور خصوصاً گاندھی جی کی عدم تشدد کی تحریک کو دیا جاتا ہے۔ پٹابھی سیتارمیا کی رائے ہے کہ " کانگریس کی تاریخ ہی قومی جدوجہد کی تاریخ ہے"۔ گاندھی جی کے عروج سے پہلے کانگریس جماعت ہی کے متعدد رہنما پُرامن طریقوں سے آزادی کا حصول ناممکن سمجھتے تھے۔ وہ پُرامن طریقوں کے خلاف نہیں تھے مگر ضرورت پڑنے پر تشدد کا استعمال ناجائز نہیں سمجھتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے عدم تشدد کو اپنا آلۂ کار بنایا۔ جو لوگ مہاتما گاندھی کے اس طریقے سے متفق نہیں تھے اُن کا مقصد بھی وطن کو آزاد کرانا تھا۔ اُنھوں نے اس راہ میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور اپنی جانیں قربان کیں۔ ایسے جاں نثاروں کی قربانیوں کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں چند مخصوص رہنماؤں کا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

واسودیو بلونت پھڈکے ۱۸۵۸ء میں تاج برطانیہ کی سرپرستی میں ہندستان کی حکومت کی تنظیم نو کی گئی۔ لارڈ لٹن کے دور میں جب برطانوی سامراج اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ رہا تھا تو مہاراشٹر میں زبردست قحط کی وجہ سے عوام اقتصادی بدحالی کا شکار تھے۔ اسی پس منظر میں ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام ہوا۔ اسی زمانے میں مہاراشٹر کے انقلابی رہنما واسودیو بلونت پھڈکے (۱۸۴۵ء

۱۸۸۳ء) نے نوکری چھوڑ کر انقلابی تحریک شروع کی۔ انھوں نے ۱۸۷۶ء میں پونا میں قحط کے بھیانک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اور برطانوی حکومت کی لاپرواہی سے بے چین ہو اُٹھے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں انگریزوں کو ملک سے نکال کر عوام کی حکومت قائم کروں گا۔ پھڈکے نے تقریباً ۴۰ ساتھیوں کے ساتھ توڑ پھوڑ اور ڈکیتی کی وارداتیں کیں۔ ۲۱ راگست ۱۸۷۹ء کو حکومت نے ان پر کئی الزام لگاکر گرفتار کرلیا۔ ۲۲ راکتوبر کو انھیں عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس وقت لوگ انگریزی سرکار سے بہت ڈرتے تھے اور کوئی وکالت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن گنیش شنکر واسودیو جوشی نے ان کی بے جھجک وکالت کی۔ پھڈکے نے عدالت ہی میں کہا کہ ہندستانی اب موت کے دروازے پر کھڑے ہیں، سرکار نے انھیں اتنا کچل دیا ہے کہ وہ ہمیشہ اکال اور قحط سے گھرے رہتے ہیں۔ جہاں بھی نظر ڈالو ایسے نظارے ملتے ہیں جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کا سر شرم سے نیچا ہو جاتا ہے۔ اس غلامی سے تو موت بہتر ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں کامیاب ہو جاتا تو ایک بڑا کام کر جاتا۔ عوام کی حکومت قائم کرجاتا۔ انھوں نے ہندستانیوں کو للکارتے ہوئے کہا کہ "میں اپنی جان دے کر تمھیں جگانا چاہتا ہوں کہ انگریزوں کو ختم کرکے آزادی حاصل کرو، اور میرا آخری سلام قبول کرو۔"

برطانوی حکومت نے پھڈکے کو عمر قید کی سزا دے کر عدن کی جیل میں ڈال دیا۔ وہاں انھیں بے حد جسمانی تکلیفیں پہنچائیں۔ فروری ۱۸۸۳ء میں جیل ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔[۲]

بنگال بنگال میں ۱۹۰۲ء میں انقلابی تحریک مدناپور میں جنانیندر باسو نے شروع کی۔ کلکتہ میں جتندر ناتھ بنرجی اور بریندر کمار گھوش نے شروع کی۔ ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں انوشیلن سمتی کے تحت بریندر کمار گھوش اور بھوپیندر ناتھ دت نے اروبندو گھوش کے مشورے پر ایک ہفتہ وار اخبار "یوگانتر" جاری کیا۔ اسی سال مشرقی بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر فلر کو قتل کرنے کی ناکام سازش کی۔ اسی گروہ کے

ہیم چندر قانون گو سیاسی تربیت حاصل کرنے اور فوجی مدد لینے پیرس گئے۔ پیرس میں ان کی روس کے مہاجرین نے بہت مدد کی۔ ۱۹۰۸ء میں قانون گو پیرس سے واپس آئے۔ کلکتہ میں مانک ٹلا کے علاقے میں ایک مذہبی اسکول اور بم بنانے کی فیکٹری قائم کی۔ لیڈروں کی لاپروائی کی وجہ سے ۳۰ر اپریل ۱۹۰۸ء کو آروبندو گھوش کو کینیڈی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ یہ قتل پُرافلا چاکی اور خودی رام باسو نے کیا تھا۔ مجسٹریٹ کینگ فورڈ جن کو قتل کرنے کا منصوبہ تھا کسی طرح بچ نکلے تھے۔

۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم اور ۱۹۱۱ء میں اس کی منسوخی کے دوران راش بہاری بوس اور سچیندر ناتھ سانیال نے بنگال میں انقلابی تحریک شروع کی تھی انھوں نے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر چاندنی چوک میں ۲۲ر دسمبر ۱۹۱۲ء کو بم پھینکا۔ وائسرائے کا گارڈ فوراً مر گیا۔ وائسرائے زخمی ہوئے۔

راس بہاری کو گرفتار کرنے کے لیے سات ہزار پانچ سو روپے کا انعام رکھا۔ سی۔آئی۔ڈی۔ ان کے پیچھے پڑ گئی۔ مگر راس بہاری بوس نکل بھاگے۔ ۱۹۱۵ء میں راس بہاری بوس نے انقلاب کا ایک بڑا منصوبہ بنایا۔ لیکن ملک کے غدار کرپال سنگھ نے اس منصوبے کا راز فاش کر دیا۔ ۱۹۱۵ء میں جاپان پہنچ کر آزاد ہند فوج قائم کی۔ یہ وہی فوج تھی جس کو راس بہاری بوس نے سبھاش چندر بوس کے حوالے کیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں راس بہاری بوس کا جاپان میں انتقال ہو گیا انھیں یہ یقین ہو چلا تھا کہ ہندستان کی آزادی دور نہیں ہے[۳]

مدراس مدراس میں بھی انتہا پسند تحریک نے کافی زور پکڑا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں سبرامنیم آئر (۱۸۵۵ء۔ ۱۹۱۶ء) نے اس علاقے میں کئی بار دورہ کیا۔ یہ تحریک مدراس کے سبرامنیم شیوا کے داخل ہونے سے اور شدت پکڑ گئی۔ وہ تقریباً روز تقریریں کرتے تھے۔ انھوں نے سوراج اور سودیشی کے نعروں کو پھیلایا۔ ایک رپورٹ کے مطابق سبرامنیم شیوا نے تشدد کے طریقوں کی بھی تلقین کی۔ اسی لیڈر نے مل کے مزدوروں کی ہڑتال کرا کے ان کی مزدوری میں ۵۰ فیصدی بڑھوتری کرائی۔ مارچ کے مہینے میں

جب برطانوی حکومت نے شیوا کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تو احتجاجی ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔ آفسوں، پولیس اسٹیشنوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر حملے ہوئے۔ ۱۱-۱۲ مارچ ۱۹۰۸ء کے کلکتہ کے "بندے ماترم" میں اس کو بہت سراہا گیا۔ اس میں لکھا کہ "EVERY VICTORY FOR INDIAN LABOUR IS A VICTORY FOR THE NATION." شیوا کی گرفتاری کے بعد اس گروہ کے لوگ دہشت پسند کارروائیوں میں مصروف ہو گئے۔[۴۰]

پنجاب | پنجاب میں انقلابی تحریکیں ۱۹۰۰ء سے شروع ہو چکی تھیں۔ سردار اجیت سنگھ، بھائی پرمانند، ان کے چھوٹے بھائی بال مکند اور لالہ ہردیال ان تحریکوں میں شامل تھے۔ اجیت سنگھ نے لاہور میں انجمن محبانِ وطن قائم کی، ایک جرنل "بھارت رتن" جاری کیا۔ شروع میں اجیت سنگھ کے گروہ نے چناب اور دواب کے کسانوں کو لگان ادا نہ کرنے کی ترغیب دی۔ مئی ۱۹۰۷ء میں اجیت سنگھ کو گرفتار کر لیا گیا۔

بھگت سنگھ | بھگت سنگھ (۱۹۰۷ - ۱۹۳۱ء) ۲۷ دسمبر ۱۹۰۷ء کو پنجاب کے بنگا گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے چچا اجیت سنگھ کو خطرناک انقلابی قرار دے کر منڈالے جیل میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔

جلیان والا باغ کے حادثے کے بعد پنجاب میں کبھی امن قائم نہ ہو سکا تھا۔ بھگت سنگھ نے بھی اسی زمانے میں انقلابی کارروائیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے پولیس کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ ایک بار لاہور میں دسہرے کے موقع پر پولیس پر بم پھینکنے کے الزام میں گرفتار کیے گئے۔ کسی ثبوت کے نہ ملنے کی وجہ سے انھیں رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد بھگت سنگھ پوری طرح انقلابی لیڈر بن گئے۔ انھوں نے نوجوان بھارت سبھا، قائم کی۔ ۱۹۲۸ء میں ہندستان کے نوجوانوں کو منظم کر کے انھوں نے ہندستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن، قائم کی۔ انھوں نے کہا کہ میں دہشت پسند نہیں ہوں لیکن کچھ مقاصد کو پورا کرنے کے لیے انقلابی ضرور ہوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بم اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتے۔ ان کا کچھ موقوف

ہی پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا مقصد عوامی تحریک چلانا ہونا چاہیے اور فوجی تیاری کرتے رہنا چاہیے۔ تاکہ موقع پر کام آئے۔ لالہ لاجپت رائے کو لاہور میں جب پولیس نے ۳۰/اکتوبر ۱۹۲۸ء کو لاٹھیوں سے بڑی بے دردی سے مارا تو اس حادثے سے سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا خون کھولنے لگا۔ انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے لالہ لاجپت رائے کو لاٹھیاں کھاتے دیکھا تھا۔ بھگت سنگھ نے اپنی جماعت ہندستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن کا نام بدل کر ہندستان سوشلسٹ ریبلکن آرمی رکھ دیا۔ بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، شیورام راجگرو اور جے گوپال نے اس بے عزتی کا بدلہ لینے کا عہد کیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے ۱۵/دسمبر ۱۹۲۸ء کو سانڈرس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ لوگ اسکاٹ کو مارنا چاہتے تھے مگر اسے پہچان نہ سکے۔ اس واقعے سے بھگت سنگھ ہیرو بن گئے۔ اس کے بعد مالکوم ہیلی نے ایک پولیس فورس بنایا جس نے پنجاب کے لوگوں پر بہت ظلم کیا انھیں جیلوں میں بند کیا۔ گھر گھر کی تلاشیاں لیں۔ بھگت سنگھ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ لاہور سے نکل کر بھاگ گئے۔ کچھ دن کلکتہ میں رہے۔ اس کے بعد وہ کانپور چلے گئے۔ وہاں 'پرتاپ' کے اڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔

۸/اپریل ۱۹۲۹ء کو دلّی میں اسمبلی میں 'پبلک سیفٹی' کے مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔ عوام اس کے خلاف تھے اور سرکار اس بل کو پاس کرنا چاہتی تھی۔ بھگت سنگھ کی جماعت نے فیصلہ کیا کہ عوام کی آواز کو منوانے کے لیے اسمبلی میں بم پھینکا جائے۔ اس کے لیے سردار بھگت سنگھ اور بٹکیشور دت کو چُنا گیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ وہ اسمبلی سے بھاگیں نہیں بلکہ اپنے آپ کو گرفتار کروا دیں۔ اور وہیں اس جماعت کے مقاصد کے بارے میں لوگوں کو جانکاری دی جائے۔ یہ سب جانتے تھے کہ اس کا انجام پھانسی ہوگا۔ مگر ان جانثار بہادروں نے اپنی قربانی دے کر سیاسی شعور پیدا کرنے کا یہ نرالا طریقہ نکالا تھا۔ انقلابی سُکھ دیو نے ضد کی کہ یہ کام اُن کے سپرد کیا جائے۔ مگر یہ کام بھگت سنگھ اور بٹکیشور ہی کو دیا گیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے

جیل میں ڈال دیا گیا۔ جیل میں قیدیوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جاتا تھا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے جیل میں اصلاح کرنے کی مانگ کی تو اس پر ان کی بے حد پٹائی کی گئی۔ انھوں نے بھوک ہڑتال کی۔ ۶۵ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد ان کے ایک ساتھی جتن داس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حکومت کو کچھ رعایتیں دینی پڑیں۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی کی سزا کا حکم ہوا۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۳۱ء کو بھگت سنگھ، شیورام راجگرو اور سکھ دیو کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔[۲۵]

لالہ ہردیال لالہ ہردیال (۱۸۸۴ء-۱۹۳۸ء) نے پنجاب یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں آکسفورڈ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں وہ شیام جی کرشنا ورما کے اثر میں آگئے۔ وہ مغربی تہذیب سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ وہ اپنے مذہب اور تہذیب و تمدّن کے مدّاح تھے۔ ان کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت ہندستانی قوم کو برباد کرنا چاہتی ہے۔ تبھی سے انھوں نے برطانوی سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ کچھ دن کے لیے ہندستان آئے اور ۱۹۰۸ء میں وہ ہمیشہ کے لیے انگلستان میں جا بسے۔

لالہ ہردیال نے یورپ اور امریکہ میں انقلابی تحریک چلائی اور دہشت پسند کارروائیاں بھی کیں۔ ۱۹۱۱ء میں ہردیال سین فرانسسکو میں جا بسے۔ کیلیفورنیا میں غدر پارٹی قائم کی۔ جب امریکہ سے انھیں دیش بدر کیا گیا تو وہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ پہلی جنگِ عظیم شروع ہونے پر وہ برلن کی ہندستانی سمتی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۷ء تک انھوں نے اس سمتی کے صدر کی حیثیت سے کام کیا۔ جنگ کے دوران لالہ ہردیال نے اپنا وقت جرمنی اور ترکی میں گزارا۔ وہاں انھیں جرمن سرکار کی پابندیوں میں رہنا پڑا۔ اس لیے وہ سوئیڈن چلے گئے۔

لالہ ہردیال کا خیال تھا کہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ہندستان میں بھی انقلاب آئے گا اور ہندستان آزاد ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ بے حد مایوس ہو گئے۔ اور آخر میں علمی زندگی کی طرف راغب ہو گئے تھے۔[۲۶]

چندر شیکھر آزاد چندر شیکھر آزاد (۱۹۰۶ - ۱۹۳۱ء) ۲۳ جولائی ۱۹۰۶ء کو مدھیہ پردیش کے جھبوا ضلع کے بھور گانو میں پیدا ہوئے۔ پنڈت سیتارام تواری کے بیٹے تھے۔ چندر شیکھر شروع ہی سے بھیل ذات کے لوگوں کے ساتھ رہ کر بے حد نڈر ہو گئے تھے۔

۱۹۲۰ میں جب وہ بنارس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو مہاتما گاندھی نے ترک موالات کی تحریک شروع کی تھی۔ چندر شیکھر اس میں شامل ہو گئے جب انھیں گرفتار کیا تو مجسٹریٹ کے سوالات کے جواب میں چندر شیکھر نے اپنا نام 'آزاد' باپ کا 'سوادھین' اور گھر قید خانہ بتایا۔ مجسٹریٹ نے نوجوان کی جرأت پر حیرت کرتے ہوئے ۱۵ بیت مارنے کی سزا دی۔ اور رہا کر دیا۔ اسی کے بعد سے وہ چندر شیکھر آزاد کے نام سے مشہور ہو گئے۔

۸ اور ۹ مارچ ۱۹۲۸ء کو مختلف انقلابی جماعتوں کے لیڈر فیروز شاہ کوٹلہ کے کھنڈرات میں ملے۔ بھگت سنگھ اور چندر شیکھر بھی اس میٹنگ میں شامل تھے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جب سائمن کمیشن لاہور میں آیا تو احتجاجی جلسے میں لالہ لاجپت رائے پر پولیس نے لاٹھیاں برسائی تھیں جس کی وجہ سے ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس حادثے پر ان انقلابیوں نے ایک میٹنگ کی اور پولیس کے افسر سانڈرس کو معینہ تاریخ پر گولی مار دی تھی۔ اسمبلی میں بم پھینکنے کا منصوبہ بنانے میں بھگت سنگھ کے ساتھ چندر شیکھر آزاد بھی تھے۔ اسی سال آزاد نے وائسرائے کی گاڑی کو بم سے اڑانے کی کوشش کی۔ انھوں نے دہلی میں ایک بم فیکٹری بھی کھولی تھی۔ ۲۷ فروری ۱۹۳۱ء کو آزاد یش پال اور سریندر پانڈے روس جانے کے منصوبے بنانے کے لیے الہ آباد میں جمع ہوئے۔ آزاد کو صبح الفریڈ پارک میں سکھ دیو سے ملنا تھا۔ جب وہ باغ کے ایک کونے میں بات چیت میں مصروف تھے تو کسی غدار کی مخبری پر انھیں پولیس نے آگھیرا۔ چندر شیکھر نے کئی پولیس والوں کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ پولیس انھیں گرفتار کر لے گی تو اپنے بھی گولی مار کر آزاد آزاد ہو گئے۔ شہ

رام بلاس بسمل اور اشفاق اللہ

رولٹ ایکٹ، جلیان والا باغ کا حادثہ، ترک موالات تحریک کا رد ہونا۔ ان تمام واقعات سے انقلابی رہنماؤں کو بے حد صدمہ اور مایوسی ہوئی تھی۔ سچیندر سانیال نے جنھیں ایک بار معاف کر دیا تھا دوبارہ انقلابی جماعتوں کو متحد کرنا شروع کیا۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو بنگال آرڈیننس پاس کیا گیا مگر انقلابی مایوس نہیں ہوئے۔ وہ برابر ہتھیار خریدتے رہے۔ ہتھیار خریدنے کے لیے جب روپیوں کی ضرورت پڑی تو ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو دس نوجوانوں کو مقرر کیا گیا کہ جب ٹرین کاکوری پہنچے تو سرکاری خزانہ لوٹ لیا جائے۔ اس واقعے کے سلسلے میں سی۔ آئی۔ ڈی پولیس نے ۴۰ آدمیوں کو گرفتار کیا۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس کیس میں پنڈت رام بلاس بسمل، راجندر لاہری، روشن سنگھ اور اشفاق اللہ کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ سانیال اور سچیندر بخشی کو کالا پانی کی سزا ہوئی۔ دیگر انقلابیوں کو بھی کئی کئی سال کی سزائیں دی گئیں۔

بسمل نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ ۱۹ تاریخ کو جو ہونے جا رہا ہے اس کے لیے میں اچھی طرح تیار ہوں۔ یہ صرف جسمانی تبدیلی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری روح یہ کام کرنے کے لیے پھر لوٹ آئے گی۔

پھانسی پر چڑھنے سے پہلے اشفاق اللہ نے اپنے ہم وطنوں کے نام ایک پیغام چھوڑا۔ انھوں نے کہا کہ مادرِ وطن کے اسٹیج پر ہم اپنا رول ادا کر چکے ہیں۔ ہم نے غلط صحیح جو کچھ کیا آزادی حاصل کرنے کے لیے کیا۔ لوگ ہمیں دہشت پسند کہتے ہیں۔ لیکن ہم نے کسی مخبر کو بھی گولی نہیں ماری۔

ہندستانیو ! آپ چاہے کسی بھی فرقے یا مذہب کے ہوں لیکن آپ کو متحد ہو کر وطن کو آزاد کرانے میں حصہ لینا چاہیے۔ مذہبی جھگڑے بیکار ہیں۔ سب مذہب ایک ہی منزل کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس لیے سب مذہب ایک ہیں۔ آپ متحد ہو کر نوکر شاہی کا مقابلہ کیجیے۔ میں ہتھیارا نہیں ہوں جیسا مجھے ثابت کیا گیا ہے۔ میں پہلا ہندستانی مسلمان ہوں جو آزادی کے لیے پھانسی کے تختہ پر چڑھ رہا ہوں۔ اشفاق اللہ

کی مراد یہ تھی کہ مسلمان بھی آزادی کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں اور ہندوؤں سے متحد ہو کر یہ جنگ لڑیں۔

سبھاش چندر بوس

سبھاش چندر بوس (۱۸۹۷ء۔۱۹۴۵ء) ایسے رہنماؤں میں سے ہیں جنھوں نے کانگریس کی تحریک میں بڑے پُر جوش انداز سے حصّہ لیا۔

۱۹۲۱ء میں آئی۔ سی۔ ایس کی نوکری سے استعفا دے کر ۲۴ سال کی عمر ہی سے سبھاش چندر بوس نے سیاست میں حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ترک موالات کی تحریک ختم ہونے کے بعد سبھاش چندر بوس اور پنڈت جواہر لال نہرو آسمانِ سیاست پر نئے پُر جوش نوجوان لیڈر اُبھر کر آئے تھے دونوں ہی سوشلزم سے متاثر تھے۔ اور دونوں ہی نے مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا۔

۱۹۳۴ء میں جب گاندھی جی نے اپنی سِوِل نافرمانی کی تحریک واپس لے لی تو سبھاش چندر بوس نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ "ہماری یہ صاف رائے ہے کہ سیاسی رہنما کی حیثیت سے گاندھی جی ناکام رہے ہیں۔" دورانِ تحریک انھیں جیل میں بند کر دیا تھا۔ جب وہ بیمار ہوئے تو حکومت نے علاج کے لیے انھیں انگلستان بھیج دیا۔ وہاں وہ مختلف خیالوں کے رہنماؤں سے ملے۔ ۱۹۳۸ء میں جب وہ واپس آئے تو انھیں کانگریس کا صدر بنایا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں بھی سیتا رمیّا کے مقابلے میں سبھاش چندر بوس کو دوبارہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے منتخب کیا۔ گاندھی جی سیتا رمیا کو صدر بنانے کے حق میں تھے۔ بے حد اختلافات کی وجہ سے سبھاش بوس کو استعفا دینا پڑا۔ اسی سال انھوں نے اپنی ایک جماعت "فارورڈ بلاک" قائم کی۔ بہت جلد اُن کی جماعت میں متعدد نوجوان شامل ہوگئے۔ حکومت نے انھیں نظر بند کر دیا۔ بوس نے جیل ہی میں بھوک ہڑتال کرنا شروع کر دی۔ آخر کار حکومت نے انھیں رِہا کر دیا۔

جیل سے رِہا ہو کر انھوں نے اپنی تحریک دوبارہ شروع کر دی اور ایک ہندستانی حکومت قائم کرنے کی تجویز رکھی۔ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا انھیں پھر

نظر بند کر دیا گیا، اور بہت سخت پہرہ لگایا۔ مگر بوس ایک مسلم کا بھیس بدل کر جیل سے بھاگ گئے۔ مختلف ممالک سے گزرتے ہوئے آخر کار جاپان پہنچے۔ سبھاش چندر بوس نے وہاں پہنچ کر آزاد ہند فوج کی از سرِ نو تربیت اور تنظیم کی۔

فروری ۱۹۴۴ء میں آزاد ہند فوج نے بوس کی رہنمائی میں ہندستان کے شمال مغربی علاقے پر حملہ کیا اور کافی مشکلیں جھیل کر آسام کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ مگر آزاد ہند فوج اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسی وقت جاپان کی شکست بھی ہو گئی۔

اگست ۱۹۴۵ء میں جاپان نے امریکہ کے ایٹم بم کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ جاپان کے ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہروں کو امریکہ نے ایٹم بم سے بالکل نیست و نابود کر دیا تھا۔ اس کے بعد جاپان کے ماتحت صوبوں پر یکے بعد دیگرے انگلستان کا قبضہ ہونا شروع ہو گیا۔ سبھاش چندر کو ٹوکیو واپس جانا پڑا۔ مگر راستے میں ہوائی جہاز کے حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔[۱۱]

۱۔ پٹابھی سیتارمیا، ہسٹری آف دی انڈین نیشنل کانگریس

۲۔ پرتاپ سنگھ، آدھونک بھارت کا اتہاس، ص ص۔ ۸۱ - ۹۸
سُمِت سرکار، موڈرن انڈیا، ص۔۴۸

۳۔ سرکار، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۱۴۵ - ۱۴۷

۴۔ ایضاً، ص ص۔ ۲۶۰، ۲۶۹، ۳۱۱

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً، ص ص۔ ۲۶۰، ۲۶۹ - ۳۱۱

۷۔ ایضاً، ص ص۔ ۱۴۵ - ۱۴۹

۸۔ سیٹھی، کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا

۹۔ پرتاپ، مذکورہ بالا، ایضاً

۱۰۔ سرکار، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۲۵۲، ۲۵۵، ۲۷۸

باب ۔ ۲۲

ہندُستان کے سیکولر اور جمہوری دستور کا ارتقا

۱۸۵۸ءکا ایکٹ اور ملکہ وکٹوریہ کا منشورِ اعظم

۱۸۵۸ء میں ہندُستان کی حکومت کی ذمّہ داری اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے ایک فیض رساں حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے الہ آباد میں ایک دربار منعقد کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کا اعلان ہندُستان کے رہنے والوں کے لیے CHARTER OF PEOPLES' RIGHTS سمجھا گیا۔ اعلان میں بتایا گیا تھا کہ حکومت رعایا کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی۔ مذہبی شعائر یا عقائد کی بنا پر نہ کسی کے ساتھ رعایت کی جائے گی اور نہ کسی کو ستایا جائے گا۔ بلکہ قانون سب کا ایک سا محافظ ہوگا۔ ہر شخص جو اہلیت رکھتا ہوگا اس کو بلا تخصیص نسل و مذہب حکومتِ ہند کے اعلا سے اعلا عہدے ملیں گے۔ والیانِ ریاست کو یقین دلایا کہ آیندہ ریاستیں ضبط نہیں کی جائیں گی۔ یہ بھی اطمینان دلایا گیا کہ تاج برطانیہ اپنے ملکی مقبوضات میں کسی اضافے کا خواہاں نہیں ہے۔[۱]

۱۸۵۸ء کے قانون ہند کی رو سے حکومتِ ہند کی مرکزیت مکمل کر دی گئی تھی۔ لارڈ کیننگ کو وائسرائے بنا کر وسیع اختیارات دے دیے گئے۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ایک معزز رکن بارٹل فریئر کی رائے تھی کہ کونسلوں میں ہندُستانیوں کی نمایندگی بے حد ضروری ہے۔ تاکہ قانون بناتے وقت ہندُستان کی کثیر آبادی کی رائے اور ردّعمل

پتا چل سکے۔ وائسرائے کیننگ اور سکریٹری آف اسٹیٹ چارلس وُڈ کونسلوں کو جمہوری انداز پر تشکیل دینے کے حق میں نہیں تھے۔ چارلس وُڈ ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت کے انعقاد کو ناممکن سمجھتے تھے۔[۵۵]

۱۸۶۱ء کا انڈین کونسلس ایکٹ چارلس وُڈ نے ایک قانونی مسودہ پیش کیا تاکہ ۱۸۵۸ء کے قانون ہند کے نفاذ کے بعد حکومت ہند میں جو خرابیاں رونما ہوئی تھیں انھیں دور کیا جائے۔ اور قوانین بنانے میں رائے عامّہ کے منشا کو معلوم کیا جائے۔ اس کو انڈین کونسلس ایکٹ ۱۸۶۱ء کہتے ہیں۔ اس ایکٹ کی قرارداد حسب ذیل ہے۔ اس قانون کی رُو سے گورنر جنرل کی کونسل کے ارکان کی تعداد پانچ ہو گئی۔ جن میں تین ایسے ممبر ہونے چاہئیں جو ہندوستان میں تاج کی ملازمت میں کم از کم دس سال سے ہوں۔ ایک ممبر کے لیے بیرسٹر ہونا ضروری تھا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کو ایک اڈیشنل ممبر بنانے کا حق تھا۔ وائسرائے کو یہ حق تھا کہ اگر وہ تعطیل پر جائے تو کسی کو صدر مقرر کر دے۔ صدر کو وہی اختیار ہوں گے جو گورنر جنرل کو۔ کونسل کے رُولس اور ریگولیشن بنانا اور ممبروں کی تقرری کرنے کا گورنر جنرل کو حق حاصل تھا۔ کیننگ نے پہلی بار کونسل کے ممبروں کو صیغے { PORT FOLIO) تقسیم کیے۔ قانون بنانے کے لیے گورنر جنرل کو کونسل کے مزید بارہ ۱۲ ممبر نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا۔ جن میں نِصف غیر سرکاری ممبر ہونا ضروری تھا۔ میعاد عہدہ دو سال مقرر کی گئی۔ اس مجلس کو برطانوی مقبوضات کے مُروجّہ قوانین میں تبدیلی، ترمیم یا تنسیخ کرنے کا اختیار تھا۔ اور اس کو نئے قانون بنانے کا بھی اختیار دیا گیا۔ بشرطیکہ یہ نئے قوانین برطانیہ عظمیٰ کے دستور یا غیر تحریری آئین کے کسی طرح خلاف نہ ہوں۔ مالیات اور بحری یا برّی افواج سے متعلق کوئی مسئلہ بغیر گورنر جنرل کی اجازت کے پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گورنر جنرل کو ضرورت کے وقت چھے ماہ کے لیے خصوصی احکام نافِذ کرنے کا اختیار بھی دیا گیا۔ حکومت بمبئی اور مدراس اپنی مقامی ضرورتوں کے مطابق قاعدے اور ضابطے بنا سکتی تھیں۔ ان صوبوں میں الگ الگ لیجسلیٹو کونسل بنا دی گئی۔

بمبئی اور مدراس کے گورنروں کو اختیار حاصل ہو گا کہ وہ اپنی کونسل میں ۴ سے

۱۸ ارکان تک نامزد کریں جن میں نِصف کا غیر سرکاری ہونا ضروری تھا۔ صوبجاتی قانون مجالس کے وضع کیے ہوئے قانون کا نفاذ بغیر گورنر جنرل کی اجازت کے نہیں ہو سکتا تھا۔ برطانوی تاج کسی بھی قانون کو رد کر سکتا تھا۔ گورنر جنرل نئے صوبے قائم کر سکتا تھا جس کو لیفٹیننٹ گورنر کے ماتحت رکھ سکتا تھا۔ اس کے مطابق بنگال میں ۱۸۶۲ء میں کونسل قائم ہوئی، شمال مغرب میں ۱۸۸۶ء میں اور پنجاب میں ۱۸۹۷ء میں کونسلیں قائم کی گئیں۔[۱۶]

تبصرہ ۱۸۶۱ء کے کونسلس ایکٹ کے مطابق پہلی بار ہندستانیوں کو حکومت میں حصّہ دیا گیا۔ مگر گورنر جنرل اُن ہی ہندستانیوں کو نامزد کرتا تھا جن کی وفاداری مشتبہ نہیں تھی، اور جو حکومت کے خیر خواہ تھے۔ کونسلوں کی کارروائی انگریزی میں ہوتی تھی۔

اس ایکٹ کے مطابق پہلی بار کونسلوں کے ممبروں کو ذمّہ داریاں دی گئی تھیں۔ مگر یہ رعایت صرف یوُربین تک محدود تھی۔

اس ایکٹ کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ ممبروں کو بجٹ پر بحث کرنے کے اختیار سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں ۱۸۵۳ء کا چارٹر ایکٹ بہتر تھا۔ ممبروں کو بجٹ پر بحث کرنے کا اختیار تھا۔ اس لحاظ سے یہ ایکٹ بظاہر ہی جمہوری نظر آتا تھا۔

۱۸۹۲ء کا انڈین کونسلس ایکٹ تقریباً ۳۰ سال تک حکومت کے دستور میں کوئی حسبِ حال تبدیلی نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس ۱۸۶۵۔ ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء کے ایکٹس کے ذریعے گورنر جنرل کے اختیارات مزید بڑھا دیے گئے۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے قیام کے بعد ہندستان کی حکومت میں اور انتظامِ حکومت میں ہندستانیوں کی مانگوں میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ اس سے بیشتر صرف لارڈ رِپن نے ۱۸۸۱ء میں لوکل سیلف گورنمنٹ ایکٹ پاس کر کے ہر ضلع میں بورڈ قائم کیے۔ الیکشن کے ذریعے نمائندے اور چیرمین چُنے گئے۔ بورڈ کو ضلع کا انتظام دیا گیا۔ جس پر وہ بجٹ کی مقررہ رقم خرچ کر سکتے تھے۔

انگلستان میں لبرل انگریز گلیڈ اسٹون، کمبرلے، لارڈ کراس، اور سیلس بری ہندستانیوں کو حکومت میں کچھ حصہ اور ذمہ داری دینے کے حق میں تھے۔ لیکن وہ بھی الیکشن کے طریقے کو ہندستان میں مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

کانگریس کے مطالبات کے پیشِ نظر اور لبرل انگریزوں کی کشادہ دلی کی وجہ سے ہندستان کے دستور پر دوبارہ غور کیا گیا اور وائسرائے لارڈ لینس ڈاؤن کے دور میں ۱۸۹۲ء میں ایک دوسرا انڈین کونسل ایکٹ پاس کیا گیا۔ اس ایکٹ کی قرارداد حسب ذیل ہے۔

۱ ۔ مرکزی قانون ساز کونسل کے ارکان کی تعداد ۱۲ سے بڑھا کر ۱۶ کردی گئی۔ ان میں ½ غیر سرکاری ممبر رکھے گئے۔

۲ ۔ صوبجاتی کونسل کے ممبروں کی تعداد دس سے بیس کردی گئی۔ شمال مغربی صوبے کی کونسل کی تعداد ۱۵ رکھی گئی۔ یہاں بھی ½ غیر سرکاری ممبر رکھے گئے۔

۳ ۔ ہندستانی ممبروں کو الیکشن کے ذریعے چننے کا طریقہ رکھا گیا مگر الیکشن کا طریقہ طے کرنے کا اختیار وائس رائے کو دے دیا گیا۔ وائس رائے نے الیکشن کا بلاواسطہ طریقہ اپنایا۔ یعنی رپن کی قائم کی ہوئی مقامی حکومت کے ذریعے ہندستانی ممبروں کو چنا گیا۔

۴ ۔ اس ایکٹ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ممبروں کو بجٹ پر بحث کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔

تبصرہ سپریم کونسل کے ممبروں کی تعداد بہت زیادہ نہیں بڑھائی گئی۔ صرف چار ممبر بڑھائے گئے۔ صوبجاتی کونسلوں میں صرف ۲ ممبر بڑھائے گئے۔ کرزن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ لارڈ ڈفرن جو ہندستان میں انگلستان جیسی پارلیمنٹ کا خواب دیکھ رہے تھے انھوں نے بھی ممبروں کی زیادہ تعداد بڑھانا ضروری نہیں سمجھا بجٹ پر بحث کرنے کا حق تو دیا گیا مگر اتنی پابندیاں لگائی گئیں کہ یہ قرارداد بیکار ثابت ہوئی۔ تنقیدی سوال نہیں کیے جا سکتے تھے۔ گورنر جنرل کسی بھی سوال کو رد کر سکتا تھا گورنر

جنرل اب بھی با اختیار تھا۔ اس ایکٹ سے کانگریس مطمئن نہیں ہوئی۔

۱۹۰۹ء کی مورلے منٹو اصلاحات

۱۸۹۲ء کے کونسلس ایکٹ نے کانگریس رہنماؤں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں کرزن نے بنگال کی تقسیم کی اور بنگال میں ایک زبردست ہنگامہ پیدا کر دیا۔ بنگال کی تقسیم کے بعد کانگریس کے تمام رہنماؤں نے سودیشی تحریک اور بدیشی مال کا بائکاٹ شروع کر دیا۔ ۱۹۰۶ء میں کانگریس نے اپنے مقاصد میں بھی تبدیلی کی۔

۱۹۰۶ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ جان مورلے نے اعلان کیا کہ ہندستانیوں کی مزید شمولیت کے لیے دستور میں تبدیلیاں کی جائیں گی۔ مورلے لبرل اور وائسرائے لارڈ منٹو کنزرویٹو گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ لارڈ منٹو نے کوشش کر کے ۱۹۰۹ء کے ایکٹ کی اصلاحات اس طرح سے پاس کروائیں کہ ہندستانیوں کو ان سے فائدہ نہ ہو سکا۔

۱۹۰۶ء کے شملہ ڈیپوٹیشن اور اسی سال مسلم لیگ کے قیام کے بعد مسلمان باقاعدہ طور پر اپنے حقوق اور مفاد کے تحفظ کا مطالبہ کرنے لگے تھے۔ جان مورلے مخلوط انتخاب کے حق میں تھے۔ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کے ذریعہ جداگانہ انتخاب کی سیاست شروع کر دی تھی۔ کافی طویل بحث کے بعد ۱۹۰۹ء کا کونسلس ایکٹ ۲۵ مئی ۱۹۰۹ء کو پاس کیا گیا۔ قرارداد حسب ذیل ہے۔

۱۔ الگ سے قانون ساز مجلس قائم کی گئی۔ مرکزی قانون ساز مجلس میں نمایندوں کی تعداد ۶۰ کر دی گئی۔
صوبوں میں یعنی مدراس، بمبئی، یو پی، بنگال، مشرقی بنگال، آسام میں قانون ساز مجلس کے ممبروں کی تعداد ۵۰ کر دی گئی۔
پنجاب اور برما کی کونسل کی تعداد ۳۰ رکھی گئی۔

۲۔ مرکزی کونسل کے ۶۰ ممبروں میں ۲۸ سرکاری ممبر ہوتے تھے۔ ۲ نامزد سرکاری ۳ نامزد غیر سرکاری اور ۲۷ ممبر انتخاب کے ذریعے مقرر کیے جاتے تھے۔

۳۔ صوبجاتی کونسلوں میں سرکاری اور غیر سرکاری نمایندوں کی تعداد برابر رکھی

گئی تھی مگر غیر سرکاری ممبر زیادہ تر نامزد ہوتے تھے۔

۴۔ چناؤ اور نامزدگی کے طریقے کا تعین وائسرائے پر چھوڑا گیا تھا۔

۵۔ مندرجہ ذیل طبقے اور قومیں اپنے نمائندے براہِ راست بھیج سکتی تھیں۔

(۱) چیمبرس آف کامرس (۲) پلانٹرس ایسوسی ایشن (۳) لینڈ ہولڈرس ایسوسی ایشن (۴) مسلم

۶۔ مندرجہ ذیل اپنے نمائندے مخلوط انتخاب کے ذریعے بھیج سکتے تھے۔

(۱) ضلع پریشد (۲) میونسپل کمیٹی (۳) کارپوریشن۔ (۴) یونی ورسیٹیاں۔

مرکزی قانون ساز مجلس میں ۵ نشستیں مسلمانوں کے لیے محفوظ کردی گئی تھیں۔ وہ مخلوط انتخاب میں بھی حصہ لے سکتے تھے۔ اور وائسرائے بھی نامزد کرسکتا تھا۔ اس طرح ۳۲ غیر سرکاری نشستوں میں ۱۱ نشستیں مسلمانوں کو مل گئی تھیں۔

۸۔ کونسل کا رکن وہی ہوسکتا تھا جو تین سال کسی محکمے میں رہا ہو۔

۹۔ گورنر جنرل کسی بھی ممبر کو رد کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔

۱۰۔ قانون ساز مجلس کے ممبروں کے اختیارات میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ مگر اب کونسل کے ممبر بجٹ پر بحث اور سوالات کرسکتے تھے۔

تبصرہ لارڈ منٹو نے نامزدگی کے اختیارات کے ذریعے حکومت کے نمائندوں کی تعداد کی اکثریت کو برقرار رکھ کر اپنی بالادستی قائم رکھی۔ کانگریس ۱۹۰۶ء میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں کلکتہ کے اجلاس میں خود اختیاری حکومت حاصل کرنے کا اعلان کرچکی تھی۔ منٹو نے خود اختیاری حکومت دینا تو بہت بڑی بات تھی ہندستانی ممبروں کے انتخاب کا صحیح طریقہ بھی نہیں اپنایا۔ اور اس طرح اب بھی کونسل میں ہندستانیوں کی آواز کو دبائے رکھا۔

کونسل کے ممبروں کو ذمہ داریاں نہیں دی گئی تھیں۔ وہ تنقید تو کرتے تھے مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

چناؤ کا طریقہ تو رکھا تھا۔ مگر صرف آمدنی اور پراپرٹی ٹیکس ادا کرنے والے ہندستانیوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔ عورتوں کا بھی ووٹ نہیں تھا۔ اس طرح ووٹوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ

انھیں بآسانی خریدا جا سکتا تھا۔

انتخاب کا طریقہ بلاواسطہ تھا۔ عوام اپنی مقامی تنظیموں کے لیے اپنے نمایندے چُنتے تھے۔ ان مقامی تنظیموں سے صوبجاتی کونسلوں میں نمایندے جاتے تھے۔ اور صوبوں کی کونسلوں سے مرکزی کونسل میں نمایندے بلائے جاتے تھے۔

اس ایکٹ میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دے کر ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ایک خلیج پیدا کر دی۔

بقول اے۔ بی۔ کیتھ اگر ۱۹۰۹ء کے ایکٹ کا مقصد ہندستانیوں کے خودمختاری حکومت کے مطالبے کو دبانا تھا تو یہ ایکٹ اس کام میں بالکل ناکام رہا۔ اس لیے کہ انتہا پسند گروپ پوری طرح اور اعتدال پسند گروپ بھی اس ایکٹ سے خوش نہیں تھا۔ گوکھلے نے پہلے اس ایکٹ کا خیر مقدم کیا تھا مگر بعد کو تنقید کی اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے احتجاج کیا گیا۔

۱۹۱۹ء کی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات ۱۹۰۹ء کا کونسلس ایکٹ کانگریس جماعت کو عموماً اور انتہا پسند گروپ کو خصوصاً مطمئن نہیں کر سکا۔ ۱۹۱۴ء میں اول جنگِ عظیم شروع ہونے سے دنیا کے سیاسی حالات میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ ہندستانیوں نے اس جنگ میں دل کھول کر مدد کی تھی۔ مسٹر جیمس میسٹن نے پارلیمنٹ میں کہا کہ "ہم لوگ جمہوریت اور آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں ہمیں اپنی نوآبادیات کو اس حق سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ ۱۹۱۶ء میں اینی بسنٹ اور بال گنگا دھر تلک نے ہوم رُول تحریک بھی چلا رکھی تھی۔ اس تحریک کا اصل مقصد سوراج یعنی آزادی حاصل کرنا تھا۔ ۱۹۱۶ء ہی میں میثاق لکھنؤ کے تحت مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتہ ہو گیا تھا اور اس کے بعد ہندو مسلمانوں میں بڑا خوشگوار ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ ہندستانیوں نے ۱۹۱۷ء کے رُوس کے اکتوبر انقلاب کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس سے ہندستانیوں میں امید کی لہر پیدا ہو گئی تھی۔

پہلی جنگِ عظیم نے ہندستان کی قومی تحریک کو ایک دوسری طرح سے بھی

متاثر کیا۔ اس جنگ میں ترکی کی شکست اور ۱۹۲۰ء میں سیورس کے ناجائز معاہدے سے ہندستان کے مسلمان انگریزوں سے بے حد ناراض تھے مولانا عبدالباری، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی نے خلافت تحریک شروع کر دی تھی جس میں کانگریس تعاون کر رہی تھی۔ عبیداللہ سندھی، برکت اللہ، حیدر رضا وغیرہ بھی شامل تھے۔

اس پس منظر میں کانگریس جماعت کی مانگ پر وائسرائے چیمس فورڈ کسی حد تک خود اختیاری حکومت قائم کرنے کے حق میں تھے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ ای۔ ایس مانٹیگو پہلے ہی سے حکومت کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے اور مقامی حکومتوں کو مزید اختیارات دینے کے حق میں تھے۔ کرزن، مونٹیگو اور آسٹن نے اس مسئلہ پر کافی غور کیا۔ مانٹیگو نے تجویز پیش کی کہ خود اختیاری حکومت کی بجائے ذمہ دار حکومت کا نام دیا جائے۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ جولائی ۱۹۱۸ء میں دستوری اصلاحات کا اعلان کر دیا گیا۔ اصلاحات کا مقصد ہندستانیوں کو زیادہ سے زیادہ حکومت اور اس کے انتظام میں حصہ دینا تھا۔ ۱۹۱۹ء کے کونسل ایکٹ کی قرارداد حسب ذیل ہے۔

۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی خصوصی بات یہ تھی کہ اس میں تفویض اختیارات (DEVOLUTION OF AUTHORITY) کا اصول اپنایا گیا تھا۔ اس کے تحت ملک کے پورے نظم و نسق کو پہلے مرکز اور صوبوں میں تقسیم کیا۔ اور پھر صوبوں کے نظم و نسق کو محفوظ صیغے یعنی گورنر کے ماتحت کام اور منتقل صیغے یعنی ہندستانی وزیروں کے سپرد کام مرکزی صیغے حسب ذیل تھے۔ دفاع، ریاستی اور بیرونی تعلقات، ٹیرف اور ٹیکس، ریلوے، ڈاک و تار، ٹکسال، بینک، تجارت اور جہاز رانی۔ دیوانی اور نظامت عدالتیں، قومی قرضے اور مردم شماری، محکمۂ آثار قدیمہ، کانوں کا محکمہ، پبلک سروس کمیشن وغیرہ۔

صوبوں میں ہندستانی وزیروں کو مندرجہ ذیل صیغے دیے گئے تھے: لوکل سیلف گورنمنٹ، میڈیکل نظم و نسق، صحت و صفائی، تعلیم، امور عامہ، زراعت، جنگلات کا محکمہ وغیرہ۔

صوبوں میں گورنر کے ذمّہ مندرجہ ذیل صیغے تھے۔ سینچائی، پولیس، جیل، عدالت، ویٹرنری، کوآپریٹو سوسائٹی، اندراج پیدائش اور موت، مذہبی اوقاف، مقامی فنڈ اور آڈِٹ، ماہی گیری، صوبائی لگان وغیرہ۔

صوبائی کونسلوں کی مدّت تین سال مقرر کی۔ اسمبلی کے ممبروں کو انتخاب کے ذریعے چُنا جاتا تھا۔ صاحبِ جایداد اور ٹیکس دینے والوں کو ووٹ دینے کا حق تھا۔ اس ایکٹ میں سکھ اور یورپین کو بھی جداگانہ حقِ انتخاب دے دیا گیا۔ دستوری اسمبلی کو بجٹ پر بحث کرنے کا حق حاصل تھا۔

مرکزی دستوری اسمبلی دو چیمبرس پر مشتمل تھی: کونسل آف اسٹیٹ، اس کی ۵ سال کی مدّت تھی اور ۶۰ رُکن ہوتے تھے۔ دوسری قانون ساز اسمبلی کے ۱۴۵ رُکن ہوتے تھے۔ اس اسمبلی میں سرکاری ممبروں کی اکثریت برقرار رکھی تھی مگر صوبے کی اسمبلی میں ہندستانیوں کی اکثریت تھی۔ وزیروں کا تقرر گورنر کرتا تھا۔

تبصرہ پہلی بار ہندستان میں ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں کم از کم صوبوں میں الیکشن کے ذریعے عوام کے نمایندے چن کر آئے تھے، اور جن کو حکومت میں کچھ ذمّہ داری سپرد کی گئی تھی۔ یہ طریقہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔ مرکز میں اس طریقے سے گریز کیا گیا تھا۔ صوبوں میں بھی اہم صیغے گورنر کے پاس تھے۔

اس ایکٹ میں بہت سے نقائص تھے جس کی وجہ سے ہندستانی مطمئن نہیں تھے۔ ہندستانی وزیروں کا تقرر گورنر کرتا تھا۔ ہندستانی وزیر بغیر گورنر کے مشورے کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ہندستانی وزیروں کو ایسے صیغے دیے گئے تھے جن میں ذمّہ داری تو تھی مگر اختیارات نہیں تھے۔

نامزد سرکاری ممبروں اور چُنے ہوئے غیر سرکاری ممبروں میں کبھی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ وہ ایک دوسرے پر تنقید کرتے تھے اور گورنر ہمیشہ سرکاری ممبروں کی طرفداری کرتا تھا۔ چُنے ہوئے ممبر اپنے طبقے، ذات یا مذہب کے وفادار ہوتے تھے۔ خزانے کا صیغہ گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہندستانی وزیروں کو بڑی دقت پیش آتی تھی۔

اگر پورے الیکشن کے طریقوں پر غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ کونسل میں ہندستانیوں کی نمایندگی برائے نام تھی۔ بقول کیتھ رکینٹ کے اختیارات میں اضافہ ہونا اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ نمایندگی کا طریقۂ الیکشن "IT HAS BEEN RIGHTLY POINTED OUT THAT THE ACT, 1919 INTRODUCED RESPONSIVE AND NOT RESPONSIBLE GOVERNMENT AT THE CENTRE"

۱۹۳۵ء کا ایکٹ

۱۹۱۹ء کے کونسلس ایکٹ کا مقصد بتدریج ایک ذمہ دار حکومت قائم کرنے کا وعدہ تھا۔ بہت جلد قومی رہنماؤں کو احساس ہوگیا کہ یہ دستوری اصلاحیں ان کی امیدوں کی تکمیل تو درکنار ایک ذمہ دار حکومت قائم کرنے میں بھی ناکام رہیں۔ صوبوں میں دوہری حکومت کے تحت ہندستانی وزرا، پوری طرح آزاد نہیں تھے۔ صوبوں میں گورنر اور ہندستان میں گورنر جنرل اب بھی پوری طرح بااختیار تھے۔

۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت نے سائمن کمیشن مقرر کیا۔ اس کا مقصد ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی کارکردگی کا جائزہ لے کر آیندہ دستوری اصلاحات کے لیے سفارشات پیش کرنا تھا۔ اس کمیشن کا کانگریس نے بائکاٹ کیا۔ لیکن کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کردی۔ مگر ہندستانیوں کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ نہرو کمیٹی نے ڈومینین اسٹیٹ کی مانگ کی ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس کے لاہور کے اجلاس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے کامل آزادی کی تجویز رکھی۔ گاندھی جی نے برطانوی حکومت کو ۱۱ دن کا وقت دیا۔ برطانوی حکومت نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ آخر کار گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ شروع کر کے سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی۔ گاندھی جی دوسری راونڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کرنے انگلستان گئے مگر وہاں ان کی تجاویز رد کردی گئیں۔ واپس آکر گاندھی جی نے دوبارہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی۔ برطانوی حکومت نے تیسری راونڈ ٹیبل کانفرنس کر کے ۱۹۳۵ء کی اصلاحات کا اعلان کر دیا۔ جس میں ہریجنوں کو بھی جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا۔ جس پر گاندھی جی نے برت رکھا۔ بعد کو پونا پیکٹ کے تحت ہریجنوں کی نشستوں کو صرف محفوظ کر دیا گیا۔ سول نافرمانی کی تحریک بند کر دی گئی۔

اس ایکٹ کی مخصوص قرار داد مندرجہ ذیل ہے۔

۱ ۔ برطانوی صوبوں اور ہندستانی ریاستوں کی ایک فیڈریشن قائم کی گئی۔

۲ ۔ مرکز میں دو عملی حکومت قائم کی گئی۔

۳ ۔ صوبوں میں ذمہ دار حکومت قائم کی گئی۔ اس طرح صوبوں کی حکومت پوری طرح منتخب ہندستانی نمایندوں کے ہاتھ میں آگئی۔

۴ ۔ قانون بنانے کے اختیارات کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ یعنی فیڈرل، صوبجاتی اور کنکرینٹ۔ اسی بنیاد پر صیغوں کی بھی تقسیم کی گئی۔

۵ ۔ فیڈریشن کو چلانے کا پورا اختیار گورنر جنرل کو تھا۔ وزرا کا تقرر گورنر جنرل کرتا تھا۔

۶ ۔ دفاعی، مذہبی اور بیرونی معاملات میں گورنر جنرل کو با اختیار بنایا گیا تھا۔

۷ ۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کی کونسل ختم کرکے ۳۔۶ ایڈوائزر اس کی مدد کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔

۸ ۔ گورنر جنرل سکریٹری آف اسٹیٹ کو اور سکریٹری آف اسٹیٹ انگلستان کی پارلیمنٹ کو جواب دہ تھا۔

۹ ۔ فیڈرل لیجسلیچر کے دو چیمبرس تھے۔ کونسل آف اسٹیٹ، اور فیڈرل اسمبلی۔ کونسل آف اسٹیٹ میں ۱۵۴ نمایندے برطانوی حدود کے ہوتے تھے۔ اور ۱۰۴ نمایندے ہندستانی ریاستوں کے۔ فیڈرل اسمبلی میں ۲۵۰ نمایندے برطانوی حدود کے ہوتے تھے اور ۱۲۵ ہندستانی ریاستوں کے نمایندے ہوتے تھے۔ انھیں یا تو حکمراں نامزد کرتے تھے یا منتخب ہو کر آتے تھے۔

۱۰ ۔ جن فرقوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا تھا۔ ان میں مسلمانوں کے علاوہ سکھ، انیگلو انڈین، عیسائی، عورتیں وغیرہ شامل تھیں۔

۱۱ ۔ ہریجنوں کو جداگانہ انتخاب کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ مگر عام نشستوں میں سے ان کی کچھ نشستیں محفوظ کر دی گئی تھیں۔

۱۲ ۔ فیڈرل لیجسلیچر گورنر جنرل کے ماتحت رکھا گیا۔ گورنر جنرل کو دونوں چیمبرس میں پاس ہوئے بِل کو رد کرنے کا اختیار تھا۔

۱۳ ۔ صوبوں میں حکومت گورنر کے ماتحت تھی۔ اس کی وہی حیثیت تھی جو مرکز میں گورنر جنرل کی تھی۔ صرف فرق یہ تھا کہ صوبوں میں گورنر کے ذمّہ کوئی صیغہ نہیں تھا اور وہ وہاں کی اقتصادی بدحالی کے لیے بھی ذمّہ دار نہیں تھا۔ اس کا کام صرف شورش دبانا، اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ کرنا، امن قائم رکھنا اور سِوِل سروس کی حفاظت رکھنا تھا۔

۱۴ ۔ مدراس، بمبئی، بہار، بنگال، یوپی اور آسام میں دو چیمبرس بنائے گئے تھے۔ یعنی قانون ساز اسمبلی اور قانون ساز مجلس دیگر صوبوں میں صرف قانون ساز مجلس رکھی گئی تھی۔

۱۵ ۔ نشستوں کی تعداد مختلف صوبوں میں آبادی کے تناسب سے مختلف تھی۔ بنگال، پنجاب، سِندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے مسلم اکثریت کے صوبے تھے۔

تبصرہ | اس ایکٹ کے تحت حالاں کہ صوبوں میں بااختیار ہندستانی حکومتیں قائم ہوئیں۔ لیکن مرکز اب بھی گورنر جنرل کے ہاتھ میں رہا اس طرح انگلستان کی پارلیمنٹ کی برتری قائم رہی۔

۱۹۳۷ئ میں اس ایکٹ کے مطابق الیکشن ہوئے اور زیادہ تر صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی۔ یو۔پی میں ایک بار پھر کانگریس اور مسلم لیگ میں اختلاف ہوا۔ قومی تحریک کا کامل آزادی کا خواب اب بھی ادھورا رہا۔ اس لیے دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے پر ۱۹۳۹ئ میں کانگریس وزارتوں نے استعفا دے دیا۔

۱۹۵۰ئ میں آزاد ہِند کے دستور کی تکمیل

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ئ کو ہندستان کی دستور ساز اسمبلی کا تیار کردہ آزاد ہند کا

دستورِ عمل میں لایا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں جب کیبنیٹ مشن ہندستان آیا تو اس نے تجویز کیا کہ ایسی مشینری بنائی جائے جو آزاد ہندستان کے لیے دستور تیار کرے۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہوا۔ ۹ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو دستور ساز اسمبلی کی پہلی میٹنگ ہوئی۔ محمد علی جناح اور گاندھی جی کے علاوہ ملک کے بڑے بڑے رہنما اس اسمبلی میں منتخب ہو کر آئے تھے۔ مسلم لیگ نے انٹیریم حکومت میں تو شمولیت کی مگر دستور ساز اسمبلی کی میٹنگ میں شرکت نہیں کی۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو دستور ساز اسمبلی آزاد ہند کا دستور تیار کرانے کے لیے پوری طرح آزاد ہو گئی۔ ۲۹ر اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہند کا دستور تیار کرنے کے لیے ۷ ممبروں کی کمیٹی تشکیل کی گئی۔ اس کمیٹی کے ڈاکٹر امبیدکر چیرمین مقرر ہوئے۔ کمیٹی کے دیگر ممبروں میں کے۔ ایم۔ منشی، ٹی۔ کے۔ کرشنم آچاری، گوپال سوامی آئنگر، اور الہ دی کرشنا سوامی آئنگر شامل تھے۔ دستور کا ڈرافٹ ۴ر نومبر ۱۹۴۸ء کو دستور ساز اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۴۹ء تک اس پر بحث ہوتی رہی۔ ۲۶ر نومبر ۱۹۴۹ء کو اس کو دستور ساز اسمبلی نے منظور کر دیا۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء میں اسے لاگو کر دیا گیا۔ آزاد ہند کے دستور کی کرداری خصوصیات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ اس دستور کے تحت ہندستان کو ایک آزاد جمہوریہ ہند قرار دیا۔ اس کے بعد انگلستان کے تسلط سے ہندستان آزاد ہو گیا۔ ہندستان نے کامن ویلتھ میں شمولیت اپنی مرضی سے کی۔

اس دستور کے تحت ہندستان کے تمام شہریوں کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا۔ ۲۱ سال کے کسی بھی شہری کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا تھا ۱۸ ہر ۵ سال کے بعد جنرل الکشن کے ذریعے حکومت منتخب کرنے کا شہریوں کو اختیار دیا گیا۔ ہندستانی عوام پارلیمنٹ کے ممبروں کو منتخب کرتے ہیں اور پارلیمنٹ کابینہ کی تشکیل کرتی ہے۔ یہ کابینہ پارلیمنٹ کو جواب دہ ہے۔ کابینہ اپنا ایک لیڈر منتخب کرتی ہے۔ جس کو وزیر اعظم کہا جاتا ہے۔ کابینہ کی معرفت وزیر اعظم کے اختیارات بہت زیادہ ہیں۔

ہندُستان کے دستور میں صدر کا عہدہ دستوری حیثیت رکھتا ہے۔ ۳۵ سال کا شہری صدارت کے لیے الیکشن میں امیدوار ہو سکتا ہے۔ صدر کو کچھ مخصوص اختیارات دیے گئے ہیں مثلاً سزائے موت کو معاف کرنا، بِلوں پر دستخط کرنا۔ ایمرجنسی میں صدر کے اختیارات بڑھ جاتے ہیں، وہ پارلیمنٹ کو مسترد کر سکتا ہے۔

حکومت کا ڈھانچہ فیڈرل رکھا گیا ہے۔ جس کے مطابق صوبوں کو زیادہ تر معاملات میں آزاد رکھا گیا ہے۔ لیکن کچھ اہم صیغے مرکز نے اپنے پاس رکھے ہیں۔ جیسے دفاع، بیرونی پالیسی، کمیونیکیشن وغیرہ۔ کچھ صیغے ایسے ہیں جو مرکز اور صوبے آپس میں مل کر چلاتے ہیں انھیں کنکرینٹ فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ جیسے تعلیم، کچھ ٹیکس وغیرہ۔

ہمارے ملک کا دستور سیکولر بنایا گیا ہے۔ اس کے مطابق بقول وینکٹ رمن، "حکومت نہ مذہبی ہے نہ غیر مذہبی اور نہ کسی مذہب کے خلاف مذہبی معاملات میں بالکل غیر جانبداری اختیار کی گئی ہے۔ ملک کے تمام شہریوں کو بغیر کسی مذہبی، نسلی اور صوبائی امتیاز کے برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ دستور کی قرار داد ۱۲ سے ۳۵ میں ہندستانیوں کے بنیادی حقوق کی تفصیلی فہرست دی گئی ہے۔ یہ بنیادی حقوق مختصراً حسب ذیل ہیں۔

۱۔ برابری کا حق (۲) آزادی کا حق (۳) ناجائز دباو کے خلاف حق (۴) مذہب ماننے کا حق (۵) اپنی روزی کمانے کا حق (۶) تعلیم حاصل کرنے کا حق (۷) دستوری انصاف حاصل کرنے کا حق۔

حق آزادی ۶ حقوق پر مشتمل ہے، (۱) اظہار خیال کی آزادی (۲) دولت کمانے اور جمع کرنے کی آزادی (۳) جماعتیں اور یونین قائم کرنے کا حق (۴) ہندُستان میں کسی بھی جگہ جانے اور گھومنے کی آزادی (۵) ہندُستان کے کسی بھی علاقے میں رہنے کی آزادی۔ (۶) ہندُستان میں کوئی بھی ملازمت یا کاروبار کرنے کی آزادی۔

بنیادی حقوق کسی دوسرے شہری کے حقوق میں حائل نہ ہوں ان کی بندش بندی کے لیے دستور میں ڈائرکٹیو پرنسپلز آف اسٹیٹ کی تفصیلی فہرست دی گئی ہے۔ ان کا مقصد ملک میں ایک انصاف پسند سماج کا قیام ہے۔ یہ زیادہ تر حکومت کو ہدایات کی شکل میں ہیں جیسے۔

(۱) روزی روٹی کے لیے حسب مقدور سہولتیں (۲) معاشی آزادی میں دولت جمع کرنے پر پابندی (۳) مرد اور عورتوں کو ایک جیسے کام کے عوض برابر مزدوری (۴) بچے اور عورتوں سے دباؤ ڈال کر کام لینے پر پابندی (۵) مزدوروں کی کم سے کم مزدوریاں مقرر (۶) ۱۴ سال کے بچوں کو مفت اور ضروری تعلیم وغیرہ۔

دستور میں شہریوں کی کچھ اہم ذمہ داریاں بھی مقرر کی ہیں۔ جیسے ملک کے خلاف کوئی کام نہ کرنا۔ پبلک پراپرٹی کو نقصان نہ پہنچانا، ملک میں آپسی اتحاد اور ہم آہنگی قائم رکھنا، عورتوں کی عزت برقرار رکھنا، ملک کے خزانوں کی حفاظت کرنا، اور انسانی فلاح کے کام کرنا۔

دستور میں عدالت اور انصاف کو حکومت کے اثر سے آزاد رکھ کر شہریوں کے بنیادی حقوق کی حفاظت کی گئی ہے۔ قانون کی نظر میں بالتفریق مذہب و ملت، نسل و ذات تمام شہری برابر ہیں۔ تمام شہریوں کو حکومت کی اونچی ملازمت کے لیے برابر کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔

اس دستور کے نافذ ہونے پر ہندستانی ریاستوں کو آزاد ہندستان کا حصہ بنا لیا گیا۔[۹]

---

[۱] اے۔ بی۔ کیتھ، کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا، ص۔ ۱۶۷

[۲] ایضاً، ص۔ ۳۶

[۳] ایضاً، ص۔ ۱۷۱
مزید ملاحظہ کیجیے، آر۔ آر سیٹھی، کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا، ص ص۔ ۴۷، ۵۴

[۴] ایضاً

[۵] کیتھ، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۲۳۲، ۲۳۶

۶ ایضاً، ص ص، ۲۴۲، ۲۷۴

۷ ایضاً، ص ص، ۳۱۹، ۳۶۰

۸ ۱۹۸۹ء میں دستور میں ترمیم کرکے ووٹ دینے کی عمر ۲۱ سال سے گھٹا کر ۱۸ سال کر دی گئی ہے۔

۹ سیٹھی، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۳۲۳، ۳۴۱

بقیہ حوالہ باب۔ ۷ کا

۱۳ ایضاً، ص ص۔ ۲۵۰ - ۲۵۲

۱۴ ایضاً

۱۵ ایضاً، ص ص۔ ۲۴۱ - ۲۴۸

باجی راو اوّل نے جب ہندو پد بادشاہی کا نعرہ لگایا تو راجا جے سنگھ اور دیگر راجپوت راجا اس کی مدد کے لیے تیّار ہو گئے تھے۔

۱۶ ایضاً، ص۔ ۲۰۸

۱۷ ایضاً

بقیہ حوالہ باب۔ ۹ کا

مرزا ابوطالب لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ لندنی کا لقب انھیں لندن کے سفیر اور انگریزوں کی تہذیب نوازی کی وجہ سے دیا گیا۔ دیکھیے۔ مجیب اشرف، مسلم ایٹی چیوڈس ... ص ص۔ ۱۴۴ - ۱۵۵

بقیہ حوالہ باب۔ ۱۱ کا

۳ اشرف، مذکورہ بالا

۴ تاراچند، دی ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ آف انڈیا۔
مولانا ابوالکلام آزاد، کانووکیشن ایڈریس (علی گڑھ یونیورسٹی ۱۹۴۹ء)
۵ ضیاءالحسن فاروقی، دیوبند موومنٹ اینڈ پاکستان
کے۔ کے۔ عزیز، دی میکنگ آف پاکستان، ص ص ۱۷۷۔ ۱۷۹
۶ طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ص ۴۸۴۔ ۴۸۵
۷ تاراچند، مذکورہ بالا
۸ بپن چندر، جدید ہندستان، ص ص ۲۲۴۔ ۲۳۰
۹ این۔ کے۔ بوس، دی اویکننگ اِن بنگال
۱۰ بی۔ این۔ دت، سوامی وویکانند

بقیہ حوالہ ۔ ۱۲ کا

۶ آر۔ سی۔ مجومدار، ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ آف انڈیا
۷ ڈاکٹر امبا پرشاد، دی انڈین ریلویز
۸ مہروترا، ۱۸۸۵
۹ پٹا بھی سیتارمیا، دی ہسٹری آف دی انڈین نیشنل کانگریس
۱۰ ایضاً
۱۱ مجومدار، مذکورہ بالا
۱۲ ایضاً

حوالہ باب ۔ ۱۷

۱ ملاحظہ کیجیے، معین شاکر، خلافت ٹو پارٹیشن
۲ ملاحظہ کیجیے، مضمون "مولانا محمد علی اور ہندستان کی قومی تحریک" از مجیب اشرف
جامعہ، جنوری ۱۹۸۹ء

۳ سُمِت سرکار، موڈرن انڈیا، ص ص۔ ۲۲۷۔ ۲۳۷
بپن چندر، جدید ہندستان۔ ص ص۔ ۲۸۳۔ ۲۹۰
۴ سرکار، مذکورہ بالا

حوالہ باب ۱۸

۱ سُمِت سرکار، موڈرن انڈیا، ص ص۔ ۱۷۷، ۲۱۲۔ ۲۵۱
۲ ایضاً، ص ص۔ ۱۵۲۔ ۴۵۵
۳ ایضاً، ص۔ ۲۰۵۔ ملاحظہ کیجیے۔ رمن راو، انڈین نیشنل کانگریس۔ ص ص۔ ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۲۰
۴ سرکار۔ مذکورہ بالا، ص ص۔ ۲۶۵۔ ۲۶۷
۵ مشیر الحسن۔ نیشنلزم اینڈ کیونل پالیٹکس اِن انڈیا، ص ص۔ ۲۷۲۔ ۲۷۸، ۲۸۹، ۳۰۱
۶ راؤ۔ مذکورہ بالا، ص ص۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴
۷ ایضاً، ص ص۔ ۱۲۷۔ ۱۳۰
۸ ایضاً، ص۔ ۱۳۱
۹ پی۔ ڈی۔ کوشِک، ص۔ ۲۲
۱۰ ایضاً
۱۱ ایضاً
۱۲ ایضاً

حوالہ باب۔ ۱۹

۱ سردار محمد خاں۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح، ص ص۔ ۳۳۔ ۴۸
طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ص۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹
۲ طفیل احمد، مذکورہ بالا، ایضاً
۳ ایضاً، مذکورہ بالا

حوالہ باب۔۲۱

۱؎ سُمِت سرکار، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۴۱۰

۲؎ ایضاً، ص ص۔ ۴۳۸۔ ۴۴۲

۳؎ مولانا آزاد، انڈیا وِنس فریڈم

۴؎ ایضاً

۵؎ سرکار، مذکورہ بالا

۶؎ ایضاً، ص۔ ۴۴۲

۷؎ مولانا آزاد، مذکورہ بالا

۸؎ پرتاب سنگھ، مذکورہ بالا، ص ص۔ ۱۷۶۔ ۲۱۹

۹؎ ایضاً

۱۰؎ سرکار، مذکورہ بالا

۱۱؎ ایضاً، ص۔ ۴۵۳

۱۲؎ ایضاً